

سُحْرے سے سحر کا

سمیرا حمید

A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.

پاکستانی پوائنٹ

www.PakistaniPoint.Com

سُبْحَانَكَ يَا حَكِيمُ



سَمِیعُ اَحْمَد

خواتین ڈائجسٹ

37- اُردو بازار، کراچی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اول 2014

ناشرین خواتین ڈائجسٹ

پریس پرنٹ لائن

قیمت روپے

سول ایجنٹ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار کراچی



پاکستانی وقار
دارت و اعزاز
عظیم



Pakistanipoint

عدن کیپ ٹاؤن کے ساحل پر اکیلے ہی چہل قدمی کر رہا تھا۔ غصے میں جی تو اس کا چاہا کہ قرب و جوار میں نامناسب لباس پہنے، چہل قدمی کرتی، شوخ و شنگ کسی ایک آدھ لڑکی کی کمر میں اپنے بازو جمائے کر دے اور نہیں تو انہیں آنکھ ہی مار دے اور اس اشارے پر جب کوئی اس کے قریب آجائے تو وہ اسے لٹخ کے لیے لے جائے۔ رات میں ڈنر کے لیے اور پھر ڈسکو کے لیے اور پھر۔۔۔

لیکن ماریہ سے بدلہ لینے کی شدید خواہش کے باوجود اس کا جی نہ مانا کہ وہ اپنے رو پہلے ہی مون پر یہ سب کرے۔ شادی سے پہلے کی اور بات تھی۔ اُس وقت جب بھی وہ دوسرے ملک تفریح کے لیے گیا، ایسے بہت سے کام کیے۔ ویسے ہی کام جو مذہب کے دائرے سے پرے تو ہیں ہی ساتھ ساتھ معاشرتی مزاج پر بھی بہت بھاری پڑتے ہیں۔

ذرا سے فاصلے پر بنے کپل ہٹس (Huts) میں سے ایک میں ماریہ سو رہی تھی۔ ماریہ۔۔۔ زمینی حور۔۔۔ ازبکستان کی پیداؤی۔ اپنی مام کی طرح گہری سبز آنکھوں والی اس کی بیوی، انٹی پلٹی سی۔۔۔ عدن نے بہت سے اٹنے مزاج کے لوگ دیکھے تھے۔ ایک وہ خود بھی تھا۔ لیکن ماریہ جیسی انٹی شخصیت اسے اب تک ایک ہی ملی ”ماریہ خود“۔

جب وہ آ رہا تھا تو اس نے کہا کہ اسے سونا ہے۔ اب جب وہ واپس جائے گا تو وہ کوئی فلم دیکھ رہی ہوگی یا گھنٹوں سے واش روم میں ہی ہوگی۔ اسے واپس آئے چند منٹ ہی گزریں گے تو وہ خود چہل قدمی کے لیے باہر جائے گی۔ اگر اسے جانا ہی تھا تو اس کے ساتھ کیوں نہیں؟ اب اگر وہ یہ بات پوچھے گا تو ہنی مون تباہ کرے گا۔ ڈھیٹ بن کر وہ اتنا ضرور کہے گا۔

”میں بھی آؤں ساتھ۔۔۔؟“

وہ پلٹ کر دیکھے گی بھی نہیں اور چلی جائے گی۔ عدن کو جواب دیے بنا صرف وہی ایسے جاسکتی ہے۔ جا کر وہ واپس آنا بھول جائے گی۔ فون نشن کے نیچے، ہاتھ ٹپ کے پاس یا کسی ڈراما میں رکھا ہوگا۔

وہ اپنے ساتھ صرف امریکن کریڈٹ کارڈ لے کر نکلتی ہے۔ ناچار وہ اکیلا ہی ڈنر کرے گا ایک بار وہ اسے
اصولاً تاکا ب جانا ہوا۔ وہ بے خود ایک کونے میں پڑی تھی۔ اگر وہ نہ جاتا تو وہ ساری رات وہیں پڑی
راتی۔ لیکن ایسا ہی الحال ایک ہی بار ہوا تھا۔ مگر دوبارہ ہو بھی سکتا تھا کیونکہ وہ اسے ساتھ کم ہی رکھتی تھی۔
دل چاہا تو ساتھ۔ ورنہ دور دور۔

وہ اچھے سے اچھے ہوٹل، ریسٹورنٹ، مومن لٹ ایریا، ٹریولوز ہنٹ انواع اقسام کے کلبوں کے
بارے میں معلومات کرتا ہوٹلوں میں سیٹیں، سمندر میں جہاز بک کروانا۔ مگر وہ جا کر نہ دیتی۔ اگر چلی بھی
جاتی تو منہ ایسے بنایا ہوتا جیسے کسی ناگوار بدبودار جگہ آئی تھی ہو۔ یہ ان کا ہی مومن تھا۔ جس پر ماریہ کے ڈیڈ
لے بے تحاشا پسیر خرچ کیا تھا۔

”تم کتنا بور ہوتی ہو۔“ دراصل وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم کتنا بور کرتی ہو۔
ماریہ نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا اور کھانا کھاتی رہی۔ خاموشی کا یہ وقفہ عدن کی بے عزتی کیے جا رہا
تھا۔

”میرے تجزیہ نگار نہ بنو۔“ کچھ وقت کے بعد اس نے جواب دیا۔ لیکن کیا خوب دیا۔ اس رات کا
از بھی تباہ ہو گیا۔

وہ کئی بات، کسی چیز سے خوش ہوتی ہی نہیں تھی۔ چیزیں تو خیر اس نے بہت برتی ہوں گی۔ مگر شوہر
تو وہ پہلا تھا۔ کبھی وہ خوش کر دیتی۔ کبھی خوشی چھین لیتی۔ کبھی کندھے پر خودی سر رکھ دیتی اور کبھی اپنے
کندھے پر سر رکھنے بھی نہ دیتی۔

”یہ تمہارا پلان کیا ہوا ہی مومن ہے؟“ ایک دن وہ بری طرح سے چڑ گیا۔

”میرا نہیں، ڈیڈ کے سیکریٹری کا۔“

”اس نے تمہاری پسند سے ہی کیا ہوگا۔“

”ہاں، تو مجھے یہ سب پسند ہے۔“

”لگتا تو نہیں ہے۔“ سچی بات بھی اس کے سامنے ڈرڈر کے کرنا پڑتی تھی۔

”کیسے لگے گا؟“ وہ صاف برا مان گئی۔

عدن کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ نہ ہی کوئی نیا سوال۔ جواب بھی بہت تھے اور سوال بھی۔ لیکن اس
لئے مزاج والی کے لیے اب کچھ اور کہنا نہیں چاہتا تھا۔

”ایم او کے۔۔۔ کوئل۔۔۔ پرفیکٹ۔ اس طرح منہ پھاڑ کر مجھ پر تبصرہ نہ کیا کرو۔“

عدن چپ ہو گیا تھا لیکن وہ ہمیں رکی اس کے منہ پھاڑ انداز پر وہ تھلا کر رہ گیا۔ زیر لب گالیاں
دیں۔ اپنے چٹنی مومن پر صرف چالیس دن پرانی بیوی، سویٹ ہارٹ کو گالی دی۔

شاید یہ گالی دینے کی نوبت اتنی جلدی نہ آ جاتی۔ اگر دینی پام سٹی میں اس نے ماریہ کے ساتھ اس
کے ذاتی دلا میں قیام نہ کیا ہوتا۔

ان دونوں کی شادی پاکستان میں ہوئی تھی۔ ولیمہ دینی پام سٹی میں دیا گیا۔ دلا میں ہی دونوں نے
دو ہفتے قیام کیا۔ دونوں کی ہنسی واپس جا چکی تھی۔ شروع کے دن کافی پر بہار اور ہنگامہ خیز تھے۔ دونوں

کھانوں سوئمنگ کرتے، نت نئے ہوٹلز جاتے، ماریہ کے دوستوں کی طرف سے دی گئی چند پارٹیز اٹینڈ
لیں۔ کلب اور سینما کے چکر لگائے۔

ماریہ کے ایک شیخ دوست طاہر البشر نے انہیں ڈنر پر بلایا۔ بقول شیخ ”رہائش گاہ“ اور بقول عدن
”مہر لے سے محل“ میں انہیں دعوت طعام دی گئی۔ واپسی پر انہیں دہلی کے ایک پوش علاقے میں واقع
ایک اپارٹمنٹ گھنٹ کیا گیا۔ لیکن یہ سب بھی اتنا قابل توجہ نہیں تھا۔ نہ شیخ کا محل، نہ ہی سونے چاندی کے
آئینے، اس وہ خوش آمدیدی اور الوداعی انداز۔۔۔ دائیں بائیں گال پر بوسے، جو شیخ اور ماریہ دونوں کی
طرف سے تھے۔

ان روایتی ملاقاتی انداز کو عدن خوب جانتا تھا۔ لیکن صرف یہ روایتی انداز ہی نہیں تھا۔ ماریہ نے
ہلیر آئین کا سنہرا گاؤں پہنا تھا اور شیخ کو ماریہ کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ عدن نے کمال بے
مہرئی سے نظریں ادھر ادھر کیں۔ لیکن اس کے اندر سوال جواب شروع ہو گئے۔ نیا نیا تھا نا۔ ابھی عادی
نہیں تھا۔ شیخ صاحب کمال مہربانی سے اپنی ساری توجہ ماریہ پر نچھا کر رہے۔ کمال کے انسان
تھے۔ وہ ہر نام کی چیز پر صرف ایک نظر ہی ڈالتے۔

اور اتفاقاً اس کی نظر بھی اس نام پر پڑ گئی، جو ماریہ کو اس کے گھر سے فیکس کی گئی رپورٹس پر لکھا تھا۔
”امام ہی“ شیخ طاہر البشر“ تھا۔

وہ اپنے لیپ ٹاپ پر چند ای میلز چیک کر رہا تھا۔ جب لائبریری میں ذرا قریب رکھی فیکس مشین
میں آگیا۔
”تمہارا ٹیکس آیا ہے ماریہ۔“

وہ ماریہ کو جانتا تھا کہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے، جو شادی کے بعد شوہروں اور شادی سے
بچنے والے لڑکے کو اپنے پاس وڑ دیتی ہیں۔ وہ بکجائی کی نہیں، الگ الگ کی قائل تھی۔ وہ تو اس کے
بائبل کو بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ اگر وہ لیپ ٹاپ پر کام کرتی، کہیں اٹھ کر چلی بھی جاتی تو وہ اچک کر یہ
بھی نہیں اٹھ سکتا تھا کہ وہ اتنی دیر سے لیپ ٹاپ پر کیا کرتی رہی ہے۔ میڈ کو اس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا
ای میل ڈریسنگ ایڈوائس ہے۔ وہ ضرور ٹیکس عدن کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی نظر نے صرف شیخ طاہر
البتہ اس کا

وہ انا ہاتھ لے رہی تھی۔ چلائی۔ ”نہیل پر رکھ دو۔“ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اس کا فیکس پڑھ لیا
ہا نہ گا اور یہ ٹیپ ٹاپ۔۔۔ ماریہ کیوں ڈرے؟ آقا کی بیٹی کیوں ڈرے۔

تیار ہو کر وہ گاڑی لے کر نکل گئی۔ دو دن ایسے ہی صبح و شام جاتی رہی۔
”آج تو کہیں نہیں جانا؟“ تیسرے دن اس نے اپنے ہی پوچھ لیا۔ اپنی موٹس و ہینڈ بیوی سے۔
اس نے کال پر چلی بھر کر۔۔۔ لا ذکر کرتے ہوئے۔۔۔ رومانس کے انداز میں۔

اس نے چلی بھرتے ہاتھ کو جھٹکا۔ ”کیا مطلب؟“
”ایسے ہی۔۔۔“ ہاتھ جھٹکے جانے پر اسے پہلی بار پہلا صدمہ ملا۔
”چلی بھی جاؤں۔۔۔ آج بھی۔۔۔ اور جب کبھی۔۔۔ تمہیں کیا؟“ الفاظ سے زیادہ انداز برا

تھا۔

”ہاں جی! ٹھیک۔ عدن کو کیا۔۔۔“ وہ منہ پھلا کر پہلی بار ناراض ہو کر باہر نکل گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ضرور محسوس کر کے اس کے پیچھے آئے گی۔ لیکن ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ واپس گیا تو وہ جا چکی تھی۔ ملائشین میڈ سے پوچھا۔ اس نے رتی ہوئی انگریزی طرز پر کہا۔

”آئی ڈونٹ نو!“

عدن کو کچھ سکی سی محسوس ہوئی۔ اس جیسا لڑکا، جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر طیش میں آ کر موبائل فرش پر، دیوار پر دے مارتا تھا۔ اب صرف غصے میں ٹھلنے لگا۔ کس کے سامنے موبائل دیوار پر دے مارے۔ ٹی وی کے چینل بدلنے لگا۔ شام گزر گئی۔ ماریہ آئی، جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹ گئی۔ بیگ بیڈ روم کے دروازے کے پاس گرا پڑا تھا۔ موبائل، کی چین، سن گلاسز کو صوفے پر اچھالا گیا تھا۔ سن گلاسز صوفے کے کنارے سے گرنے کے قریب تھے۔

”ماریہ!“ وہ اس کے اوپر جھکا۔ غصے کو ایک طرف کیا۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ کو چھونا چاہا۔ اس نے جواب میں ایک مختصر سی اوں لیں۔۔۔ کی۔ اس انداز پر غصہ دوبارہ آ گیا۔ دراصل ماریہ ایک چیز تھی تو وہ بھی بہت زعم میں تھا۔ ماریہ پہاڑ کی چوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن خود کو وہ جھنڈا سمجھ رہا تھا، جو قابض لگاتا ہے۔ اس کے خیال میں ماریہ کو اس کے پیروں تلے ہو جانا چاہیے۔ بے شک خود گردن اگڑا کر چوٹی بنی کھڑی رہے۔

غصے سے وہ باہر آنے لگا تو دروازے کے پاس پڑا بیگ اٹھا لیا۔ باہر لے آیا۔۔۔ کھولا۔۔۔ اندر تین کاغذاتہ کیے رکھے تھے۔

وہ بہت پڑھا لکھا تھا۔۔۔ امیر تھا۔۔۔ بہت سے میوز جانتا تھا لیکن اب غصے میں آ کر وہ کاغذات پڑھنے لگا۔

”مسز ماریہ شیخ طاہر البشیر۔۔۔“

اس نے آنکھیں سیڑیں۔۔۔ لمحے بھر کو ذرا سا کانپا۔ باری باری تینوں کاغذات پڑھے۔۔۔ ایک فیکس تھا، جو امریکا سے اسے کیا گیا تھا۔ دور پورٹس تھیں، جن کی تاریخ ایک دن پہلے کی تھی۔ تینوں کاغذات پڑھتے ہی اس کا دماغ ابلنے لگا۔ سوئی ہوئی ماریہ کو جھجھوڑا۔

”یہ کیا بکواس ہے؟“

”واٹ؟“ نیند سے اٹھائے جانے پر وہ غصے سے بولی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے کاغذات اس کے سامنے لہرائے۔

وہ لپک کر اٹھی اور اس کے ہاتھ سے کاغذات جھپٹ لیے۔۔۔ تمہاری اتنی جرأت۔۔۔“ وہ انگلش میں دھاڑی۔ وہ انگلش میں ہی بات کرتی تھی۔ اردو بہت کم بول اور سمجھ سکتی تھی۔ عدن اس کی جرأت پر حیران رہ گیا۔ الٹا وہ اسے یہ بتا رہی تھی کہ اس نے اس کے کاغذات کو بیگ میں سے نکالنے کی ہمت ہی کیسے کی۔ کمال کی بات ہے نا؟

”تم شیخ کی بیوی تھیں؟“ اس کی آواز اور غصہ اور بلند ہو گیا۔

اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔۔۔ کاغذات کو ہاتھ میں لیے الماری تک گئی۔ پٹ کھولا اور اندر رکھ کر قفل لڑ دیا۔

”ماریہ!“ عدن چلا یا۔ مشرقی خوب صورت مرد اور خاص کر مشرقی شوہر کی بات کا جواب نہ دیا۔ اسے پیٹھ دکھادی جائے۔ اس سے اچھا ہے کہ اس کے منہ پر چاشنا مار دیا جائے۔

”کیوں چلا رہے ہو؟“ وہ پلٹی اور سنگل صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھی۔ ذرا سا جھک کر ایک ہاتھ سے پمپ شوز اتارے اور اسی ہاتھ کی سمت میں شوز اچھا ل دیا، دوسرا شوز اتار اور ویسے ہی اچھا ل۔۔۔ اور ایک پاؤں کو جھلانے لگی۔ یوں جیسے اسے کسی بات کی پروا نہ ہو۔

”میں ڈاکٹر ہوں۔“ وہ تتا ہوا کھڑا تھا۔ مرنے مارنے کے لیے تیار۔ غیرت مند پاکستانی شوہر۔

”تو۔۔۔؟“ انداز میں حیرت تھی، نہ سوال میں۔

”تمہاری رپورٹس پڑھ لی ہیں۔“

”گڈ۔۔۔“ پاؤں مل رہا تھا۔

اس انداز پر عدن کا جی چاہا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے۔

”کچھ اور۔۔۔؟“ سوال تھا مذاق۔

”کتنے ابارشن کرا چکی ہو؟“ عدن نے اپنی طرف سے اسے تھپڑ مارا کہ وہ ہلک اٹھے گی۔

”صرف دو تک ہی نوبت آئی تھی۔“ الٹا وہ بدکا۔ الٹا تھپڑ اسے ہی لگا۔ وہ تو مزے سے کہہ گئی۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے ان میں لڑائی ہوتی رہی۔ لڑائی بھی کیا۔ عدن ہی بھڑک بھڑک جا رہا تھا۔ وہ آزاد خیال بھی ہے اور آزادی بھی رکھتی ہے۔ وہ جانتا تھا۔ لڑ جھگڑ کر وہ قریبی ہوئی آ گیا۔ پاپا کو فون کیا۔

”وہ اس کی بیوی نہیں، گرل فرینڈ تھی۔“ اس نے ماریہ کی کئی ایک بات پاپا کو بتادی، تو انہوں نے کمال الفاظ سے اسے تسلی دی۔ ”ایکس گرل فرینڈ۔“

ماریہ کو کچھ پیچیدگیوں کا سامنا تھا۔ اسی لیے اس نے دوبارہ دعویٰ کے اسی کلینک سے اپنا چیک اپ کروایا تھا۔ جس کے لیے اس نے امریکا سے اپنی رپورٹ منگوائی۔ اس کی تازہ ترین رپورٹ میں بھی بہت سے مسائل ہی تھے۔ اس کی طرف سے اب وہ مرے یا بیجے۔ یا شیخ کے پہلو میں جا بیٹھے۔

”انتا بوکھلا کیوں رہے ہو یار۔۔۔ تم بھی گرل فرینڈ ہی سمجھ لو۔ بیوی کسی اور کو بنا لیتا۔ چند سال کزار لو۔۔۔ ابھی وہ تمہارے ساتھ ہے۔ تم اس کے شوہر ہو۔ وہ اپنے ڈیڈ کو پیاری ہے۔ اس کے ڈیڈ تمہیں پیار کریں گے۔ نا سمجھ مت بنو عدن۔۔۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو۔۔۔ ایسے کیسے غصہ کرنے لگے

ہ۔۔۔ وہ امریکا میں رہی ہے۔۔۔ پاکستان میں رہنے والیاں کم نہیں ہیں۔ لڑ آئے ہو اس سے۔۔۔

وہ اپنے ڈیڈ کو بتائے گی۔ نہیں بھی بتائے گی تو لڑ کر تم کر بھی کیا لو گے۔۔۔ میں بھی اسے جانتا ہوں۔۔۔

اس نے استاد صاحبہ نہ بنو۔۔۔ اس غلطی پر ٹوکا۔۔۔ اس پر ڈانٹا۔۔۔ یار! عقل کہاں ہے تمہاری؟“

”پھر بھی۔۔۔ آپ کی بہو ہے وہ۔“

”یار! میں ان چکروں میں نہیں الجھتا۔ اتنا میں نہیں سوچتا۔ وہ بھی ایسے معاملات میں۔۔۔ جار

ان لوگوں نے تمہاری شادی کو ادھر یہ سب۔۔۔ سیدھے رہو۔ ورنہ آنکھ کان بند کر لو۔۔۔ جب سنو گے

نہیں، بلکہ کے نہیں تو ہولو کے کیا۔“
وہ پہلو ہی بدلتا رہا۔

”سوچ کیا رہے ہو؟ جواب دو۔۔۔ ارے یار!“
”کیا جواب دوں؟“

”اچھا، چلو نہ دو۔۔۔ جاؤ، ماریہ کے پاس واپس۔“

ماریہ سے متعلق اس کے پاپا کے ہمیشہ سے ہی خیالات نادر رہے تھے۔ ماریہ ان کے لیے ایک عجوبے کی طرح تھی۔ جس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ ”کھل جاسم سم“ منتر پڑھ کر خزانے تک جاسکتے تھے۔

پاپا نے اسے اچھی طرح سے ٹھنڈا کر دیا۔ چند ہی گھنٹوں بعد وہ واپس چلا گیا۔ ماریہ کو ساتھ لیا۔
ڈنر کیا اور سب کچھ ادا کے ہو گیا۔ پھر وہ ساؤتھ افریقہ آ گئے۔

ماریہ کے ساتھ اپنی پہلی لڑائی اور پاپا کے ساتھ پہلے مکالمہ کے بعد اس نے خود پر بے غیرتی کے سبب ہی دروازے کھول لیے۔ دراصل وہیں سے دوسرے بہت سے دروازے بند ہو گئے۔ لیکن بند ہونے والے دروازوں کی پروا کرتا کون ہے۔ اب وہ اسے اپنی گرل فرینڈ سمجھ رہا تھا۔ جب کہ وہ اس کی بیوی تھی اور یہی بیوی نما گرل فرینڈ ”کھل جاسم سم“ تھی۔

ساؤتھ افریقہ میں ماریہ کے مزاج کے مطابق دن گزار کر وہ امریکا، ہوشن آ گئے۔ دو منزلہ چھوٹا سا اسپتال تیار کیا تھا۔ ترمین و آرائش اس نے اپنی مرضی سے کروائی۔ جراحی آلات، دیگر ساز و سامان اپنی نگرانی میں منگوایا۔
پہلی قسط اسپتال تیار تھا۔

پاکستان سے اس کے پاپا، ماما اور بہن آئی۔ سفید ربن کو اس کے سر نے کاٹا۔ بلند بانگ تہقہہ اس کے پاپا نے لگایا۔ اس نے تالیاں بجانیں اور سب اسپتال میں داخل ہو گئے۔

پاپا نے اسے ایک آنکھ ماری جیسے۔
”اب کہو۔۔۔ کیا خیال ہے۔“

اس نے بھی جواب یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ”جی کمال کا خیال ہے۔“

اس افتتاح میں ماریہ شامل نہیں تھی۔ اس کی پروا کسے تھی۔ چند دن بعد وہ اسپتال آئی۔۔۔ ادھر ادھر گھوم پھر کر دیکھا۔ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ نہ جانے کیا ہوا۔ اس کی مسکراہٹ کے انداز پر عدن کا منہ بن گیا۔ لیکن ڈھیٹ ہی بتا رہا۔

”جتنے مرضی طھو کر لے گدھی۔“ اسے ساتھ لے کر وہ لنگ کے لیے آ گیا۔

ماریہ آج کل گھر سیٹ کر رہی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ اپنی از دو واجی زندگی کی بنیاد گھر کو وہ بہت دل جمعی سے سیٹ کر رہی تھی اور اس بنیاد کی بھی بنیاد ”تعلق“ پر اس کی نظر نہیں تھی۔ کبھی کبھار وہ اس سے بھی مشورہ لے لیتی۔۔۔ اس کی پسند کا پوچھ لیتی۔ پورے گھر میں ڈرائنگ روم کی ایک سائیڈ ٹیبل عدن کی پسند کی آئی تھی۔ وہ بھی نہ آتی تو عدن کو فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ یہی کافی تھا کہ ان کی بول چال میں

تہدیلی آگئی تھی۔ ہلکی پھلکی دوستی بھی ہوگئی تھی۔ ایک ساتھ پر امن ڈنکر لیتے۔ کبھی کبھار باہر چلے جاتے۔ سب ہی سُر نہ سہی، ایک آدھ سُر ان کے رشتے کا ٹھیک بچ ہی جاتا۔ وہ اس کے لیے کریم کافی بناتی اور اس کی گردن پر ایک چٹکی بھرتی۔

کبھی کبھی وہ خانوادہ بننے لگتی۔ جب وہ کار کا دروازہ کھولتا۔ کھانے کی میز کرسی کھسکا کر کھڑا رہتا۔ ”ڈیڈ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ ٹھیک۔“ انگلی لہرائی کہتی جاتی۔

اور وہ ہر بار یہ پوچھنے کی غلطی نہیں کرتا تھا کہ ڈیڈ کیا کہتے ہیں۔ ایک باریہ عظیم غلطی کی تھی۔ ”ہوں۔۔۔“ اس نے صرف دو انگلیوں کو موڑ کر ٹھوڑی کے نیچے رکھا۔ ہونٹوں کو نیم داکھا۔ ہولی کچھ نہیں۔ آنکھیں ذرا سی تر چھی اس کی طرف نکالیں۔ عدن کو مارلن مرو کی مشہور زمانہ تصویر یاد آگئی، جو کانگ کے دنوں میں اس کے ہاتھ روم کے دروازے پر چسپاں تھی۔ بعد ازاں اس نے اس کی جگہ کئی پیری کو چسپاں کر دیا تھا۔

”انہوں نے کہا۔ وہ غلام علی غلام کا بیٹا ہے۔۔۔ جیسے چاہے سدھالو۔“ عدم مسام در مسام بھیک گیا۔ پاکستان کے ٹاپر، اپنے شعبے میں قابل اور باکمال ڈاکٹر عدن اپنا دم خم کھو بیٹھا۔

”اور سنو۔۔۔ انہوں نے کہا۔۔۔ جو لوگ کاری ضرب دیتے ہیں۔ ان سے بچ کر رہنا۔۔۔“ عدن سے تمہیں بچاؤ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس میں اتنا دم خم نہیں ہے۔“ بات کہہ کر زناکت سے اٹھ کر وہ چلی گئی۔ جیسے فٹ بال میچ کے آخری لمحات میں فیصلہ کن گول کیا ہو اور اس کی ٹیم جیت گئی اور اتنی دیر سے جو وہ محتاط تھیل رہا تھا۔۔۔ وہ پوچھ لینے کی ایک بڑی غلطی کا مرتکب ہوا تھا۔ بتا کر ماریہ نے اسے اور بڑا دشمن بنالیا تھا۔

کس بات کا دم خم؟ آنے والے وقت میں شاید وہ اسے بتا ہی دے گا۔ جتنا بھی دے گا۔ اس کے ڈیڈ کے پاس صرف چند ہزار طین ہی زیادہ تھے اس کے پاپا سے۔۔۔ پیسے کا بس اتنا سہاوی فرق۔ ان کے پاس رقم روپوں میں بھی اور ان کے پاس ڈالروں میں۔ طاقت اور عقل تو مرد کے پاس ہی ہوتی ہے نا۔ تو اس طرف دو مرد تھے۔ عدن اور اس کے پاپا غلام علی غلام اور اس طرف آغا عباس حیدر۔۔۔ اور پھر عدن شوہر تھا۔ کتنے پوائنٹس تو ایسے ہی اپنے آپ مل جاتے ہیں۔ صرف شوہری ہونے سے۔۔۔ وہ لائق فائق ڈاکٹر تھا۔ دنوں میں ہی کہاں کا کہاں پہنچ جائے گا اور ماریہ۔۔۔ حسن کی دیوی۔ اس حسن کے بل بوتے پر بھی ماڈلنگ کی فیلڈ میں کوئی نام نہیں بنا سکی۔ چند کمرشلز ہی کر سکی۔ باپ کا پیسہ بھی کام نہ دلوا سکا۔ ہالی ووڈ کی فلمیں تو بہت ہی دور کی بات تھی۔ عدن کو خود کو مطمئن رکھنے کے لیے بہت سے فلسفے مل جاتے تھے۔ بہت سی خامیاں۔ اسے ہر جگہ اپنی ہی کامیابی نظر آتی تھی۔۔۔ کاری ضرب تو وہ واقعی شاید نہ ہی دے سکے۔ لیکن چھوٹی چھوٹی ضربیں وہ تیار کر سکتا تھا، جو کاری بن ہی جائیں گی اکٹھی ہو کر۔

وہ ماریہ سے فاصلے پر، لیکن دوست بن کر رہنے لگا۔ وہ کیا کر رہی ہے، کہاں آ جا رہی ہے۔ کس کس سے مل رہی ہے اور ایسی ہی دوسری باتیں امریکا میں رہتے تو وہ پوچھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب اس نے توجہ دینی بھی چھوڑ دی۔ جب کبھی وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی، وہ چلا جاتا۔ وہی ماریہ کے ٹائپ کی

پارٹیز۔۔۔ وہاں وہ تاجتی۔۔۔ نہ جاتی۔۔۔ اور لڑکھڑاتی واپس آ جاتی۔ جی تو اس کا چاہتا کہ اسے کسی سڑک پر دکھا دے کہ گرا دے اور کوئی کار اس کا سر پکڑ لے۔ لیکن وہ اسے سہارا دے کر بیڈ تک لاتا۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر اوندھی گر جاتی۔ عدن بڑبڑاتا اور دوسرے کمرے میں چا کر سو جاتا۔۔۔ پھر وہ اس کے ساتھ جانے سے ہی کترانے لگا۔ وہ بھی شوق میں اسے لے کر نہیں جاتی تھی۔ صرف وہیں جہاں پکڑ کی گید رنگ ہوتی۔ وہ نہ جاتا تو ماریہ کے ڈیڈ اس پر چلانے لگتے۔

”تم سے شادی کس لیے کی ہے اس کی؟“ سب نئے نئے فرعون بنے تھے شاید۔ باپ، بیٹی ایک ہی انداز میں بات کرتے تھے۔ لفظوں کو چباتے ہوئے آواز کو دباتے ہوئے، پھر بھی دل دھلاتے ہوئے۔

عدن کو کیا معلوم کہ اس سے کیوں کی ہے۔ اسے تو صرف اپنی طرف کا ہی معلوم تھا۔ وہی ”کھل جا سم سم“

”اس کے ساتھ جایا کرو۔ اس کا خیال رکھا کرو۔“ مارے بندھے اسے ساتھ جانا ہی پڑتا۔ پارٹیز میں وہ انجوائے تو بہت کرتا۔ لیکن ماریہ کا برتاؤ اس کے خون کا دباؤ بڑھا دیتا۔ وہ ہر کسی کی بانہوں میں جھول جاتی۔ گلے ملتی۔۔۔ گال سے گال رگڑتی اور۔۔۔ اور۔۔۔ اف۔۔۔

ایسے وقت اسے مشکل لگتا۔ صرف اسے گرل فرینڈ سمجھتا۔۔۔ غیرت اٹھاؤ آتی اس میں۔

”تم روز روز ایسی پارٹیز میں آ کر کھکتی نہیں؟“

وہ دیر تک چھوٹے بچوں کی طرح نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ میں گردن ہلاتی رہی۔ عدن اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جس نے اپنے باپ کی نہیں سنی، وہ اس کے کیا سنے گی۔

”میں تمہارے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ترس گیا ہوں۔“

گولڈن ہائی ہیل اتار کر اس نے اپنی گود میں رکھی ہوئی تھیں۔ عدن کے اس طرح کہنے پر ایک ایک کر کے سینڈل اٹھائی اور لا پرواہی سے اس کی طرف اچھال دی۔ ایک منہ اور ٹھوڑی سے رگڑ کھا کر کھڑکی کی طرف ٹک گئی اور ایک کندھے اور سینے کو چھو کر اس کی گود میں گری۔ اس انداز پر وہ جیسے چپ رہا، وہی جانتا تھا۔

”سچ؟“ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

اس بار عدن صرف مسکرایا۔

”تم ایک قابل شوہر ہو۔“ اگلی بات نے اس کی مسکراہٹ کا گلا گھونٹ دیا اور وہ گلا پھاڑ کر ہنسی۔ ایک آنکھ دبا کر آنکھ ماری۔ اب اس کا جی چاہا کہ اسی کی ہائی ہیل سے اس کی یہی آنکھ پھوڑ ڈالے۔ لیکن کیسے پھوڑ ڈالے، اسپتال ابھی نیا نہ تھا۔ وہ بھی وہاں نیا تھا۔

آنے والے دنوں میں وہ بھی ٹھوڑی قابل بیوی بننے لگی۔ میڈ کو دیکھ لیتی۔ گروسری کے لیے جاتی۔ اس کے لیے بھی شاپنگ کرتی۔ کبھی کبھار اسپتال آ کر اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا لیتی اور کبھی کبھار ہی اس کے چھوٹے بڑے کام بھی کر دیتی تھی۔ اب اسے ڈر لگتا کہ یہ اچھی بیوی ہی نہ بن جائے کیونکہ وہ اس سے محبت کرنے کے موڈ میں اب نہیں تھا۔ ”اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔“ اس کی فہرست میں نہیں

تھا۔ ”اس کے ساتھ وقت گزارنا ہے۔“ یہ ضرور فہرست میں درج تھا۔

دیکھو، ایڈیٹر وہ ڈیڈ کی طرف چلے جاتے۔ اس کے ڈیڈ چیکے چیکے ماریہ کی طرف دیکھتے اور پھر اپنی بیوی کی طرف۔ دونوں میاں، بیوی نظروں ہی نظروں میں بہت کچھ کہہ سن لیتے۔ جیسے کہتے ہوں۔
 ”دیکھو، ایسی ٹونکا کام کر گیا۔ بھل گئی ناماریہ۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ اور ٹھیک ہو جائے گی۔
 ایسی گھی، ایسی مرغی، ایسی لوگ بہت کام کے ہوتے ہیں۔ دنیا گھوم پھر لو۔ اپنا دیس کام ضرور آتا ہے۔“
 اور ازبک بیوی جواب دیتی ہو۔ ”ہاں، مان لیا۔“

عدن ایسی نظروں کو پکڑ لیتا تو اور اکڑ جاتا۔ اس کے پاپا غلام علی غلام نے کہا تھا۔
 ”عدن! کوئی توجہ ہے کہ اس کا جھکاؤ ہماری طرف زیادہ ہے۔“ اور وجہ یہی تھی کہ عدن جیسا قابل انسان ہی قابل شوہر بن سکتا تھا۔ ڈرنک اور سگریٹ تو ماریہ کے ناشتے کھانے تھے۔
 ازبک ماں نے کہا کہ وہ کسی طریقے سے ماریہ کو ان سے دور کرے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ ان دونوں میں کچھ تو محبت پیدا ہو ہی چکی ہے اور اس محبت کے نام پر ماریہ بہت کچھ کر لے گی۔

عدن نے سب اٹھا کر پھینک دیا۔ ماریہ ہنسی۔

”کسی نے آج تک اتنی جرأت نہیں کی۔“

”میں جرأت بھی کروں گا اور اصرار بھی۔“ اس بار واقعی عدن نے ہمت سے ہی کام لیا تھا۔

”آ۔۔۔ آ۔۔۔ آئی سی۔“ اس نے ابرو اچکالی۔ پھر مسکرا دی۔

عدن واقعی ایک قابل انسان تھا۔ ماریہ ذرا سا اور بدلی تو عدن کی یادداشت بھی کمزور ہونے لگی۔ وہ شیخ طاہر البشر کو بھولنے لگا۔۔۔ ماریہ کے دوستوں، بے تکلفی، لا پرواہی، طنز، لڑائی اور ادھر ادھر کے دوسرے چھوٹے بڑے واقعات کو بھی بھولنے لگا۔ ویسے بھی وہ مرد و عورتوں تو تھا نہیں کہ حرف آخر رکھتا۔ نہ مردانہ کہ کڈ جاتا۔ وہ ماریہ پر جان نثار کرنے لگا۔ نیا نیا عاشق سا لگنے لگا۔ دونوں ایک ساتھ گھومتے پھرتے، مزے کرتے، اکثر ماریہ کی فیملی بھی ساتھ ہوتی۔

”ڈاکٹر صاحب! تم بہت شرارتی ہو۔“ اس کے گلے سے وہ جھول جاتی۔ جب کبھی وہ ساحل سمندر پر بیٹھ کر اسے خالص پاکستانی انداز میں کوئی ایسی لطیفہ سناتا۔۔۔ اور وہ ریت پر لوٹ لوٹ ہو جاتی۔

”مسز عدن! تم بہت خوب صورت ہو۔“

”تم بیکے فلرٹ ہو۔“

”تم بلی کشمیر کی کلی ہو۔“

”پاکستان تک نہ لے جاؤ مجھے، میں اگر کچھ ہوں تو ازبک ہوں۔“

”پاکستان تک تو آ گئی ہو۔“ اس نے دونوں بازوؤں کا گھیرا اس کے گرد بنالیا۔

”پھنسا لیا تم نے۔“

”بھانسا لیا تم نے۔“

اس کی آنکھوں میں پھونک مار کر وہ بھاگی۔ آنکھوں کو جھپکاتا وہ بھی اسی کے پیچھے بھاگا۔

ہندوستان کے لیے وہ پاکستان سے بھی ہو آئے۔ غلام علی غلام نے زور، زور سے اس کے کندھے پر چھپایا دیں۔ ”ماسٹر نکلے تم تو بھی۔“
 وہ مسکرانے لگا۔ جیسے نوبل انعام ملا ہو۔ شکر یہ کی تقریر اسے ابھی کرنی تھی۔
 ”گدھے کی بچی کو اٹو بنالیا۔“ جتنا ہی قہقہہ بلند ہوا۔ ”کمال کر دیا بھی، واہ! ہزا آ گیا، ہزا آیا۔“ پھر رک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”دل لگی کر رہے ہو کیا؟“
 وہ ہٹا گیا۔ ماریہ اسے اب پھر سے اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اس کی محبت میں تیسری بار نئے سرے سے مبتلا ہو رہا تھا۔

”جو بھی ہے، جاری رکھو۔۔۔ گدھے کی گردن میں کتے کا پٹا ڈال دو، بس پھر ٹھیک ہے۔“
 ”جی، ٹھیک ہے۔“ اس کا باپ کتے کا پٹا سے ڈالنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہاں وہ خود اس کے کتے جیسا تھا۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ رنگ ماسٹر بن جائے۔ شیر سے بھیڑے تک سب کو سدھالے۔ وہ ایسا کر ضرور لیتا۔ اگر اپنے باپ کی طرح ہوتا۔ ابھی وہ بنانا تھا۔ کچھ کتابوں میں پڑھے اخلاق اس کے اندر تھے۔ کچھ ان سب کا انہی وہ عادی نہیں ہوا تھا اور کچھ وہ کبھی کبھی کوفت کا شکار ہو جاتا۔ ورنہ سب ٹھیک چل رہا تھا۔



”تمہاری ماڈلنگ کا کیا ہوا؟“ رات کو چہل قدمی کرتے ایسے ہی عدن نے پوچھ لیا۔ ماریہ نے جھٹکے سے اس کے کندھے پر رکھا سر اٹھا لیا۔

”تم نے کیوں پوچھا؟“
 ”ایسے ہی۔۔۔“ اور اس نے ایسے ہی پوچھا تھا جیسے کوئی بھی بات کر لی جاتی ہے۔

”دوبارہ مت پوچھنا۔“ پرانا تانا ہوا انداز واپس لوٹ آیا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہہ دیا۔ لیکن ٹھیک ہوا نہیں۔

بیڈروم کا دروازہ بند کر کے وہ ڈریک کرتی رہی۔ عدن کو تشویش ہوئی۔ بہت چاہا کہ وہ دروازہ کھول دے لیکن وہ انگلیش میں گالیاں دینے لگی۔

عجیب مصیبت تھی۔ عدن نے اسے بھاڑ میں ڈالا اور دوسرے کمرے میں جا کر سو یا۔ اگلے دن اور اس سے اگلے دن بھی یہی ہوتا رہا۔ پھر ماریہ کی مام آئیں۔ ماریہ ان کا فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ تین دن سے وہ کمرے سے نکلی نہیں تھی۔ قریب جاتے ہی گالیاں دیتی۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی، چلاتی، نہ جانے کیا، کیا کہتی۔

”تو تم مجھے بتاتے۔“ مام اس پر غصہ کرنے لگیں۔

”جب میں ہینڈل نہیں کر سکتا تو آپ۔“

”میں کر لیتی، سمجھتے تم! اس طرح اتنی تکلیف میں اسے اتنے دن رکھنے کی ہمت کیسے ہوئی۔۔۔ تم

اس کے بابا کو فون کر کے بتاتے۔۔۔ تم تو کسی کام کے نہیں ہو۔“ وہ چلا کر چلی گئیں۔

”پاکل۔۔۔ سکی۔۔۔ سارے“ اس نے یہ صرف سوچا، کہا نہیں۔

مام، ماریہ کو زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئیں۔ نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس اس کے سیشن ہونے لگے۔ ہندوؤں بعد عدن کی بھی ملاقات کروائی گئی ڈاکٹر کے ساتھ کہ اسے ماریہ کے ساتھ کیسے رہنا ہے، اہا لہنا ہے۔ کیا نہیں کہتا، کس رویے کا اظہار کرتا ہے، کس کا نہیں کرتا، کون سی بات اسے ڈپریشن میں لے جائے گی اور کون سی احساس کمتری میں۔۔۔ اسے دورے پڑیں گے۔ وہ چلانے لگے گی۔ ڈرنگ لے لے لگے گی۔ عذرا گزری طرف پھر سے آجائے گی اور اس سب کا ذمہ دار اس کا عدن ہوگا۔

تین دنوں کے آٹھ گھنٹوں میں ڈاکٹر نے اس کا دماغ خوب چاٹا۔۔۔ ماریہ سے متعلق اس کی معلومات میں اور سے اور اضافہ ہوا۔

کشمیر کی کٹی، ازبک کی پری، خوب صورتی میں مس یونیورس، ایک کامیاب ماڈل نہیں بن سکی تھی۔ بے تحاشا خوب صورت ہونے کے باوجود اور اس سب کے ساتھ ہی وہ ایک کامیاب ماڈل کے جو اس کا ہوا نے فریڈ تھا، ساتھ تعلق قائم نہیں رکھ سکی تھی۔ ہوا نے فریڈ کی کامیابی کا گراف بڑھنے لگا۔ وہ ماڈلنگ سے کمرشلز اور پھر فلم تک جا پہنچا۔ پھر اس کے لیے ایک گرتے ہوئے گراف کی ماڈل کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اگر وہ دنیا میں اکلوتی خوب صورت ہوتی تو شاید کوئی بات بھی بنتی۔

اب یہ سچی محبت کے کھوجانے کا دکھ تھا یا کیریر نہ بننے کا غم۔۔۔ ماریہ نے ان ہی دنوں ڈرنگز لینی شروع کی۔ سگریٹ، ڈرنگ، سب کچھ وہیں سے آیا۔ شیخ بھی اسی بے راہ روی کا نتیجہ تھا۔ ڈپریشن کے ان ہی دنوں میں اس نے بہت کچھ کیا۔ اسے دنیا گھمائی گئی۔ لیکن ہر بار اس نے نیا ہی کارنامہ انجام دیا۔ ڈاکٹر اور اپنی ساس کے ساتھ آخری ملاقات میں اس کا جی چاہا کہ وہ جاتے ہی ماریہ کو فارغ کر دے۔ اتنی تھوکی ہوئی لڑکی وہ چاٹ رہا ہے۔ ذات کی اتنی بد عمل میں اتنی کتر، اس رات وہ صبح تک ہار میں بیٹھا رہا۔ اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے بال نوچے۔۔۔ دولت کے ساتھ ہی سہی، لیکن اس نے کبھی ایسی زندگی کا نقشہ نہیں بنایا تھا۔

وہ کسی زندگی گزار رہا ہے۔ اپنی جوانی کے سنہرے دن کس کے ساتھ گزار رہا ہے۔ وہ کیا کر رہا ہے؟

”آپ نے یہ سب ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ خالص پاکستانی انداز میں اپنے سرالیوں پر جھوٹا ناچا رہتا تھا۔

”کیا سب؟“ ساس کی بھی فرعونوں جیسی گردن اکڑ گئی۔

”اپنی بیٹی کے کرتوتوں کا۔“

”تم نہیں جانتے تھے اسے؟“

”صرف اسے جانتا تھا۔“

”تم اور تمہارے پاپا تو یہاں آتے رہتے تھے۔ تمہیں معلوم تھا ماریہ کا لائف اسٹائل۔ اس لب و لہجہ اور اتنی اونچی آواز میں دوبارہ مجھ سے مخاطب نہ ہوتا۔۔۔ میں ماریہ کی ماں ہوں، تمہاری نہیں۔“

”آپ کو اسے سمجھانا چاہیے۔“ ہنٹر کھا کر وہ سنہل گیا۔

”سمجھالیا، اب تم سمجھاؤ، سنہالو اسے۔“ انداز ایسا جیسے تمہیں تنخواہ دیتے ہیں اپنی ڈیوٹی کرو۔

”وہ میری نہیں مانتی، مجھے اس کی فکر ہے، میں اسے ایسے نہیں دیکھ سکتا۔“
 انہوں نے آنکھیں پھیلا کر ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔ یہ وہی ہے جو ابھی کر تو توں کی بات کر رہا تھا
 اور اب فکر کر رہا ہے۔
 ”کوشش کر رہے ہیں ہم۔۔۔ تم بھی کرو۔ کبھی کبھی وہ ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔ ہو جاتا ہے ایسا،
 سب کے ساتھ، ہو جاتا ہے۔“ سراس سے ہار کر وہ پاپا کو فون کرنے لگا۔
 ”وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے۔ میں نے کبھی کسی کے ایسے رویے نہیں
 دیکھے۔“

”تو تم سامنے سے ہٹ جایا کروں!“ وہی جتنی قہقہہ لگا۔

”پاپا۔۔۔ پلےز۔“

”یار۔۔۔! بچے ہو کیا تم؟“

”جنگلی ہے وہ۔“

”جنگل کا کون سا ایسا جانور ہے جسے انسان نے پالتو نہیں بنایا۔ پھرے میں لائیں بٹھایا۔“

”سانپ نہیں پالنے میں نے۔“

”تو تین بجاؤ، نچاؤ اسے۔“

”وہ مجھے نچاتی ہے۔ میرا سکون تباہ ہو رہا ہے پاپا!“

”دور رہو اس سے، کرنے دو جو کرنی ہے۔“

”اس کا باپ کہتا ہے۔ اس کا خیال رکھو۔ دور کیسے رہوں؟“

”اس گدھے کو الونہیں بنا سکتے تم؟“

”وہ مجھے گدھا بنا رہا ہے۔“

”عدن! لڑکیوں کی طرح رونا بند کرو، مرد بنو۔“

اور وہ مرد بن گیا۔ ماریہ کا حال چال پوچھتا۔۔۔ بات کرنے کی کوشش کرتا، بات کر لی تو ٹھیک،
 ورنہ ادھر ادھر ہو جاتا، خود وہ اپنے معمولات میں سیٹ تھا۔ صبح اٹھتا، جو گنگ، ورزش کرتا، اپنا ناشتا خود
 بناتا اور اسپتال آ جاتا، ماریہ سے نہیں زیادہ اسے اسپتال کی فکر تھی۔ رات کو دیر سے آتا۔ ماریہ کے کمرے
 کا دروازہ کھلا ہوتا تو اسے دیکھ لیتا۔ ورنہ بند دروازہ دیکھ کر شکر ادا کرتا۔ اپنے کمرے میں آ کر سو جاتا۔
 ماریہ کے دورے کی حالت طویل ہو کر ختم ہونے لگی اور وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
 ”ایک بار تم نے مجھے کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“ اتنا عرصہ پہلے کی بات اسے یاد تھی۔

”ہاں کہا تھا۔“

”اب بھی کرتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔۔۔ اور اس وقت وہ ہنسی تھی۔

”عدن گڑبڑا گیا۔۔۔ ہاں ہی کہتا پڑا۔“

”نہیں، تم نہیں کرتے۔“ وہ ہسٹریائی ہنسی، بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی اٹھا کر اس کی طرف لہرائی۔

”نہیں کرتے نا؟“ ہاتھ گود میں گرا لیا۔

”تم تو میرے شوہر ہو بس۔۔۔ قابل شوہر۔۔۔ بس۔“
 وہ تاسف اور گہرے دکھ سے بولی۔ کچھ پل چپ رہی۔ پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر پگلی سی ہنسی ہنسنے لگی،
 ”میں نے عدن کی شرٹ کے کالر کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔“
 ”عورت ہوں۔۔۔ پائل نہیں ہوں۔ کتنی ہی بے حس ہو جاؤں، محبت کی حس رکھتی ہوں۔“ وہ
 پارلیمینٹ ہاؤس نے لگی۔

”چھوڑو مجھے۔“ پھر دورہ پڑا۔ اس نے دل میں سوچا۔
 ”نہیں چھوڑتی۔“

”ماریہ!“ وہ نرمی سے بولا۔ کالر آزاد کروا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔
 ماریہ نے کہا کہ وہ عورت ہے، لیکن پائل نہیں۔ لیکن سینے سے لگا کر وہ اسے بتا دے گا کہ وہ پائل
 ہے یا نہیں، صرف چند ہی جملوں میں۔

”محبت نہ کرتا تو تم سے شادی کرتا؟“ پہلا جملہ۔
 ”تم پر پل پل مرتا ہوں۔ مرنا چاہتا ہوں اور تم۔۔۔“ دوسرا جملہ۔

”اور میں۔۔۔؟“ اس نے بہت معصومیت سے پوچھا۔
 ”تمہیں نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔“ وہ جیسے بہت دھڑکی تھا اس کے لیے۔

”کیا ہو جاتا ہے عدن؟“ اس کی طرف بہت آس سے دیکھا۔

”میں تو ٹھیک ہوتی ہوں۔ خراب تو دوسرے ہو جاتے ہیں۔“

”میرے ہو تم؟“

”ہاں، صرف تمہارا۔“

”صرف میرے؟“ بہت پیار سے پوچھا گیا۔

”صرف تمہارا۔“ بے حد پیار سے کہا گیا۔

محبت کے نام کی بین بچا کر عدن نے اسے سلا ڈالا۔ وہ بہل گئی، ٹھیک نظر آنے لگی، صبح اٹھ کر اس
 کے ساتھ جو گنگ کے لیے جاتی۔ بھاگتے ہوئے ٹانگوں میں اپنی ٹانگ اڑا کر اسے منہ کے بل گرا دیتی۔
 وہ چلا۔ وہ بھاگ جاتی۔ رات کو وہ سوتا تو نفل والیوم میں میوزک لگا کر خود دوسرے کمرے میں بھاگ
 جاتی۔ اس کے کپڑے اور گاڑی کی چابی چھپا دیتی۔ گھر میں وہ آگے آگے بھاگتی، وہ پیچھے پیچھے بھاگتا۔
 پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر ڈیٹا کھر تھا۔ آج کل ناشتا وہ ان کے ساتھ کرنے لگے تھے۔ اس کے ڈیٹ
 اس سے لاڈ کرتے۔ اس کی پلیٹ بھرتے، اس کے ہاتھ کی ہتھیلی کو ہونٹوں سے لگاتے اور اس کے بالوں
 کو ذرا سا کھینچتے۔

”گھوم پھر کیوں نہیں آتے تم لوگ۔۔۔“ بیٹی ذرا سناٹھی تو ٹرپ آفر کیا جانے لگا۔

”آفر اچھی ہے۔“ ماریہ نے جوس کا ایک گھونٹ بھر کر کہا۔

عدن کا خیال تھا وہ نہیں جائے گی کیونکہ وہ سنجیدہ نظر نہیں آرہی تھی۔ لیکن وہ سنجیدہ ہی تھی۔ اس نے
 ہاں کر لیا تھا اور کیا خوب پلان کیا تھا۔

عدن کو لگا کہ اس نے کوئی غار اور دہانہ نہیں چھوڑا۔ اس ٹرپ میں وہ اتنی سنجیدگی سے ان سب کا جائزہ لیتی رہی جیسے ان پر کتاب لکھ رہی ہو۔ عدن میں موج مستی کا عنصر زیادہ تھا۔ اسے کھنڈرات سے ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

کسی زمانے میں اسے شوق ہوا تھا اجڑی عمارتوں کو دیکھنے کا۔ چند ماہ اس نے دل لگا کر دیکھیں بھی۔۔۔ پھر۔۔۔

وہ جاپانی زیر زمین ٹرین سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اور ماریہ نے اسے ریڈ وڈ جنگل میں چلنے والی گھنسی سیاحتی ٹرین میں بٹھادیا۔ یہ ٹرپ اس کے باپ کی طرف سے تھا تو مرضی بھی باپ کی بیٹی کی ہی چلتی تھی۔ اس کا ٹرپ تو خاک ہوا۔ ماریہ البتہ تروتازہ ہو گئی۔

”ڈیڈ ٹھیک کہتے ہیں۔“ بہت دنوں بعد اس نے یہ جملہ دوہرایا۔

”تمہارے جیسے شوہر مزے سے بندھے رہتے ہیں۔۔۔ نہ جاتے ہیں، نہ جانے دیتے ہیں، سر جھکائے مانے جاتے ہیں۔“

بہت ذہین تھی۔ اسے قائل ہونا پڑا۔ شاید ڈیڈ نے یہاں بھی کچھ کہا تھا۔ دنیا میں کسی ایک مرد کی تو وہ سنتی تھی مگر۔۔۔ وہ مرد اس کا باپ تھا۔ اس لیے نہیں وہ مرد اس سے ہر حال میں محبت کرتا تھا اس لیے۔۔۔ ہر انسان کو ایک ایسے ہی انسان کی ضرورت ہوتی ہے، جو ہر حال میں اس سے محبت کرے اور گندے سندے راستوں میں صرف ایک محبت کا ہی راستہ ہوتا ہے جو گندے نکال کر باہر کرتا ہے۔ اب یہ اس محبت کے فلسفے اور اساس پر ہے کہ وہ گندے کسے سمجھتا ہے۔



اسپتال کا سارا منافع عدن کی جیب میں ہی جاتا تھا۔ اس کا اکاؤنٹ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ غلام علی غلام کے ساتھ اس نے ایک فیکٹری میں حصہ داری کر لی۔

”اپنے سر کے برابر ہو جاؤ تو مانوں۔“ وہ اسے ہمیشہ بڑا ناگرت ہی دیتے تھے۔ سو میٹر کی ریس اس نے جیتی تو انہوں نے کہا۔

”پہلے نمبر پر تو کوئی بھی آجائے گا، کوئی ریکارڈ بناؤ کہ کوئی توڑ نہ سکے۔“

جناب آغا عباس حیدر۔۔۔ اس کے سر!

جس کا اپنا ایک ذاتی طیارہ تھا۔ امریکا میں پھیلی ہوئی اسٹورز کی چین تھی۔ آس پاس کے ملکوں میں گھر اور اپارٹمنٹ تھے اور عدن کے باپ کے پاس صرف تین فیکٹریاں تھیں، جو مختلف مشینیں آلات بناتی تھیں۔ صرف پاکستان کے دو شہروں میں دو جنگلے تھے۔ ایک فارم ہاؤس تھا، بس۔

ایک فیکٹری پر مقدمہ چلتا رہا تھا۔ اس مقدمے نے ان کی ساکھ خراب کر دی تھی۔ پیسہ الگ پانی کی طرح لگ رہا تھا۔ طرح طرح کے لوگوں کو خریدار جا رہا تھا۔ بے نقص منصوبہ تھا آگ لگانے کا۔ بیمہ کمپنی کے تفتیشی جاسوسوں نے پکڑ لیا۔ غلام علی غلام نے الٹا بیمہ کمپنی پر مقدمہ کر دیا۔ بیمہ کمپنی بھی سینہ ٹھوک کر میدان میں اتر آئی۔

یہ سب اس کی شادی سے پہلے ہوا تھا۔ بعد ازاں۔۔۔ مقدمے کو کسی نہ کسی طرح ختم کر دیا۔

ایلمری کو نئے سرے سے کھڑا کیا۔ اسی فیکٹری کا آدھا مالک عدن تھا جس نے اپنے حصے کے سارے ہسپتال کے منافع سے دیے تھے۔

جب کبھی ماریہ پر دورے پڑتے تھے۔ جی تو اس کا چاہتا کہ مار مار کر اس کا حال برا کر دے۔ لیکن ایسی مار اس کا اپنا حال بدترین کر دے گی۔ اب وہ اپنے سر کو پیچھے رکھنا چاہتا تھا تو اسے ماریہ کو آگے رکھنا ہی تھا۔ ابھی ماریہ کو مارنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ شام کو اسی کے لیے وہ گھر جلدی چلا جاتا۔ وہ اس کے لیے کوئنگ بھی کر لیتی تھی۔ اس کے کپڑے ترتیب سے ہنگ کر دیتی تھی۔ اس کے نخرے بھی اٹھا لیتی تھی۔ وہ بھی لاڈ کر لیتا، لیکن اس سب کے دوران بھی وہ اس کے لیے ایک امتحان بنی ہوئی۔

عدن حسن پرست تھا اور کتنا بھی حسن پرست تھا، عورت میں شرافت کا قائل تھا۔

وہ اندر سے ایک گھسا پٹا روایتی مرد تھا۔ نیک سیرتی کا تمنائی، شرافت اور حیا کا دلدادہ، قدر کرے، نہ کرے تعریف کرے، نہ کرے، پر تمنائی ضرور تھا۔ کالج میں اس نے ایک سے بڑھ کر ایک حسن کے عجوبے سے دوستی کی، فلٹ کیا، لیکن ان عجوبوں کے قریب ہوتے ہی وہ انہیں مختلف فہرستوں میں درج کر لیتا۔ یہ فلٹ کے لیے، یہ صرف دوستی کے لیے، یہ ہائے پہلو کے لیے۔ یہ صرف مسکرا کر دیکھنے، کبھی کبھار بات کرنے کے لیے۔ یہ ذرا ذائقہ بدلنے کے لیے، یہ ہل بازی کے لیے، یہ بور ہوتے وقت فون پر بات کرنے کے لیے۔

ان میں سے ایک بھی ”یہ شادی کے لیے“ والی فہرست میں نہیں آئی تھی۔ امیر سے امیر ترین بھی نہیں۔۔۔ ایک، دو نے اسے بہت شوق سے اپنے خاندانوں سے طوایا، لیکن وہ ان سے مل کر بھی پرے پرے ہی رہا۔ ایسا بھی کڑا وقت اس پر نہیں آیا تھا کہ سیکنڈ ہینڈ کتابیں لے کر پڑھے اور اسے دوم پر کچھ پسند بھی نہیں تھا۔ نہ انسان، نہ حیوان، نہ چیزیں، نہ درجے۔۔۔ اس کا ہر پیمانہ اول تھا۔ عورت کے پیمانے پر ایک اول اسے ملا تھا۔ لیکن دولت کے نمبر پر اس کے پاس آخری نمبر بھی نہیں تھے اور یہی اول اسے اکثر یاد آ جاتا۔

جب وہ گرے ہوئے نمبروں والی ماریہ کو بوسے لیتے، ڈرنک کرتے، ناچتے اور دوڑنے کی حالت میں دیکھتا۔ اس کے منہ سے گندی گندی گالیاں سننا تب بھی۔

بس اسی لیے عدن نے ماریہ کو ایک نقطہ ہی بنالیا تھا، تا کہ جب چاہے اسے کاغذ سمیت پھاڑ کر پھینک دے۔

جسمانی طور پر وہ کچھ ایسی پیچیدگیوں کا شکار تھی کہ آئندہ چند سالوں تک وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ عدن کے پاس یہی چند سال تھے۔ اسے گرے ہوئے نمبروں والی سے گرا ہوا پیچ نہیں چاہیے تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ جانتا تھا کہ اگر ماریہ کے جی میں آئی تو وہ ہر پیچیدگی کو بالائے طاق رکھ کر ماں ضرور بن جائے گی لیکن ابھی ان کے درمیان بچے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

تیرہ ماہ کی شادی شدہ زندگی کی چارج شیٹ سے غلام علی غلام صاحب مطمئن تھے۔ عدن کے اکاؤنٹ سے پیسہ ان کے اکاؤنٹ میں جاتا تھا۔ وہاں سے فیکٹری میں لگتا۔ منافع اکہرے سے دو ہزار اور دو ہرے سے تین کنا بڑھنے لگا۔

”تم ایک اور اسپتال کیوں نہیں بنوا لیتے؟“ ماریہ خوش تھی۔ زندگی سیٹھی تو پاپا نے بروقت مشورہ دیا۔ اس نے وقت نکال کر اپنے سر سے ان کے آفس میں ملاقات کی۔ انہوں نے نہ تائید کی، نہ انکار، وہ بولتا رہا، وہ سنتے رہے۔ جیسے ”سرا! آپ کے شوز پالش کر دیے ہیں۔“ اور سر۔۔۔ سر اٹھا کر ”ہوں“ بھی نہیں کہتے۔

چند ہفتوں بعد اسے معلوم ہوا کہ ماریہ کے نام ایک پراپرٹی لی گئی ہے۔ چند ہفتے اور گزرے تو اس کے سراسر اسپتال دکھانے لے گئے۔ عدن کو اس سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ کاغذات ماریہ کے نام ہیں۔ اسے منافع سے غرض تھی۔ آگے کے اس کے پلانز بھی بہت کمال کے تھے۔ وہ کسی تیسرے شخص سے (دراصل خود) اپنے سر کے اسٹورز میں شیئرز لے گا۔ وہ ان ہی کے پیسوں سے ان ہی کے کاروبار میں گھس جائے گا۔

اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے لیے ماریہ نے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا۔ وہ ہسٹری میں ماسٹرز کر رہی تھی جب اس کا تعلیمی سلسلہ چھوٹا تھا۔ اب ذہنی طور پر وہ کچھ بہتر ہوئی تو دوبارہ ایڈمیشن لے لیا۔ عدن دوسرے اسپتال کو بھی سیٹ کرنے لگا۔ میڈ گھر کو دیکھتی۔ بوشن میں سب ٹھیک تھا۔ پاکستان میں بھی سب ٹھیک تھا۔

بات وہاں سے بگڑ گئی جب وہ ماریہ کے ساتھ ایک تقریب میں چلا گیا۔ آج کل ماریہ بہت کم پارٹیز میں جاتی تھی۔ اس کی دوستوں نے اصرار کیا تو وہ اسے ساتھ لے کر آئی۔ وہ دونوں اور اس کی دو دوستیں ساتھ ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ایک دوست نے اس کے کان کے پاس منہ لا کر کچھ کہا۔ ماریہ نے ذرا سا گردن کو خم دے کر جھجھک دیکھا۔

عدن نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ لیکن ہجوم میں اسے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ ”ہورمی ہوگی کسی کے ملبوس یا جیولری کی بات۔“ اس نے خیال نہ کیا مگر ماریہ کی جیسے حالت غیر ہو گئی۔ وہ رنگ بد لے گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اوپن ایئر میں سکڑتے سمٹتے ہجوم میں اس نے کئی بار نظریں گھما کر اسے دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ اسے نظر نہیں آئی۔ اس کی دوستیں بھی غائب ہو گئیں۔ وہ ٹہل ٹہل کر اسے ڈھونڈنے لگا۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ اس نے فون کیے لیکن وہ کال کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ بہت دیر بعد اس کا بیٹج آیا۔

”میں اپنی دوستوں کے ساتھ ہوں، تم چلے جاؤ۔“

”تم ہو کہاں؟“

”تمہیں اس سے کیا؟“ بھرکتا ہوا جواب آیا تو وہ گھر آ گیا۔ چند گھنٹوں بعد اسے بھی آ جانا تھا۔ لیکن وہ نہیں آئی، اگلے دن شام تک نہیں۔ اس کا فون بھی بند تھا۔ اس نے اس کی مام کو فون کر کے بتا دیا۔ اب وہ اس کا کوئی الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا۔

”وہ اپنی فرینڈ کے ساتھ ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اسی کے ساتھ چلی گئی۔“ ازبک مام نے نہ جانے کس کس فرینڈ کو فون کر کر کے اس کا پتا کیا اور اسے بھی بتا دیا۔

اس کی طبیعت کو وہ جانتا تھا۔ رات کو وہ واپس آئی تو وہ پوچھے بنا رہ نہیں سکا۔ وہ الماری کھولے

کپڑے نکال نکال کر دیکھ رہی تھی، جیسے سنا ہی نہیں، کپڑے ساتھ لگا لگا کر دیکھتی رہی۔ عدن کا جی چاہا کہ گردن سے پکڑ کر اسے زمین پر پٹ دے۔

”میں پوچھ رہا ہوں۔“

”کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”بیوی ہو م میری۔“ اتنی مشرقی بات مغربی بیوی کے سامنے۔

”تم بھی میرے شوہر ہو، میں نے تو کبھی نہیں پوچھا۔“

دانت پر دانت جما کر آواز کو دبا کر وہ بولا۔ ”تو پوچھ لیا کرو۔“

”اگر پوچھا تو بتانا بھی پڑے گا۔“ ایک تو یہ باپ بیٹی چالاک بہت تھے۔ ہر چیز کی حد بندی کیے بیٹھے تھے۔

”تم نہ بھی پوچھو تو تمہیں یہ بتانا ہی پڑے گا تم کہاں تھیں کل رات، ڈرنک کرتی رہی ہو، اپنی حالت دیکھو، کس کے ساتھ تھیں تم؟“

اب وہ سیدھی ہوئی ”بتاؤں؟“ آواز میں تسخر بھی تھا اور اتراہٹ بھی ”رکیس کے ساتھ تھی۔“

”تمہارا وہی ماڈل بوائے فرینڈ۔۔۔؟“

”کمال کی یادداشت ہے تمہاری۔“ تالی بجانے جیسا انداز۔

”تم اس سے ملیں؟“

”کیوں نہ ملتی۔ دو سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔“

”رات بھر۔۔۔“ عدن کا سر گھوم گیا۔ وہ آزاد خیال ہے، لا پرواہ ہے، ڈھیٹ ہے، پراتی۔۔۔ وہ نہیں جانتا تھا، جو کچھ شادی سے پہلے کیا وہ اس پر ڈھیٹ بن گیا۔ بے غیرت ہی سہی، مگر ابھی وہ زندہ تھا۔ اس کی موجودگی میں اسے نہ کوئی ڈرنک لحاظ، جو اصل تکلیف تھی عدن کو، وہ یہی تھی کہ اس کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ دو قدم بڑھا کر ایک زوردار ٹھنرا اس کے سفید گال پر مارا، اتنی زور سے کہ وہ مل کھا کر نیچے گر گئی۔ ہونٹ سے خون کی ایک باریک لکیر نکلی۔

”بے غیرت۔۔۔ ذلیل!“ کچا چاتی آواز۔

فرش پر گرے سر اٹھا کر اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”میری بیوی ہو کر تم رات بھر کی اور کے ساتھ رہیں۔“

ٹانگوں کو سمیٹ کر وہ ابھی اور کمرے سے نکل گئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔

عدن غصے سے مل کھاتا ٹھٹھنے لگا۔ اب وہ اس عورت کے ساتھ اور نہیں رہے گا۔ بہت ہو گیا۔۔۔ ذلیل۔

سائرن بجنے لگا۔ عدن نے توجہ نہ دی۔ سائرن کی آواز قریب آگئی تھی۔ ماریہ کمرے سے نکلی۔

لیک کر داخل دروازہ کھولا۔ دو پولیس آفیسر زاندر آئے۔ ماریہ نے عدن کی طرف اشارہ کیا اور تیز تیز

بولنے لگی۔ آفیسر نے بڑھ کر اسے جھٹک لی گئی۔

”ماریہ!“ اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ میاں بیوی کے جھڑے گھروں میں نہیں رہتے۔ یہ

امریکا ہے۔ ”میں تیرا لباس تو میرا لباس“ یہاں یہ نہیں چلتا۔ طاقت کے بے دریغ اور غلط استعمال پر

یہاں حدیں لگادی جاتی ہیں مارکھا کر چھپ کر رویا نہیں جاتا۔
 ماریہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گئی۔ ایک ٹانگ جھلانے لگی۔
 ”چور بچائے شور۔“ اردو کا یہ فقرہ اسے بروقت یاد آیا۔ اس کے نزدیک چور صرف ماریہ تھی۔



پاکستان میں ٹاپ کرنے والے دیوانے کے باپ غلام علی غلام کوکانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی گئی کہ وہ جیل میں ہے۔ عدن کے وکیل نے اس کے سر کو بتایا۔ انہوں نے ماریہ سے بات کی اور جب وہ باہر آیا تو سیدھا ان ہی کے دفتر گیا۔ اس کا خون ابل رہا تھا اس گھٹیا عورت کے اس درجے کے گھٹیا پن پر۔ اپنا ہمدرد بنانے کے لیے اس نے انہیں ساری بات بتائی انہیں غیرت دلانا چاہی کہ ان کی بیٹی ساری رات کسی کے ساتھ تھی۔

وہ اپنی بیٹی کی طرح ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھے رہے جیسے ان کا بکتران سے احکامات لے رہا ہے۔ سگار پیتے رہے نہ تائید نہ انکار۔ نہ مزید کی حوصلہ افزائی۔
 ”تم نے اسے مارا کیوں؟“ ساری بات سن کر بھی یہی پوچھا۔

”ہاتھ اٹھ گیا تھا میرا۔“ سوال اسے پسند نہیں آیا۔
 ”تم نے اس کی پوری بات سنی۔ وہ ریکس سے ملی۔ اس نے سب کو ڈنزا فر کیا تو ساتھ چلی گئی دو اور دوست بھی ساتھ تھے، رات وہ اپنی دوست کے پاس رک گئی بس۔۔۔ اور تم نے اسے مارا۔“
 سمٹ سمٹا کر ساری غلطی عدن کی نکلی۔

”یہ پاکستان نہیں ہے۔“ کیسا باپ تھا۔
 ”اے مجھے فون کر کے بتانا چاہیے تھا۔ اس نے کہا وہ ریکس کے ساتھ ساری رات۔۔۔۔۔“
 ”تو ساری رات۔۔۔ کیا ساری رات دو دوست باتیں نہیں کر سکتے؟“ اپنے سر کی اس اعلا درجے کی مثالی بے غیرتی پر اسے بہت تاؤ آیا۔

”میں اس کا شوہر ہوں۔ اجازت نہ لیتی، بتاتی تو سہی، کیا میں اپنی بیوی کے ساتھ ریکس کے ڈنر میں نہیں جاسکتا تھا۔“ دراصل آج عدن نے سوچ لیا تھا کہ اس باپ کو یہ بتا کر ہی اٹھے گا کہ اس کی بیٹی کے کڑوتوا کیا ہیں۔

”ہسپتال سے کتنا منافع آتا ہے، تم اسے بتاتے ہو؟“

”ہڈاپ۔۔۔ آگے پیچھے سے اسے ہنر لگنے لگے۔

”اور وہ منافع کہاں جاتا ہے یہ۔۔۔؟“

اتنا اندھا بھی نہیں تھا اس کا سر جو وہ اور غلام علی غلام سمجھے بیٹھے تھے۔

وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔ ہر بار لا جواب ہو کر ہی اٹھتا تھا۔

”ریکس اس کا صرف اچھا دوست ہے اور بس۔۔۔ شوہر اس کے تم ہی رہو گے، فکر نہ کرو۔“ جان

دار قہقہہ لگا اور ہڈاپ ہڈاپ ہنزا اسے لگے۔

اس کے اندر نفرت کی آگ جلنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ ان دونوں کو اس نوبت تک لے آئے کہ وہ

اس کے تلوے چائیں اور وہ انہیں ہش ہش کرے، ایسی کاری غرب کی شکست دے کہ دونوں انگلش میں بات کرنا بھول جائیں۔

لیکن ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی چپ رہ کر انتظار کرنا تھا، یہ سب جو اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ اسے کچھ کا کچھ بتانا جا رہا تھا تیرہ ماہ پہلے وہ ایسا نہیں تھا اور تیرہ ماہ بعد وہ ویسا نہیں رہا تھا۔ جب وہ گھر آیا تو ٹیلی پر پاؤں رکھے، ماریہ ٹیل پالش لگا رہی تھی۔ اس پر ایک نظر ڈالے بغیر اپنا کام کرتی رہی۔ وہ ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا۔ وہ انٹی ڈریسنگ گاؤن سے بلیو لائٹ گاؤن میں آئی۔ رولرز کھولے، میک اپ کیا اور تک تک کرنی چلی گئی۔

عدن اپنا سر تمام کر بیٹھ گیا۔ وہ ڈینی مرلیض بن جائے گا ماریہ کے ساتھ رہتے۔ اس کا لمحہ بھر کو جی چاہا کہ لات مارے سب پر اور بھاگ جائے۔ جیل ہو آیا تھا، سر کے ہنٹر کھا آیا تھا۔ پاکستان کے لائق فائق خوب صورت لڑکے کا یہ حال ہو رہا تھا۔ خود کو نادل کرنے کے لیے اس نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں اور بہن سے بات کی پردہ اور ڈسٹرب ہو گیا۔ اس کا جی کسی اور کوئل کی آواز سننے کو چاہنے لگا۔

”تم بتاؤ، تمہیں کیا پریشانی ہے؟“
”تم کیا کرو گی؟“

”میں دعا کروں گی۔“ کوئل نے بہت اعتماد سے کہا۔

”میں نے بھی اپنے لیے دعائیں کی۔ کسی سے کیا کراؤں گا۔“ قہقہہ۔

”تم نے تو خود سے میری طرح محبت بھی نہ کی ہوگی، یہ دعا بھی مجھے ہی کرنے دو۔“

”میں اتنا پگلا مذہبی نہیں ہوں۔ پگلا کیا مذہبی ہی نہیں ہوں۔“

”اللہ کے تو ہونا۔۔۔ اللہ کے بتائے۔۔۔ یادہ بھی نہیں؟“

”عالم مت بنو۔“ اس نے اکتا کر فون بند کر دیا۔



ماریہ پہلے والی ماریہ بن گئی، رات رات غائب رہتی، کبھی کبھار ہی عدن کو اس کی شکل دیکھنے کو ملتی۔

”مر جائے۔“ اس کی طرف دھیان جاتے ہی وہ سوچتا۔

”چند سالوں کی بات ہے۔ صرف چند سال۔“

وہ کچھ دنوں سے ایک فون نمبر کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ہر بار مایوسی ہی ہوئی، نمبر یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ نمبر بھول چکا تھا۔ جس سم میں وہ نمبر تھا وہ سم اس نے پاکستان میں اپنے ہاتھ روم کے فلیش میں بھادی تھی اور اب وہ نمبر یاد کرنا چاہ رہا تھا۔

آج اسے میا می جانا تھا اسپتال کے لیے کچھ آلات لینے۔ کام تو ایک ہی دن کا تھا لیکن وہ ایک ہفتے کے لیے جا رہا تھا۔ بیک لے کر وہ ایئر پورٹ آ گیا ابھی کاؤنٹر تک نہیں گیا تھا کہ دو امریکن اس کے آگے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے۔ اپنے کارڈ نکال کر اسے دکھائے، عدن کی آنکھیں کھل گئیں۔

”ہم وداز۔“ (ہمارے ساتھ آؤ)

”لیکن کیوں؟“ عدن حواس باختہ ہو گیا، امریکن پولیس اور سی آئی سے کی کہانیاں وہ اخبارات

میں آئے دن پڑھتا تھا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک نے کمر کے پیچھے اس کے ہاتھ لے جا کر لاک کیے اور اسے آگے دھکا دینے لگا دوسرے نے بازو پکڑ لیا۔

”میں نے کیا کیا ہے۔ کیوں لے جا رہے ہیں مجھے آفسرز!“ اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ وہ دونوں گونگے بہرے بنے اسے ساتھ لے کر کار تک آئے، سر پر ہاتھ رکھوا کر اسے اندر دھکیلا اور کار چلا دی۔ وہ سارے راستے، کیوں، کیاں، کیسے جیسے سوال کرتا رہا کوئی جواب نہیں ملا۔ اسے ایک اندھیرے سیل میں بند کر دیا گیا۔

وہ اس وقت جیل میں ہے اس کا جرم کیا ہے۔ وہ نہیں جانتا، جن دلوگوں کے ساتھ وہ آیا انہوں نے اسے سیکریٹ سرورس کارڈ دکھایا تھا۔

”یہ کیا مذاق ہے؟“

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ وہ زونے کے قریب ہو گیا۔

کیا یہ ماریہ نے کیا ہے، لیکن وہ ایسا کیوں کرے گی، اگر چاہے بھی نہیں کر سکتی۔ امریکا میں ایسی فون کا لڑ نہیں چلتیں جن کے ملائے اور بات ہوتے ہی بے گناہ لوگ جیل میں دھر لیے جائیں اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو اس پیمانے پر نہیں کہ ماریہ جیسی کرگزرے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کسی کو یہ دھمکی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے اور اس کا سر کون ہے۔ بے خیالی میں وہ دیوار سے سر ٹکا کر بیٹھا رہا۔ اب ان امریکن کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تو ٹھیک ہے یہ کلیئر کر لیں۔ اس کا حساب صاف تھا، چند گھنٹے اونگھنے کے بعد اسے پیاس لگی، لیکن پانی نہیں تھا اس کے ہاتھ پیچھے کمر بندھے تھے۔ وہ ”واٹر واٹر“ چلانے لگا۔ کافی دیر تک چلاتا رہا لیکن گلا پھاڑا آواز سیل میں ہی گونجتی رہی۔ اس کا حلق اور خشک ہو گیا۔ رات تک چلانے کی ہمت بھی جاتی رہی۔

صبح تک وہ بھوک اور پیاس سے فرش پر بچھ گیا اٹھ کر بیٹھنے کی سکت بھی نہ رہی۔ سیل کے اندر کوئی نہیں آیا۔ نہ ہوا، نہ پانی، نہ کھانا، نہ انسان۔

اس کے پیٹ سے آوازیں آنے لگیں دوبارہ وہ نیم بے ہوش ہوا، غنودگی طاری ہوئی لیکن نیند نہ آئی۔ گزرتے گزرتے پل گھنٹے بن کر ایک اور پورے دن میں ڈھل گئے۔ شام ہوئی رات آئی۔ پیاس سے اب وہ بالکل مرنے کے قریب تھا۔ اب وہ اپنی زندگی بھر کی کمائی ایک قطرہ پانی پر لٹا سکتا تھا۔ کسی کا قتل کر سکتا تھا، ایک یونٹ کے لیے وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس نعمت کی قدر اسے آج سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ صرف دونوں میں ہی وہ بھول گیا کہ وہ کون ہے، کتنا لائق فائق ہے، کتنی فیکٹریوں کا مالک ہے، وہ آج کا آئندہ کا بھول گیا، لیکن حیرت انگیز طور پر اسے گزشتہ سے پیوستہ یاد آنے لگا۔ چند اور گھنٹے گزرے۔ رات گہری ہو گئی۔ وہ فرش پر ہی ادھ موا پڑا رہا۔ ہونٹ سوکھی لکڑی کی مانند ہو گئے۔

اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ اٹھ کر چلائے۔ لیکن اٹھ نہ سکا، باقاعدگی سے ورزش کرنے والے کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنا کمزور ہے۔ کچھ باتیں بہت چالاک ہوتی ہیں۔ وقت آنے پر ہی کھلتی ہیں۔ بھلے

سے پہلے کتنے بھی تجربے کر لو پر کھلو۔ حساب کتاب لگا لو۔ جب کھلتی ہیں تو ہی اصل پر کھدیتی ہیں۔
جب وہ پیاس سے بالکل مرنے کے قریب ہو گیا تو اس کے سیل کا دروازہ کھلا۔ دو لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔

اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اس کمرے میں موجود تیسرا شخص اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لایا۔
”ہوا ریو؟“ (کون ہو تم) پیاس سے مرنے کے قریب عدن کو کچھ اعزازہ ہوا کہ اس سوال سے اس کا مطلب کچھ اور ہی ہے۔

”ڈاکٹر۔۔۔ عدن۔۔۔ ہرینڈ آف۔۔۔ سن آف۔۔۔“
ایک گھونسا اس کے جڑے پر آکر لگا۔ ”نام نہیں پوچھا۔ ڈاکٹر اڈن بن آف غلم عالی غلم۔۔۔ نام نہیں پوچھا۔“

جڑے پر پڑے گھونے کی تکلیف سہتے، بند ہوتی آنکھوں کو بشکل اٹھاتے اور سوکھے حلق کی تکلیف کو سہتے اس نے اس سب پر غور کرنا چاہا کہ اگر وہ اتنا کچھ جانتا ہے تو اس سے پوچھ کیا رہا ہے۔ اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔
جب اسے ہوش آیا تو اس کے منہ کے ساتھ پانی لگا تھا۔ جیسے ہی اس نے زبان سے پانی اندر کیا، پانی ہٹا لیا گیا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے چھوڑ دو۔“ وہ بڑبڑایا۔
اس کے سامنے چند تصویریں ایک ایک کر کے لائی گئیں۔ چند قطرے ہی اس کے حلق میں گئے تھے۔ سراسیمہ بھی گھوم ہی رہا تھا، تصویریں دیکھ کر بھی اس نے نہیں دیکھیں۔ ایک اور گھونسا جڑے پر آیا۔
”دیکھو انہیں، کون ہیں یہ؟“

اس نے آنکھیں پوری کھول کر غور سے دیکھنا چاہا۔ ایک کو دیکھا۔ دوسرے کو دیکھا۔ تیسرے کو دیکھا۔ وہ انہیں پہچان نہیں سکا۔
”میں نہیں جانتا انہیں۔“ اس نے نہ میں گردن ہلائی۔
”غور سے دیکھو انہیں۔“

اس نے پھر غور سے دیکھا۔ وہ ایک اور گھونسا کھانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک کی شکل کو اس نے ذرا سا پہچانا لیکن یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا۔
”میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔“ اس نے صاف صاف بتا دیا۔
”گڈ۔۔۔ باقی بھی بس اگل دو۔“

”میں نے اسے کہیں دیکھا ہے اور بس۔۔۔ میں نہیں جانتا یہ کون ہے؟“
”یہ تمہارا ساتھی ہے۔“
”میرا ساتھی؟“ آوازیں اسے دور سے آتی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بہت قوت لگا کر بول رہا تھا۔

”یہ ہمیں مطلوب ہیں اور یہ تمہارے ساتھی ہیں۔ کہاں ہیں یہ؟“ اس نے تصویروں کی طرف

اشارہ کیا۔

”میں انہیں نہیں جانتا۔۔۔ یہ میرے ساتھی نہیں ہیں۔“ وہ مسام مسام بھگ گیا۔
”یہ تمہارے ساتھی ہیں۔“ وہ اس کے کان کے پاس منہ لاکر چلایا۔ جیسے وہیں سے گردن میں دانت گاڑ دے گا۔

”میں انہیں نہیں جانتا۔“ اس نے بھی زور لگا کر چلانا چاہا۔
”یہ تینوں تمہارے پاس علاج کے لیے آئے تھے۔“ اس نے بند مٹھی کا ایک اور گھونسا تیار کیا۔
بکلی سی کوندی اور عدن کو یاد آیا کہ اس نے انہیں کہاں دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک اس کا مریض تھا۔ ہاتھ کا زخم لے کر ایک بار آیا تھا۔ زخم کی نوعیت ایسی تھی کہ اس نے عدن کو اچھی خاصی رقم دی تھی اور خاموش رہنے کے لیے کہا تھا۔ عدن نے رقم رکھ لی اور علاج کر دیا۔ چند ہفتوں بعد اسی شخص کا حوالہ دے کر دو اور لوگ کمر اور پیٹ کے لیے ہی گھر لے زخموں کے لیے اس کے پاس آئے تھے۔ یہ تیز دھار چاقو کے زخم تھے۔ رقم اس بار بھی زیادہ ملی اور عدن بھول بھی گیا کہ ایسا کوئی اس کے پاس آیا بھی تھا لیکن وہ یہ بھول گیا کہ وہ امریکا میں ہے اور وہاں کی بات کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ وہ تینوں سفید فام تھے۔ غیر مسلم تھے۔ لیکن ان کا تعلق مشرق وسطیٰ کی خفیہ تنظیموں سے تھا۔

”ہاں۔۔۔ یہ میرے پاس علاج کے لیے آئے تھے۔“ عدن نے سب سچ بتا دیا۔ یہ بھی کہ ان سے بہت سے پیسے ملے تھے لیکن اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔
”اس پتلے سے پاؤں کا رڈ ٹائپ آدمی کے چہرے پر مسخرا بھرا۔“

”کہاں ہیں وہ اب۔۔۔؟“
”میں نہیں جانتا۔۔۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ میں قسم کھاتا ہوں یہ خود میرے پاس آئے تھے۔“

”کون ہیں وہ۔۔۔ تمہیں کہاں ملے۔۔۔ تمہارا رابطہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ سوال پر سوال پوچھنے لگا۔ اس کے اعصاب پر حاوی ہو چکا تھا۔

”میں قسم کھاتا ہوں، میں نہیں جانتا۔“ عدن کی آواز رندھ گئی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اسے آس پاس شرارے نظر آنے لگے۔ نیم اندھیرے میں رقصِ بکلی۔۔۔ زخم خوردہ نیند میں جان لیوا خواب۔
”تم ان کے ساتھی ہو۔۔۔ تم ایک دہشت گرد ہو۔“

وہ اسی بات سے ڈر رہا تھا۔ امریکی جیل میں ایک امریکی کے سامنے مردوں کی طرح بیٹھا وہ یہی دعا کر رہا تھا کہ وہ اس پر ”دہشت گرد“ کا ٹیٹل نہ لگا دیں۔

اخباروں میں پڑھی گئیں، ٹی وی پر دیکھی گئیں خبریں اس کے آگے پیچھے گھومنے لگیں۔ اس پر بیان سے باہر دہشت طاری ہو گئی۔ وہ صرف کنجش نہیں کر رہا تھا، اسے دہشت گرد ثابت کر رہا تھا۔ اس سے منوا رہا تھا۔

اس نے ایک غلطی کی تھی ان سے زیادہ رقم لینے کی اور اسی لالچ کی وجہ سے وہ ان کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ جیسے وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی وہ امریکی سیل میں بھی ہو گا۔ ایسے ہی اب وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ

وہ باہر آئے گا بھی کہ نہیں۔۔۔

اب اسے ماریہ یاد آ رہی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ اسے اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے اور وہ ضرور کرے گی۔

جب غلام علی غلام کو اس کے اندر ہونے کی خبر ملے گی تو وہ بھاگے چلے آئیں گے۔ اپنے سارے اثر و رسوخ استعمال کر لیں گے اور اس کے سر وہ کیسے برداشت کریں گے کہ ان کا داماد، ان کی اکلوتی بیٹی کا شوہر جیل میں رہے۔

وہ جلد ہی باہر آجائے گا۔۔۔ جلد ہی۔۔۔ اتنی دولت۔۔۔ اتنے تعلقات کب کام آئیں گے۔ وہ ایک بڑھا لکھا پراسن شہری ہے، ڈاکٹر ہے، مسیحا، ہشت گرد نہیں ہو سکتا۔ اس کے حق میں بہت سے ثبوت ملتے ہیں۔



جیل آنے کے آٹھ ماہ بعد اس نے بیرونی دنیا کے جس پہلے شخص کو اپنے پاس پایا وہ اس کا وکیل عبدالعزیز تھا۔ سیاہ فام امریکی مسلم تھا۔ اس کے سامنے وہ دیر تک کم صم بیٹھا رہا عبدالعزیز اسے بتا رہا تھا کہ کن مشکلات سے اس سے یہ ملاقات ہو پائی ہے۔

”پاپا نہیں آئے؟“ اس کا پہلا سوال یہی تھا۔ وہ لاغر، کمزور ہو چکا تھا۔ یہ جسمانی بات تھی۔ وہ اندر سے کیا کچھ ہو چکا تھا یہ دوسری بات تھی۔

”وہ نہیں آ سکتے۔۔۔ تم سے صرف میں ہی مل سکتا ہوں۔“

”کہاں ہیں وہ؟ انہیں آنا چاہیے تھا۔“ ہر چیز کو ممکن کرنے والے پاپا کے لیے یہاں آنا کیا مشکل تھا۔

”وہ امریکا میں نہیں ہیں۔“

”پھر کہاں ہیں؟“ اسے اپنے جیل آنے سے زیادہ صدمہ اس بات کو جان کر ہوا کہ وہ اپنے لاڈلے بیٹے کے پاس امریکا میں نہیں ہیں۔

”میرے پاس وقت کم ہے۔ تم مجھے ہر بات بتاؤ۔ میں نے جتنی بھی معلومات اکٹھی کی ہیں، وہ ناکافی ہیں۔“

”میرے پاپا کہاں ہیں؟“ بھاڑ میں جائے اس کا کیس۔۔۔ اسے اپنے باپ کی فکر تھی کہیں۔۔۔

وہ۔۔۔ وہ۔۔۔

”وہ پاکستان میں ہیں۔۔۔ مجھے انہوں نے ہی پاکستان سے ہائر کیا ہے۔“ اس نے تحمل سے جواب دیا۔ ”اب تمہارے کیس پر بات کریں۔“

”پاکستان میں۔۔۔“ اسے ایک اور صدمہ ملا۔ وہ یہاں جیل میں اور اس کا باپ پاکستان میں ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو پہلی فلائٹ لے کر یہاں بھاگے چلے آئے ہوں گے۔

”وہ ٹھیک ہیں؟ ٹھیک ہیں وہ؟“ وہ صدمے سے مرنے کے قریب تھا۔ ”وہ زندہ ہیں نا؟“ وہ سمجھا اس کے صدمے نے ان کی جان لے لی ہوگی۔

”وہ بالکل ٹھیک ہیں، میری ان سے یہاں آتے ہوئے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ تم گھبرانا نہیں۔“

”اس بات پر وہ الجھ گیا۔“ وہ خود کیوں نہیں یہاں آئے۔“
 ”وقت ختم ہو رہا ہے۔ اپنے کیس سے متعلق بات کرو۔“ وہ جھنجلا گیا۔

ناچار عدل نے اسے ایک ایک بات شروع سے آخر تک بتادی۔
 ”ان کے پاس ویڈیو بھی ہے ان تینوں کی، تمہارے اسپتال میں آتے وقت کی۔۔۔ وہ رات گئے آئے، تقریباً منہ چھپا کر۔“

عزیز نے اس سے کافی باتیں کیں۔ جاتے ہوئے اس نے تسلی کے نام پر دو لفظ نہیں کہے۔ شاید وہ جھوٹی تسلی دینے والوں میں سے نہیں تھا۔

شروع کے دنوں میں وہ چیخا چلا تارہا تھا۔ سوال پر سوال کرتا تھا۔ پھر مار کھاتا تھا۔ کئی کئی دن بھوکا رکھا جاتا تھا۔ پھر اسے چپ لگ گئی۔ اب وہ بنا آواز اور آنسو کے روتا۔ نیند آ جاتی تو شکر کرتا، ورنہ جاگتا رہتا۔ ٹی وی پر دیکھی ڈاکومنٹریاں اسے یاد آنے لگتیں۔ اب وہ کبھی یہاں سے نہیں نکل سکے گا۔ پہلے ہی جفتے اسے یقین ہو گیا۔

اس نے باہر آنے کی امید چھوڑ دی، وہ صرف موت کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اپنی قید کے دن گنتے لگا۔ اب عزیز ہی اس کے پاس رابلے کا واحد ذریعہ تھا۔

اس کا اسپتال سیل ہو چکا تھا۔ اکاؤنٹ فریز کر دیے گئے تھے۔ غلام علی غلام کو ان کے پاکستانی وکیل نے مشورہ دیا تھا کہ ان کا امریکا جانا ٹھیک نہیں۔ ”سی آئی اے“ کی تحویل میں وہ بھی آ سکتے ہیں۔ ایسا سو فیصد ہو سکتا ہے۔ انہیں پاکستان ہی رکنا پڑا۔ وہیں سے ساری کوششیں کرنی پڑیں۔ اسپتال کے فروخت ہوتے ہی ماریہ اور اس کے خاندان پر بھی کڑی نگرانی رکھی گئی تھی۔ کئی مہینے ان سے تعیش ہوتی رہی تھی۔ آغا عباس حیدر کو اسٹور کی ساری چین ہاتھ سے نکلتی دکھائی دی۔ ان کی اپنی امریکی قومیت خطرے میں پڑ گئی۔

اس موقع پر وہ رپورٹ کچھ کام آئی جو ماریہ نے عدل کے تھمپر پر کردائی تھی اور پولیس عدل کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ ماریہ کی مام ڈیڈ اور اس کے اکلوتے بھائی نے اپنے وکیل کے مشورے پر صاف صاف یہ بیان دیا کہ وہ اس کی عادات اور حرکتوں سے پہلے ہی بے تنگ تھے۔ وہ خود اس کی طرف سے مفلوک تھے۔ اس کے رویے سے نالاں تھے۔ وہ اسے نہیں جانتے۔ وہ پاکستانی تھا۔ وہ امریکا میں رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا تعلق کن کن لوگوں سے تھا۔

آغا عباس حیدر زیادہ گھاگ تھے۔ انہوں نے جھوٹی جھوٹی اور کئی باتیں سوچ کر گھڑ کر سنائیں۔ انہیں بس اپنی جان چھڑوانی تھی۔

ساتھ ہی ماریہ نے عدالت میں طلاق کے لیے درخواست دائر کر دی۔ ازبک مام نے اسے لالچی اور پیسے کا رسیا ثابت کرنا چاہا۔ وہ ایک لمبے عرصے سے امریکا میں رہ رہے تھے انہیں معلوم تھا کہ امریکا میں کسی مسئلے سے کیسے نکلتا ہے۔

عدن کے خلاف ڈھیروں بیانات اکٹھے ہو گئے۔

”اس کا ساتھ دینے کے بجائے تمہاری بیٹی اس سے طلاق لے رہی ہے۔“ بیوی کو گرل فرینڈ بنا کر رکھنے کا مشورہ دینے والے پاپا یہ شکوہ کر رہے تھے۔
”یہ فیصلہ وہ پہلا تھپڑ کھانے پر ہی کر چکی تھی۔“ امریکیوں سے پہلے انہوں نے مان لیا تھا کہ وہ دہشت گرد ہے۔

”اس کی مدد کرنے کے بجائے تم یہ سب کرو گے۔ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی اور نہیں تو دوست کا بیٹا ہی سمجھ لو اسے۔“

”اس کی مدد کے لیے تم کیوں نہیں یہاں آ جاتے۔۔۔ باپ ہو تم اس کے۔“
”قانونی باپ تو تم بھی ہو اس کے۔“

”میں صرف ماریہ کا باپ ہوں اور اسے وہ مارتا رہا ہے۔ کتنے لالچی ہو تم لوگ، اس کے اکاؤنٹ سے پیسے تمہارے ہی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوتے رہے ہیں۔ تمہارے بیٹے نے تو یہاں ڈالر کی فیکٹری لگا رکھی تھی، دہشت گرد ہے وہ۔“
”نہیں ہے وہ دہشت گرد۔“ وہ غصے سے کھول اٹھے۔

آغا جی نے جتنی جتنی قہقہہ لگایا۔ ”مان لو یہ بات، امریکی غلط نہیں ہوتے، اگر غلط ہوں تو بھی اسے غلط نہیں رہنے دیتے۔“

”تم نے پھنسوا دیا ہے اسے۔“ فون کے بارود دھاڑے۔
”مجھے اس چوہے کو پھنسانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسی ٹڈی کو میں پیروں تلے بھی نہیں چکلتا، چوہے کے لیے شیر کا بچرہ۔۔۔ ہونہ۔۔۔!“

”اسی ٹڈی کے ساتھ تم نے اپنی کال گرل بیٹی کو بیاہ دیا۔ جس پر ہر امریکی تھوک گیا تھا۔“ ان کا بس نہیں چل رہا تھا، آغا کی گردن دیوچ لیں۔
”اس تھوکی ہوئی کو تمہارے بیٹے نے کیوں چاٹا آخر۔“ آغا نے بہت آرام سے پوچھا اور فون بند کر دیا۔

اس کے بعد عدن سے متعلق آنے والی کوئی فون کال ریسیونہ کی گئی۔ ماریہ کو امریکا سے باہر بھیج دیا۔ کچھ ہی عرصے بعد خود بھی فرانس چلے گئے۔ اپنے بزنس کو وہ کہیں سے بھی ہینڈل کر سکتے تھے۔
ماریہ نامی باب، آغا نامی دولت کو بہت شان و شوکت سے عدن کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔ بہت دھوم دھڑکا تھا ان کے نام اور دولت کا، عدن اور اس کے باپ کے لیے ایک سال آٹھ ماہ پیشتر ان ناموں کا بہت ڈنکا بجا تھا۔

رنگ ماسٹر غلام علی غلام نے بہت لمبی پلاننگ کی تھی۔ دونوں دوست تھے۔ ساتھ ساتھ بڑھتے تھے۔ آغا امریکا چلے گئے۔ غلام علی نے اپنے باپ کا کاروبار سنبھال لیا۔ عشرے میں آغا کہاں کے کہاں جا پہنچے اور غلام علی صرف تین فیکٹریاں ہی بنا سکے۔ جس طرح وہ اپنے بیٹے کو بڑے بڑے ٹارگٹ دیتے تھے۔ اسی طرح اپنے لیے بھی بڑے ٹارگٹ ہی رکھتے تھے اور ان کا ٹارگٹ آغا کو کٹ کرنا تھا۔ لیکن ایسا

ہو کر نہیں دے رہا تھا۔ وہ گامے لگا ہے امریکا چکر لگاتے رہتے۔ آغا پر قریب سے نظر رکھتے۔ ماریہ بھی ان کی نظر میں تھی اور اس قریب کی نظر میں ہی وہ جان گئے کہ ماریہ جیسی لڑکی ان کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ بہت ہی مشکل ہے، وہ کرے گی تو اپنی مرضی سے، ورنہ کوئی اسے عدن کے لیے منائیں سکے گا اور آغا کیوں عدن کی طرف جھکے گا۔ ساتھ ساتھ غلام علی نے دو، تین اور خاندانوں پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن آغا عدن کی طرف جھک ہی گیا۔ ماریہ انہیں مل ہی گئی، لیکن۔۔۔ پھر بھی کیا ہوا۔

آغا خود کو بچا کر ایک طرف ہو گئے۔ بیٹا تو ان کا ہی گیا تھا۔ غلام علی کو یقین تھا کہ اس سب کے پیچھے آغا کا ہاتھ ہے۔ آغا نے کسی حسد یا جلن میں عدن کو پھنسا یا ہے۔ کوئی بدلہ لیا ہے غلام علی سے۔۔۔ اور غلام علی دھوکا کھا گئے۔ آغا پر سارا الزام دھرتے وہ اس آگ کو بھول گئے جو چلتی فیکٹری میں لگا کر بھڑکائی گئی تھی۔ فیکٹری دیوالیہ ہو رہی تھی۔ انہیں بیمہ کی رقم چاہیے تھی۔ فیکٹری کو حادثے کی ضرورت تھی۔ اس حادثے کا منصوبہ انہوں نے بنالیا۔ غلام علی، عدن، عدن کے بھائی، ان کے چند دوستوں نے مل کر کمال کا منصوبہ تشکیل دیا۔ چلتی فیکٹری، دن کے وقت پچاس درگرز کی موجودگی میں آگ بھڑکی اور فیکٹری کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ اس آگ نے کیا کچھ نہیں تباہ کیا تھا۔ صرف غلام علی غلام کو ہی تباہ نہیں کیا تھا، دس، نو عمر لڑکے جھلس کر مر گئے۔

باقی جو زندہ رہے، وہ جگہ جگہ سے جھلس گئے، تین چند ہفتوں کے وقفے سے مر گئے۔ کہتے ہیں آگ کا جلا نہیں بجتا، جو مر گئے تھے ان کے گھر والے پیچھے سے مر گئے۔ کسی کا جوان بھائی گیا، کسی کا شوہر، کوئی تین بچے یتیم کر گیا، کوئی سات۔

مرنے والے مر گئے۔ فیکٹری بند ہو گئی۔ باقی ماندہ بے روزگار ہو گئے۔ امداد کے نام پر ان کو ایک روپیہ نہ دیا گیا۔ نہ علاج کروایا گیا، نہ کھانے کو دیا گیا، فیکٹری میں کام کرنے والے پچاس درگرز اپنی موت اور آگ سے انجان وہاں پر روز کی طرح کام کرنے آئے تھے۔ ان میں سے کئی بعد ازاں دے بکے مریض بن گئے۔ ان کے ساتھ یہ سب اچانک ہوا اور بھیا نک ہوا۔ اتنے جوان بیٹیوں، شوہروں، باپوں کو نگل لینے والا غلام علی غلام اپنے صرف ایک بیٹے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

آغا کے لیے ان کے اندر ایسی آگ بھڑکی تھی کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ ان کے سینے پر چڑھ کر اس کا کلیجہ کچا کھائیں۔ لیکن وہ بے بس تھے۔

غلام علی غلام کو اب اپنی طاقت اور حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ زندہ لوگوں کو جلانے والے، کاغذ کے نوٹ اکٹھے کرنے والے، فرعون بنتے ہیں، بھول جاتے ہیں، پھنڈر کا جواب گھونے سے ملے گا اور ضرور ملے گا۔

غلام علی غلام کا بس نہیں چل رہا تھا ایک ایک امریکی کو خرید لیں لیکن نہ ان کے پاس اتنے پیسے تھے۔ نہ ہی سارے امریکی بک رہے تھے۔ امریکا وہ جانتیں سکتے تھے۔ ان کے وکیل نے سختی سے منع کیا تھا۔ عدن کے اکاؤنٹ سے پیسے انہیں ہی ٹرانسفر کیے جاتے رہے تھے۔ انہیں بھی دہشت گرد سمجھ لیا جائے گا۔ پاکستان سے ہی انہوں نے ایک قابل وکیل کو ہار کیا۔ تمام تر کوششوں کے باوجود عدن کے

بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ کس ریاست، کس شہر، کس جیل میں، کوئی بھی انہیں کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

آٹھ ماہ غلام علی غلام نے جلتے کوئلوں پر گزارے، پیسہ پانی کی طرح جارہا تھا۔ وہی پیسہ جو پانی کی طرح کمایا گیا تھا۔ وہ ہر وقت عزیز سے رابطے میں رہتے تھے عدن سے ملاقات کی روداد سن کر غلام علی غلام رونے کے قریب ہو گئے۔ انہیں ایسا وقت بھی دیکھنا تھا۔ ان کا دیوتا غلام بنالیا گیا تھا۔ ان کے بار بار پوچھنے پر بھی عزیز نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ دیکھنے میں کیسا ہو گیا تھا۔ وہ کیسے ہی ڈسکس کرتا رہا۔ عزیز نے انہیں ایک فیصد بھی آس نہیں دلائی تھی کہ اس کا کیس مضبوط ہے اور وہ جلد ہی باہر آجائے گا۔

”سب کچھ اس کے خلاف ہے۔ اس کے پاس اپنے حق میں ثابت کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”وہ بے قصور ہے۔“ غلام علی کے پاس صرف یہی ایک دلیل تھی۔

”اس نے ان سے پیسے لیے تھے۔“

”وہ پیسے علاج کے لیے تھے۔“

”وہ پیسے ان کی شناخت کو چھپانے کے لیے تھے۔ عدن نے رات گئے اپنے آفس میں تنہا انہیں

ڈیل کیا۔ ان کا علاج کیا اور۔۔۔“

”وہ پھر بھی بے قصور ہے۔ دہشت گرد نہیں ہے۔ ان کا ساتھی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے وہ۔۔۔ تم

اسے جلد سے جلد باہر نکلاؤ، جتنا چاہے پیسہ لگے، میں دوں گا۔“

”پیسہ نہیں۔۔۔ ثبوت چاہیے، یہاں پیسے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”پیسے سے سب ہو جاتا ہے۔“ غلام علی کے پاس ایک ہی حل تھا۔۔۔ پیسہ۔

عزیز چپ ہی رہا۔ سوچنے لگا، کیسا انسان ہے۔ بات سمجھ ہی نہیں رہا۔ پیسہ پیسہ کر رہا ہے جیسے قانون میری جیب میں ہے۔ عدالت میرے حکم سے چلتی ہو اور میں وکیل نہ ہوں کوئی دکان دار ہوں کہ سب خرید کر دے دیا۔ دوائے ہی مشرقی لوگوں سے اس کا واسطہ پہلے بھی پڑ چکا تھا لیکن اس بار اسے حیرت تھی۔ کیونکہ غلام علی مسلمان تھا۔ وہ خود بھی مسلمان تھا۔ اس شخص کے ساتھ وہ پچھلے آٹھ ماہ سے رابطے میں تھا اور اس کی کسی ایک بھی بات نے عزیز کو متاثر نہیں کیا تھا۔ بہر حال یہ اس کا پیشہ تھا اور اسے دل جمعی سے کام کرنا تھا۔ وقفے وقفے سے اس کی کئی ملاقاتیں عدن سے ہوئیں۔ اب وہ کچھ سنبھل رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ جلد ہی باہر آجائے گا۔

”تم دوبارہ ان سے کبھی ملے؟“

”نہیں، کبھی نہیں، پھر کبھی نہیں۔“

”ان کے نام بھی نہیں جانتے؟“

”نہیں۔۔۔ انہوں نے کہا، کچھ مت پوچھو صرف علاج کر دو۔“

”برائے مہربانی مجھے ایک بار پھر سے یاد کر کے بتاؤ۔ وہ تم سے کہیں اور ملے یا دوبارہ تمہارے

پاس آئے یا تمہیں فون کیا؟“

”میں کتنی بار بتا چکا ہوں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔“

”تمہیں اپنے اعصاب قابو میں رکھنے چاہئیں۔“ عزیز نے تحمل سے کہا۔
 ”کچھ بھی میرے قابو میں نہیں ہے۔“ وہ چڑ گیا۔

”اکثر باتیں بے معنی نظر آتی ہیں۔ لیکن وہ بے حد اہم ہوتی ہیں۔ اگر وہ تیسری، چوتھی بار تمہارے قریب سے بھی گزرے ہوں گے تو میرے لیے تمہارے کس کا دفاع مشکل ترین ہو جائے گا۔“
 عدن نے اپنی سوچوں کو اکٹھا کرنا چاہا۔ بہت باریک بینی سے، پھر سے اپنی یادداشت کا جائزہ لیا۔
 ”نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں انہیں جانتا ہی نہیں۔ وہ میرے پاس خود آئے تھے۔“
 ”یہ نہیں مانیں گے، تم نے ان کی شناخت رجسٹرڈ نہ کر کے بہت بڑی غلطی کی۔“
 ”یہ کیسے نہیں مانیں گے۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں، پولیس والا نہیں کہ علاج سے پہلے تفتیش کروں۔
 مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں نے ان ناموں کے اندراج نہیں کیے۔ ان کے زخموں کی نوعیت کو چھپایا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان کا ساتھی ہوں یا دہشت گرد ہوں۔ مجھے میرے حصے کی سزا ملنی چاہیے مگر اتنی بڑی سزا نہیں۔“

”یہ دلائل توجج کے سامنے ہی دیے جائیں گے۔“

اس جواب پر عدن غصے سے عزیز کو دیکھ کر رہ گیا۔
 اپنی پشت پر ایک ہاتھ ایسا ضرور رکھو جو وقت پڑنے پر تھکی بھی دے اور ہاتھ بڑھا کر گڑھے سے بھی نکال لے۔ اپنی پشت پر یہ ہاتھ تمہیں خود بنانا ہوگا۔ یہ من و سلوئی نہیں کہ بیٹھے بٹھائے مل جائے۔“
 عزیز کی بات درست تھی مگر پشت پر تھکی دینے والا وہ ہاتھ اسی پشت کو کنویں میں اور نیچے دھکا دے کر جا چکا تھا۔

اس کا اپنا سا باپ امریکا کے ڈر سے امریکا نہیں آ رہا تھا۔
 ”امکانات تو بہت سے ہیں یہ بھی کہ مقدمہ عدالت تک جائے گا ہی نہیں اور یہیں کہیں تمہارا فیصلہ ہو جائے گا۔“

ایک ادیر تیرنگہ اس نے عزیز پر ڈالی، کچا کھا جانے والی۔
 ”ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ میں ایک عام انسان ہوں۔ پڑھا لکھا، ایسے کیسے؟ وہ چلا یا۔
 عزیز نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

”تم ماریہ کے ڈیڑے سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو، بہت سے سرمایہ داران کے دوست ہیں۔ بڑے بڑے لوگ ان کے گھر آتے جاتے ہیں۔ کچھ قانون دان بھی ان کے جاننے والے ہیں۔ میڈیا سے روابط ہیں ان کے۔“

”جو بیانات انہوں نے تمہارے خلاف دیے ہیں، مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہاری کوئی بھی مدد کریں گے مگر پھر بھی ٹرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔“

”ماریہ سے بات ہوئی تمہاری؟“

”اس کے وکیل سے ہوئی تھی۔“

عدن نے تین، چار غلیظ گالیاں ماریہ کے نام کی، وہ امریکی قانون دانوں کو گالیاں دینے لگا۔

جنہوں نے اس جیسے شریف، بڑھے لکھے انسان کو قید کر لیا تھا۔
 پھر گیارہ ماہ گزر گئے۔ کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ اب وہ اس کی منت ساجت پر آ گیا۔
 ”میں کوشش ہی تو کر رہا ہوں عدن!“
 ”مجھے یہاں سے نکالو، پلیز، کچھ کرو۔“ اس نے رونے میں شرم محسوس نہیں کی اور عزیز کے سامنے
 رونے لگا۔

”اگر تم پر کچھ ثابت نہ ہوا تو تم ضرور باہر آؤ گے۔“
 ”اگر ثابت ہو گیا۔ انہوں نے ثابت کر دیا۔۔۔ پھر۔۔۔؟“
 ”ٹیک اسٹ ایزی پلیز۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔
 ”مجھے کون بے گناہ ثابت کرے گا۔“
 ”میں کوشش کروں گا، کر رہا ہوں۔“
 ”کوئی میری ضمانت بھی نہیں کروا سکتا؟“

عزیز کو اس کے بھولپن پر تسخرا نہ ہئی سی آئی۔ ”ابھی تو او بابا بھی تمہیں ضمانت پر رہا نہیں
 کروا سکتا۔“

”پھر کون کروا سکتا ہے؟“ اس وقت وہ پاگل بن کی حد کے قریب تر تھا۔
 عزیز نے کندھے اچکائے۔ پھر جیسے کچھ یاد آیا۔
 ”خدا۔“

”خدا۔“ عدن بڑبڑایا۔ جیل میں رہتے بھی اس نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ دکھ میں ہی سہی۔
 جسے مانگنا آتا ہے۔ اسے مل ہی جاتا ہے۔ عدن کو مانگنا آتا نہیں تھا۔ جسے آتا تھا اس کا دعو تھا اسے
 سب مل جاتا تھا۔

”تم ایک کام کرنا عزیز۔۔۔! بابا کو فون کرنا، غور سے سنو، کہنا، اتار کلی، نیلا گنبد، گلی نمبر چار میں
 جائیں۔ سبز رنگ کے دروازے والے گھر میں آواز دے کر کہیں مجھے آزاد کروادے۔ صرف ایک اور
 احسان کر دے۔ گھر چھوٹا ہے، گلی تنگ ہے لیکن پاپا سے کہنا، ضرور جائیں۔ وہ مانگتی ہے اور اسے ملتا ہے۔
 میری آزادی بھی مل جائے گی۔“

عزیز اس کی طرف دیکھے گیا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ ”میں کہہ دوں گا۔“
 ”تم یاد سے کہہ دینا۔“ اس نے آنکھیں پونچھیں۔



اتار کلی نیلے گنبد سے اندر رہائشی آبادی میں پہلی سڑک سے نکلتی گلیوں میں دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی
 میں، جو بند بھی ہے اور تنگ بھی اور جس میں صرف دو ہی گھر ہیں، جس میں سے ایک گھر میں وہ رہتی ہے،
 اتق۔۔۔ کشمیری حسن والی، خشک میوے کے ڈھیر پر، سرخ کشمیری سیب سی، وہ اس وقت فرمانا رہی
 ہے۔ منج گجرم اٹھ کر گھر کے کام سے فارغ ہو کر وہ لکڑی کے چوڑے تختے نما چوکی کے سامنے چوڑی
 جما کر بیٹھ جاتی ہے۔ دوپہر تک چوڑی ایسے ہی جی رہی۔ پانی کا جگ بھر کر وہ اپنے پاس ہی رکھ لیتی

تاکہ وہ پہلے اعلان نہ پڑے۔ گھنٹوں سے پیوست چوڑی لمبے بھر کے لیے کھلتی تو درد کی لہریں نکلتیں، پھر دوبارہ بیٹھنے میں درد ہوتا۔ وہ ٹھیک دو بجے اٹھ جاتی۔ روٹی پکاتی، سالن پکاتی۔ اب سب آتے جائیں گے۔ کھانا کھاتے جائیں گے۔ پہلے اسد اور جمال آئیں گے۔ کھائیں گے اور پڑھنے بیٹھ جائیں گے۔ ان سب کے پاس ایک ہی چیز کی کمی تھی وقت کی، ورنہ فارغ وقت میں وہ بہار بھی کھودنے بیٹھ جاتے۔ سارے وقت میں وہ بس کام ہی کرتے رہتے۔ روٹی پکانے اور کھانے میں صرف ہونے والا یہ آدھ گھنٹہ بھی اتنی پر بھاری گزرتا۔ جی چاہتا کہ فرما بس جلدی جلدی بن جائے۔ اسے ڈر رہتا تھا کہ اگر اس نے وقت پر فرما لینا کر نہ دیا تو اسے مزید کام نہیں ملے گا اور اگر کام نہیں ملے گا تو پیسے کہاں سے آئیں گے۔ یہ ڈر اسے ہر روز لاحق ہو جاتا۔ چھوٹی سی گھٹی تو چھوٹے چھوٹے ڈر کھتی تھی۔ ہر وقت ڈری ہی رہتی۔

تین بجے اماں آئیں، بنا کھانا کھائے ہی لیٹ گئیں۔ فرما بناتے وہ اٹھی۔ ”کیا ہوا، تھک گئیں؟“ وہ مسکرائیں۔ ”میں کھانا کھالوں گی، تم اپنا کام کرو۔“

”اچھا جی۔“

”کھانا کھایا تم نے؟“

”جی۔“ کام کرتے ہوئے کہا گیا۔

”کچھ دیر آرام کر لو۔“

”نہیں جی۔“ وہ تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔

دونوں اسی طرح فرائض پورے کر دیتیں۔

اتنی تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ ہزار کا فرما تھا۔ ایک ایک کاغذ کو نمبر دیکھ کر فولڈ کرنا ہوتا ہے۔ اس کی تہہ بٹھانی ہوتی ہے۔ شام چھ، سات بجے دکان سے لڑکا آتا ہے تیار شدہ فرمالے جاتا اور مزید تیار کرنے کے لیے دے جاتا۔ ابھی ابھی فرمے کی جگہ خاکی لفافے بنانے کے لیے دے جاتا۔ ہفتہ وار اجرت مل جاتی۔

”اتنی! چائے لے لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

اس نے جھک کر کاغذ کی تعداد دیکھی اور تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔ چھ سے ساڑھے چھ ہو گئے۔

فرما بن گیا۔ اس نے ٹھنڈی چائے پی لی، لڑکا آیا، فرما اٹھا کر لے گیا۔ نئے بنانے کے لیے رکھ گیا۔ اب یہ والے فرمے وہ رات کو شروع کرے گی۔

تھوڑی دیر لیٹ کر وہ کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ اماں کھانا بنانے لگیں۔ چند گھنٹے پڑھنے کے بعد اسے پھر سے کام سے لگ جانا تھا۔ اس گھر میں رہنے والے چاروں افراد کو زندگی گزارنے کے لیے بہت سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ اتنی گھر میں کرتی تھی۔ اماں اسکول کی کینٹین میں، دونوں بھائی پریس میں، بہت سالوں سے ان کی زندگی ہر روز ایسے ہی شروع ہو گئی تھی۔

اماں آٹھ پاس بھی نہیں تھیں۔ اسکول کی پریسل اچھی تھیں۔ انہیں کینٹین کے لیے رکھ لیا تھا۔ دو بجے تک وہ چھوٹی سی دکان نما کینٹین میں کاپی، پنسل، جوس، برگر بیچتی تھیں۔

شروع میں پندرہ سو ماہوار پر رکھا گیا۔ سال گزرنے پر ان کی تنخواہ میں چند سو بڑھ جاتے۔ اب نہیں ڈھالی ہزار ملتے تھے۔

جمال اور اسد سرکاری اسکول کے فنڈ سے پڑھتے تھے۔ بیماری کی صورت میں وہ فنڈ سے پیسے لے سکتے تھے جو انہوں نے کبھی نہیں لیے تھے۔ انہیں صرف کتابیں ہی چاہیے تھیں۔ جمال کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی اپنا نام فنڈ کی فہرست سے خارج کرادے گا۔ وہ اپنی فیس خود دینا چاہتا تھا۔ وہ دونوں آدھے کھنے کی مسافت طے کر کے پیدل اسکول آتے جاتے تھے۔ انہوں نے اس بات پہ کبھی آنسو نہیں بہائے کہ شام کو کھینے کے بجائے انہیں پر لیں کیوں جانا پڑتا ہے۔

انسان کا پیٹ کتنا اچھا ہے۔ کتنا بھلا مانس، شریف، چپ، مان لینے والا، ایسے ہی افتی نے کیا، افتی نے آٹھویں تک اسکول سے پڑھا تھا۔ میٹرک پرائیویٹ کیا۔ آج کل ایف اے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ بڑی معصوم سی، گم صمی لڑکی تھی۔ اتنا کام کرنی، اتنا کہ اماں اسے دیکھ دیکھ کر رونے کے قریب ہو جاتیں۔ انہیں ڈر لگتا کہ تختے پر جھکے جھکے وہ بڑھی ہو جائے گی جھکی کر اس کا کب نکال کر ہی چھوڑے گی۔

”افتی بس کرو۔“ رات گئے ان کی آنکھ کھلی تو حجب معمول کہا۔

”جی اچھا، ابھی کر دیتی ہوں۔“ وہ اکلوتے کمرے کے آگے بنے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اماں کمرے میں سو رہی تھیں۔

اماں کے سامنے وہ کمر سیدھی کر کے آہ بھی نہ کرتی۔ ورنہ اماں دو وقت کی روٹی پر سب کو لے آتیں۔

ایک کمرے، برآمدے اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل گھر تھا۔ آہستہ آہستہ پیسے جمع کر کے اماں نے فرش اور دیواروں کی مرمت کروائی تھی۔ اماں ہر سال سفیدی کرواتی تھیں۔ اکلوتے کمرے میں لٹے کا قالین بچھا تھا۔

کمرے کا بکری واحد سامان تھا۔ اسی پر وہ سب تکیے رکھ کر سو جاتے تھے۔ تکیے اٹھا کر بیٹھ جاتے تھے۔ دیوار پر سامنے ایک گھڑی، ایک طرف کیلنڈر اور دوسری سامنے دیوار پر افتی کے مرحوم والد کی ایک تصویر لگی تھی۔ برآمدے میں دو موڑھے، ایک میز اور ایک لوہے کی الماری رکھی تھی۔ موڑھوں کو اٹھا کر افتی اپنا چوکی نما تخت بچھا کر فرما، خاکا کی لفافے بنائی، چھوٹے سے صحن میں چند گملے رکھے تھے۔ بس یہی سب کچھ تھا انارکلی کے اس گھر میں۔

وہ سب خوش اور مطمئن تھے اپنی زندگی سے، وہ دولت کے بارے میں صرف اتنا ہی سوچتے تھے جتنی ان کی ضرورت تھی۔

افتی کے والد ایک فیکٹری میں ٹرک ڈرائیور تھے۔ دوسرے شہروں میں مال سپلائی کرتے تھے۔ لوڈنگ کے دوران وزنی مال ان پر آگرا۔ چند دن اسپتال میں رہ کر وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ فیکٹری مالکان نے چند لاکھ دیے۔ جس سے اماں نے یہ بوسیدہ گھر خرید لیا۔

آہستہ آہستہ جب ہر رشتے دار کی اصل شکل سامنے آنے لگی تو وہ زندگی کے سامنے ڈٹ گئیں۔

اپنے بچوں کی طرف دیکھتیں اور مضبوط ہوتی چلی جاتیں۔

جوسبق انہوں نے خود کو پڑھایا، وہی اپنے بچوں کو ازبر کروادیا کہ وہ یتیم ہوئے ہیں، لاچار نہیں۔ زندگی کا ڈٹ مقابلہ کریں۔ آنسو پونچھ لیں کہ انہیں صاف کرنے والا ہاتھ گیا اور حالات کو ہر ادیں اور انہوں نے واقعی رونا چھوڑ دیا۔ بنیاد میں سیسہ بھرا جائے تو دیوار کی جگہ پہاڑ کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ماں ان کی بنیاد بھی۔ انہیں تو پہاڑ بنانا تھا۔

آہستہ آہستہ ان کے گھر کی صاف ستھری حالت کو دیکھ کر اکادکا آنے والے رشتے دار سمجھنے لگے کہ وہ خوش حال ہو رہے ہیں۔ اگر وہ رات کو دو، دو بجے تک پرہس میں کام کرنے والے جمال اور اسد کو دیکھ لیتے تو شاید حیران نہ ہوتے۔ پانچویں اور ساتویں جماعت کے بچے بستر پر سونے کے بجائے پرہس میں مشینوں پر کھڑے کام کر رہے ہوتے۔ اگر وہ افق کو کئی کئی گھنٹے فرمایا تے دیکھ لیتے تو اس کے ہاتھ چوم لیتے۔

اماں چھٹی کے دن افق کے گھر کا بھی کام نہ کرنے دیتیں۔ اس دن وہ انہیں پلاؤ یا آلو گوشت کھلاتیں۔ جمال اور اسد کو کھیلنے کے لیے بھیجتیں اور افق کو ساتھ لے کر انارکلی چلی جاتیں۔ اسے آکس کریم کھلا کر لاتیں۔ وقت اور حالات کے ہاتھوں ترتیب دی گئی ان کی زندگی ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔ اس ٹھیک ٹھیک زندگی میں ایک گھنٹی بچی۔

”افق بے پاس آج کوئی کام نہیں تھا کرنے کے لیے۔ نہ فرما، نہ خاکی لفافے، دکان والے نے کہا کہ دس، سندرہ دن کے لیے کام نہیں آئے گا، آرڈر نہیں آرہے۔ وہ اپنی کتابیں کھولے پڑھ رہی تھی۔ اس کی انگریزی زیادہ خراب تھی بار بار گرامر کی مشق کر رہی تھی۔ اس کے پاس جوفون تھا اس پر کم ہی کسی کی کال آتی تھی۔ ابھی کبھار ماموں کی یا فیصل آباد والے چچا کی۔

زیادہ تر اماں ہی اسکول کے آفس سے فون کرتی تھیں۔ فون اس کے پاس ہی رکھا تھا۔ بجا تو اس نے اٹھایا، کان سے لگایا۔

”میری عرشہ سے بات کروادیں؟“
”عرشہ تو نہیں ہے جی۔“ وہ اجنبی مردانہ آواز سن کر گھبرا گئی۔

”نضا ہوگی؟“
”جی وہ بھی نہیں۔“ وہ اور گھبرا گئی، اپنے ماموں اور چچا کے علاوہ اس نے کبھی کسی سے بات نہیں کی تھی۔

”عرشہ بھی نہیں ہے، نضا بھی نہیں ہے تو۔۔۔ شانزہ تو ضرور ہی ہوگی۔“ ذرا ہنس کر کہا گیا۔
افق نے فون بند بھی نہ کیا، راگ نمبر بھی نہ کہا۔

”کیسی لڑکی ہو تم، کچھ ہے ہی نہیں تمہارے پاس، اچھا چلو عازرہ بھی نہیں تو حریم، حریم، زہیم، کوئی ایک تو ہوگی، دیکھو اب نہ مت کہنا، ٹھیک نہیں ہوگا، میں نے بتا دیا ہے پہلے ہی۔“ دبی دبی ہنسی۔
”نہیں، کوئی بھی نہیں ہے۔“ اس نے ذرا سی بے چارگی اور افسوس لیے کہا، جیسے خود سے ہی کوئی

گناہ ہو گیا ہو۔

”کوئی نہیں، ہا ہا۔“ ایک طویل تہتہ لگایا گیا۔ فون کرنے والا جی بھر کر لطف اندوز ہوا۔
 ”یار! کیا نام ہے تمہارا، کب سے ہو اس دنیا میں، تمہارے اس انداز پر جی چاہتا ہے کہ تمہارے
 قدموں میں کچھ جاؤں اور اپنی جان دے دوں۔ تم کہاں آگئیں، ہم سے بد معاشوں میں۔۔۔ جواب دو
 جلدی سے۔“

”مجھے آپ کو اپنا نام نہیں بتانا۔“ اس کے ہنسنے پر اسے غصہ بھی آیا اور عقل بھی کہ کوئی تنگ کر رہا
 ہے۔ اس نے فون بند کر دیا۔ پھر بجا اور بجاتا ہی رہا۔ اس نے نہیں اٹھایا، پھر تیرج آنے لگے، ہر تیرج میں ایک
 نیا نام تھا۔

”اسماء ہو؟ شایان ہو؟ نمرہ ہو؟ جویریہ ہو؟ ہادیہ ہو؟ نادیہ ہو؟ سلویٰ ہو؟ حیا ہو؟“
 اتنے نام، اتنے میسجز اس کا ان باکس بھر گیا۔ پھر فون بجنے لگا۔ اماں آئیں تو اس نے فون بند کر
 کے ایک طرف رکھ دیا۔ اگلے کئی دن ایسے ہی کاٹراور میسجز آتے رہے۔ افق کا سارا دھیان پٹ گیا۔ فون
 اٹھاتی نہیں تھی۔ لیکن فون بجتے ہی فون کی طرف دیکھنے لگتی۔ اب نہیں بھی بجاتا تھا تب بھی دیکھتی تھی کہ بج
 کیوں نہیں رہا۔ میسج آتے تو پڑھتی۔ نہ آتے تو پہلے والے پڑھتی۔

چند دنوں میں ہی ایسا ہوا، لیکن ہو گیا۔ بیرونی دنیا سے زیادہ واسطہ نہیں تھا اس کا۔ جتنا بھی واسطہ
 تھا، اس میں ایسی شرارتی باتیں کرنے والے، خوب صورت آواز والے شامل نہیں تھے۔ اب وہ زریم،
 تحریم، شایان، سوچے جانی، مسکرانے لگتی۔ اس کا جی چاہا کہ اماں کو یہ لطیفہ سنائے، پھر سنا نہیں سکی۔
 ”چھوٹی ہو، بڑی ہو، موٹی ہو، لمبی ہو، پیاری ہو، پری ہو، کون ہو؟“

روزانہ نئے نئے سرے سے ان کا ان باکس بھرنے لگتا۔
 ”گوگلکی ہو، بول نہیں سکتیں، اپنی مترنم آواز میں گانا تو سناؤ، گالیاں ہی سنا دو یا اپنا کوئی سبق ہی۔
 آج کیا کھاؤ گی، کہاں بیٹھی ہو، کیا کر رہی ہو، کچھ بولو، کچھ سنو، کچھ بوجھو، چلو کچھ کرس، چلو آؤ کھلیں۔“
 سچی بات تھی یہ دو، دوحرفی میسجز پڑھتے پڑھتے افق ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی، اماں نے سبزی
 بناتے بناتے اسے دیکھا۔ موبائل اس نے کتاب میں رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک پرانا رسالہ رکھا تھا۔
 ”کیا ہوا افق؟ ایسے کیوں ہنس رہی ہو؟“

”کچھ نہیں جی؟“ ہنسی جھپا کر کہا۔
 افق کا جی چاہا اپنی کسی سہیلی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے کان میں ایک ایک بات بتائے۔
 سہیلی اس کی کوئی تھی نہیں۔ کالج وہ جاتی نہیں تھی۔ چچا زاد، خالہ زاد، ماموں زاد کوئی ان کے گھر آتا نہیں
 تھا۔ وہ اپنی دنیا میں اکیلے تھے تو تجربات میں بھی اکیلے تھے اور افق کی تجرباتی زندگی کا تو ابھی آغاز بھی
 نہیں ہوا تھا۔ کہاں کا مشاہدہ اور کہاں کی عقل۔

افق دل کھول کر ان میسجز پر ہنسی رہی۔ کئی دن ایسے ہی چلتا رہا۔ ایک دن ایک انجانے نمبر سے
 فون آیا۔ اس نے اٹھالیا، لیکن چپ رہی۔

”رکو، رکو۔۔۔ تمہیں قسم ہے اپنی آواز کی، جلدی بناؤ اپنی آواز کی سرجری کہاں سے کروائی ہے؟“
 اسی لڑکے کی آواز سن کر وہ پہلے سے زیادہ بوکھلا گئی۔

”جی۔۔۔“ اتنا ہی کہا۔ اسے کیا پتا کہ آواز کی سرجری بھی ہوتی ہے۔
 اور قہقہہ اٹا بلند ہوا کہ وہ دیر تک ہنستی رہی۔ فون بند نہ کیا، کہا بھی نہ لگیا۔
 ”مجھ سے دوستی کرو گی۔“ جھٹ سے پوچھا۔
 ”جی؟“ اس کے منہ سے پھر بے ساختہ نکلا۔

”جی۔۔۔“ چلو ڈن ہوا۔۔۔ میرا نام اماں ہے۔ ابھی پڑھ رہا ہوں۔ پھر جاب کروں گا۔ پھر شادی، صرف دو بچے کروں گا، لڑکے کا نام بازل رکھوں گا۔ لڑکی کا نام ردا۔“
 افق نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔ اس کی ہتھیلیاں بھیگی گئی تھیں۔
 ”میج آیا،“ فون بند کر دیا۔ کوئی آگیا تھا کیا۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ ردا رکھوں گا۔ ردا انجینئر بنے گی اور بازل فٹ بالر بنے گا، پیسہ کمائے گا، اس پیسے کو میں جمع کرتا جاؤں گا۔ جب بہت زیادہ ہو جائے گا تو ہوائی میں جڑے پر دو گھروں کا۔ ایک بازل کے لیے، ایک اپنی گرل فرینڈ کے لیے۔۔۔ گرل فرینڈ کو بیوی سے چھپا کر وہاں رکھوں گا۔ شش۔۔۔ بتانا نہ کی کو، اور کیا۔۔۔“
 ”اف۔۔۔ تو بہ۔۔۔ اللہ جی۔“ افق کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔
 ”کیا تم میری بیوی بنو گی؟“

ایک ذرا لمبے وقفے کے بعد یہ میج آیا۔ فون اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ ایک کرنٹ اس کے اندر سے ہو کر گزرا۔ انجان نمبر تھا۔ انجان شخص تھا۔ غلط انداز تھا، غلط ہی زمانہ تھا۔ اتنا وہ جانتی تھی، پھر بھی اس نے رات تک کئی بار اس فخرے کو پڑھا۔
 ”میری بیوی بنو گی؟“

ہر بار کرنٹ ہی کرنٹ سا لگتا۔ وہ ڈر جاتی۔ کانپ جاتی۔ پھر بھی بار بار پڑھتی۔

ساری رات اس فخرے کے آگے پیچھے بھاگتی رہی۔

اماں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ منہ اندھیرے اٹھنے والی بے سدھ پڑی تھی۔ اماں نے اسکول سے چھٹی کر لی۔ اسے تیز بخار تھا۔ دونوں بھائی پریشان صورت لیے اسکول گئے۔ افق بیمار ہو گئی۔

اماں اس کی پیاری سے بہت پریشان ہو جاتیں۔ انہیں شرمندگی ہوتی۔ انہیں لگتا سب ان ہی کی وجہ سے ہے۔ اتنا کام کرتی ہے وہ۔ کتنے سالوں سے کر رہی ہے۔ کالج بھی نہیں جاسکی۔

انہوں نے سوچا۔ اسے ماموں کے یہاں بھیج دیں۔ ان کے بچوں سے دوستی نہیں تو سلام دعا ہی سہی۔ ایک دو ہفتے سوٹ لے دوں گی۔ ماحول بدل جائے گا۔ چار دن تو ماموں مہمان بنائی لیں گے۔

شام تک اس کا بخار اترا۔ فون کے ساتھ الٹ پٹ لگی رہی۔ اماں نے اس کی تیاری کی۔ کپڑوں کے لیے اسے ساتھ لے جانا چاہا۔ پر وہ نہیں مانی، ماموں کے بچے کالج یونیورسٹی جاتے تھے۔ اس کے ساتھ سلام دعا ہی رکھتے تھے۔ بس۔ ماما جی اسے کاموں میں لگائے رکھتیں۔ آتے ہوئے سیبا باجی، زنیہ باجی کے استعمال شدہ کپڑوں، جوتوں کی ٹھڑی باندھ کر پکڑا دیتیں۔ اسد دبی بھلے لے آیا۔

”افق باجی! ٹھیک ہونا؟“ وہ بے چارہ بہت فکر مند ہو جاتا تھا۔

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔“

”افق باجی! بیمار نہ ہوا کرو۔“ وہ اور بے چارہ نظر آنے لگا۔ ”مجھے بڑا رونا آتا ہے کسی کو بھی بیمار دیکھ کر۔“

”میں نہیں ہوتی اب بیمار۔“ وہ مسکرائی۔

”میرے پاس کچھ اور پیسے بھی ہیں۔ میں چوک سے ملک فیک لادوں۔“ وہ پھر مسکرا دی۔ اماں اسے لے کر سڑک پار پارک چلی گئیں۔ سبزے پر وہ دیر تک ٹھکتی رہیں۔ جنگلے سے سڑک دیکھتی رہیں۔

”میری بیوی ہونگی۔“ وہی آواز سبزے پر بجھ گئی۔ درختوں پر لہرا گئی۔ درختوں پر چڑھے پرندے ایک ساتھ خوب آسمان رنگا گیا۔

سبزے پر چاندنی بھی پھیل گئی اور قوس قزح بھی۔۔۔ پھول، پودے لہر لہرا کر جھومنے لگے۔ یہ منظر اس کے اندر کا تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔ بخارا تر گیا۔ اماں خوش ہو گئیں۔ پارک سے اسے آئس کریم کھلانے لے گئیں۔ فون کو ہاتھ میں لیے لیے ہی وہ سو گئی۔ پھر کوئی میسج نہیں آیا تھا۔

”میری بیوی، میری بیوی۔“ اس نے رات کے نہ جانے کس پہر اور کس اوٹ میں چھپ کر کہا۔ ننھی سی، پیاری سی لڑکی بولی ”ہاں“ خود سے بھی چھپ کر، ڈر کر، کانپ کر، رات کے اندھیرے میں۔

کئی دنوں بعد فون آیا۔ بجتے بجتے بند ہو گیا۔ لیکن اس کا دل دھڑکتا رہا۔ پھر میسج آنے لگے، وہی الٹے سیدھے۔

”کوئی ہے؟ کوئی چڑیا، کوا، شیر، ہاتھی، چلو کھوڑا ہی سہی۔۔۔ گائے بھی نہیں بھی چلے گی۔“

”خاموشی اتنی حسین ہے تو کلام کتنا غضب ڈھائے گا۔“

اماں نے پوچھا۔ ”افق! آنا کو نہ لیا؟“

”جی شیر۔۔۔“ ہڑبڑا گئی۔

”شیر۔۔۔؟“ اماں حیران پریشان۔

ڈر کے مارے اس نے رات تک فون کو ہاتھ نہ لگایا۔ جب سب سو گئے تو باورچی خانے میں جا کر کھانے سے کتاب کھول کر اس میں فون رکھا اور پڑھنے لگی۔ ایک بار، دوبار، نہ جانے کتنی ہی بار۔۔۔ اس کی کٹی نہیں ہو رہی تھی یا دل نہیں بھر رہا تھا پتا نہیں۔۔۔



اس کے امتحان ہونے والے تھے، تو اماں نے اس کے سارے کام ختم کروا دیے تھے۔ بی اے کے بعد اسے کوئی اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ مگر اب اس کا دھیان ہی قائم نہیں رہا تھا۔ ہاتھی۔۔۔ شیر۔۔۔ لکھا نظر آتا۔ وہ ہنس دیتی۔

فون آتے رہے، میسج بھی آتے رہے۔ وہ خاموشی میں ہی اس سے ہم کلام ہوتی رہی۔ وہ اس کی زندگی کا جز بن گیا۔ سانس کی طرح جو آتے جاتے دکھائی نہیں دیتی، لیکن ہوتی ہے اور بہت ضروری ہوتی ہے۔

چند دنوں سے نہ فون نہ میسج آرہے تھے، چڑچڑی ہوگئی۔
 ”آخری بار اس نے اتنا ہی لکھا تھا کہ وہ مر جائے گا تو ہی جواب آئے گا۔“
 افق کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ کتنا مستقل مزاج ہے اور اب یہ مشکل مزاج چپ ہو گیا تھا۔ مصروف ہوگا، بیمار ہوگا یا بھول گیا ہوگا۔

دو ہفتے گزر گئے، کیسے گزرے افق ہی جانتی تھی۔
 ”وہ مر ہی گیا ہوگا۔“ افق کا دل دہل گیا۔
 ”افق پڑھ لو۔“ اماں نے کہا۔ پہلے انہیں کہنا نہیں پڑتا تھا۔
 رات تک کوئی میسج نہیں آیا تھا۔
 رات سے صبح ہوگئی۔ اماں اسکول چلی گئیں۔ وہ اکیلی رہ گئی۔
 ”کوئی ہے؟“ اس نے پہلی بار لکھا۔
 رات گئے تک کوئی جواب نہیں آیا۔
 دو دن گزر گئے۔ اتنی ہمت کر کے کیے گئے سوال کا کوئی جواب نہیں آیا۔
 ”کہاں گئے سب؟“ پھر لکھ کر بھیجا۔
 جواب پھر بھی نہ آیا، دو دن اور گزر گئے۔

”اب تو وہ مر ہی گیا ہوگا پکا۔“ فون بھی بند ہوگا۔ اس نے کال کے بٹن کو دبا دیا۔ پہلی ہی بیل پر۔
 ”یہاں ہیں سب، اور تم۔“ سوال کا جواب اور جواب کے لیے سوال۔
 ”اور تم۔۔۔“ افق کا دل پھڑپھڑانے لگا۔
 ”ارے بھئی۔۔۔ اور تم۔۔۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔
 اس نے فون بند نہ کیا، سنتی رہی۔

”ڈر رہی ہو کہ کون لفنگا اور بد معاش ہے۔ بولتی نہیں ہو، سانس بھی لیتی ہو کہ نہیں؟ کھاؤں گا نہیں تمہیں۔ قتل بھی نہیں کروں گا سچ۔ اب بھی تمہارا فون نہ آتا تو مر جاتا، اپنی قسم کھاتا ہوں، مر جاتا، بولو بھی، کیا کوئی ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے کہا، اسے کہنا ہی پڑا، بچوں سی پیاری لڑکی کو کہنا ہی پڑا، یقین چاہیے کہنا ہی پڑتا ہے، انسانی فطرت، عورت اور مرد کی ازلی جوڑی دار سانچہ اور کشش۔۔۔ کوئی اس کشش سے کہاں جا چھپے۔

”تمہارا نام۔۔۔“ اس نے اتنے پیارے انداز سے پوچھا۔
 ”افق۔۔۔“

نام بتاتے ہی بات چل نکلی۔

افق کو ایک سیٹیلیٹ مل گئی۔ وہ کب روئی، کب ٹہری۔ وہ اسے بتانے لگی۔

محبت نے عجب ستم ڈھایا اس پر۔۔۔ وہ اپنی اماں کی، گھر کی، کام کی چھوٹی چھوٹی سوچوں سے دور نکل گئی۔ اسے اس سے بات کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس نے کہا۔ اگر وہ اتنی ہی معسر المزاج رہی تو فرشتہ

بن جائے گی۔ وہ ہنس دی۔

”تمہیں میری ہر بات پر ہنسی آتی ہے؟“

”آپ کی ہر بات ہنسانے والی ہوتی ہے۔“

”مجھے جو کچھ سمجھا ہے؟“

”ہاں سمجھ لیتی ہوں۔“ کھی کھی کھی۔

”ایک دن ایسے ہی ہنستے ہنستے میں تمہارا گلابادوں گا۔“

”ہائے اللہ!“ اس کے سنجیدہ انداز پر وہ واقعی سنجیدہ ہو گئی۔

”ہا ہا ہا!“ وہ دل کھول کر ہنسا۔

اپنے تعارف میں اس نے اپنا نام امان بتایا تھا۔ کالج میں وہ اسی نام سے مشہور ہے۔ دراصل چند ماہ شوق شوق میں وہ ہاسٹل رہا تھا۔ ہاسٹل میں اندرون خانے انہوں نے بہت سے کارنامے انجام دیے تھے۔ ان کے گروپ کا نام ”ایگل“ تھا اور وہ سب ایک دوسرے کو فرضی یا ننگ نیم سے بلاتے تھے۔ یہ صرف ایک سیف سائیڈ پلان تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو جائے اور بات تقشیش تک جا پہنچے تو کوئی ان تک پہنچ ہی نہ سکے۔ چونکہ اردوں کو بھی ان کے اصل نام معلوم نہیں تھے۔ آئے دن وہ نت نئے شرارتیں کرتے، ہاسٹل میں رہنے کا شوق پورا ہو گیا۔ وہ ہاسٹل چھوڑ آئے۔ نام ساتھ ہی لے آئے۔ امان نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ پچھلے دنوں فون پر لڑکیوں کو تنگ کرتا رہا تھا۔ ایک نمبر پر وہ ملی تو اس کی آواز، انداز پر فدا ہو گیا۔ وہ دوسرے شہر سے یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا۔ ڈی ایچ اے میں ایک بنگلے میں اپنے چار دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔

وہ بات اس انداز سے کرتا کہ پیارا لگتا۔ اس میں ایک بات تھی کہ وہ سچ بڑے دھڑلے سے بولتا تھا۔ جب اس نے یہ کہا کہ وہ لڑکیوں کو تنگ کر رہا تھا۔ افق خاموش ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔ وہ خاموش ہی رہی۔

”اپنے چھوٹے سے ذہن پر زیادہ زور مت ڈالو۔ چور، ڈاکو نہیں ہوں میں۔ قدر کرو میری، میں کتنا سچ بولتا ہوں۔ چاہتا تو یہ بات نہ بتاتا، تم سی بھولی لڑکی سے زیادہ تو بھالو عقل والا ہوگا۔ نہ بتاتا تو کیا معلوم کر لیتیں تم یہ؟“

اس نے اتنی بڑی دلیل دی کہ افق قائل ہو گئی۔

”ایک ٹیڈنٹ ہو گیا تھا میرا، بور ہو رہا تھا میں، کالج جا نہیں رہا تھا۔ ایک جگہ پڑے پڑے تھک گیا تھا۔ ورنہ کالج میں مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ ہر لڑکی میری دوست بننا چاہتی ہے۔“

کالج میں لڑکی کی کمی نہیں۔ یہ بات افق کو بری لگی۔ افق نے فون بند کر دیا۔ اسے بے عزتی کا احساس ہوا۔ اس احساس میں بھی اس نے امان کو برا نہ سمجھا۔ صرف اس کی حرکت کو ہی۔

”رونامت۔“ میسج آیا، پھر یہی میسج بار بار آتا رہا۔ وہ مسکرائی دی۔

”بہت لڑکیوں سے دوستی ہے۔ بہت سوں سے بات کرتا ہوں افق۔۔۔ لیکن۔۔۔“ میری بیوی بنو گی۔“ صرف تمہیں کہا، سمجھیں۔۔۔ میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں۔ میں نے یہ صرف تمہیں ہی کہا۔

دوبارہ ایسے فون بند مت کرنا۔ ورنہ میں تمہارے گھر آ جاؤں گا۔ تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔“
 افق نے کہا۔ ”سب لڑکیوں سے دوستی چھوڑ دو۔“

اس نے قہقہہ لگایا اور کہا ”اچھا جی!“

”ان سے بات نہ کرنا۔“

”ٹھیک ہے۔“

”ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔“

”اچھا یا ر! ٹھیک ہے اور کچھ؟“

”بس اتنا ہی۔۔“ وہ فوراً سمجھ کر مان جاتی تھی۔

”تم سے ملنا ہے۔“ اب وہ صرف یہی ایک بات کرتا۔

”دیکھتے ہیں۔“ وہ ہنسی۔

”تو پھر ملو نا، پھر دیکھتے ہیں۔“ التجا بھی فرمائش بھی۔

”یہ بھی دیکھتے ہیں۔“ وہ کھل کر ہنسی۔



اس کا رزلٹ آیا۔ وہ فیل تھی دو پرچوں میں۔ امان بہت ہنسا۔ ”یہی ہونا تھا۔“

افق کو دلی صدمہ ہوا۔ امان کی ساری امیدیں خاک ہو گئیں۔ وہ دونوں اداس رہی۔ پھر سوچتیں، اتنا کام کرتی ہے، پھر ایسے میں کہاں کی پڑھائی۔ انہوں نے افق کو سمجھایا کہ وہ جو بیس گھنٹوں میں ایک وقت کی روٹی بھی کھا سکتے ہیں۔ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سمجھ گئی۔ لیکن مسئلہ کچھ اور تھا۔ کام نہیں تھا۔ آج کل وہ جو کام کر رہی تھی وہ تو بہت آسان تھا۔ ریڈی میڈ کپڑوں پر بشن لگانے کا کام تھا۔ وہ ہینڈ زفری کان میں لگا کر ایک طرف بیٹھی کام کرتی رہتی اور باتیں بھی۔۔۔

امان بہت مصروف انسان تھا۔ لیکن وہ ہر روز اس سے بات ضرور کر لیتا تھا۔

امان نے کہا کہ اس نے ٹاپ کیا ہے۔ وہ خوش تو ہوئی۔ لیکن حیران بھی ہوئی۔ امان سے بات کر کے وہ فیل ہو گئی۔ لیکن افق نے فخر ایسے کیا جیسے اس نے خود نے ٹاپ کیا ہو۔ اتنا دکھ تو اسے اپنے فیل ہونے کا نہیں ہوا تھا۔ جتنا اس کے ٹاپ کرنے کی خوشی ہوئی تھی۔

اب وہ ملنے کی ضد کرنے لگا تھا، افق میں حوصلہ نہیں تھا۔ افق سیکرٹریٹ کی طرف بنی فیکٹری میں کام کرنے لگی تھی۔ وہاں فرے اور خاکی لفافوں کی نسبت کام آسان بھی تھا اور پیسے بھی زیادہ تھے۔ اسے صرف چھ گھنٹے کام کرنا ہوتا۔ ماہوار چھ ہزار۔۔۔ تین گھنٹے اور لگانے پر آٹھ ہزار۔۔۔ افق آٹھ بجے جانی، تین بجے تک واپس آ جاتی۔ جمال اور اسد اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ اسے چھوڑ کر وہ اپنے اسکول چلے جاتے۔ امان کے بار بار کہنے پر اس نے اسے میٹل کالج آف آرٹس کے آگے کھڑا ہونے کے لیے کہہ دیا۔ اسے اسی سڑک کے فٹ پاتھ پر سے گزرنا تھا۔

جمال آگے آگے چل رہا تھا اور اسد ذرا سا پیچھے چل رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے قدم افق کے بالکل

برابر آتے۔

”افق باجی! تیز چلو۔۔۔ آج اتنی آہستہ چل رہی ہو۔“

اس نے دو قدم تیز اٹھائے۔ پھر آہستہ ہو گئی۔ وہ کار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ کے بارے میں افق کو بتایا تھا اور افق نے اسے ہلکے گلابی رنگ کی شلوار قمیص اور کالی سیاہ چادر کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ کار کے بونٹ کی طرف کھڑا تھا۔ پہلے امان نے اسے دیکھا۔ شاہراہ قائد اعظم کی پُر شور سڑک پر کشمیری حسن سے محبت سے کوسڑک پر چلتے دیکھا۔ حیران رہ گیا۔

افق فٹ پاتھ پر اس کے قریب سے گزر کر چلی گئی۔ اس نے ایک بار نظر اٹھا کر نیلی شرٹ والے کو دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ امان زندگی میں لڑکی نام کی چیز سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ لڑکیوں کو پسند کر لیتا تھا۔ دوستی بھی، فلرٹ بھی، لیکن متاثر نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ افق سے متاثر ہو گیا۔ اس کے حسن سے۔۔۔ اس نے رات کو فون کیا تو بولنا ہی بھول گیا۔

”تم اتنی خوب صورت ہو۔“

اس نے اس انداز سے کہا جسے افق نہیں سمجھتی تھی۔ دنیاوی بیٹانوں سے ابھی وہ نہیں گزری تھی۔ خوب صورتی اگر کوئی فائدہ ہے تو وہ اسے فی الحال کوئی فائدہ نہیں دے رہی تھی اور اگر یہ کوئی خوبی ہے تو یہ خوبی ان کے لیے بے کار تھی۔

”مجھے نہیں معلوم، میں کیسی ہوں۔“ اس نے سچ کہا۔
 ”تمہیں معلوم ہو بھی نہیں سکتا۔“ امان کا انداز کھو گیا۔
 ”مجھے معلوم کرنا بھی نہیں۔“ اس بار بھی اس نے سچ ہی کہا۔
 ”اگر تم نے معلوم کرنا چاہا تو غضب ہو گا۔“
 وہ حیران ہوئی۔ ”کیا مطلب؟“

”ہمارے کالج میں ذرا جو خوب صورت لڑکیاں ہیں نا، وہ کمال کے نالک کرتی ہیں، پھر تم بھی ایسے ہی نالک کرتیں۔“

”نالک۔۔۔؟“

”چھوڑ دو اس بات کو یہیں۔“

اس نے چھوڑ دیا۔ اتنی عقل والی نہیں تھی کہ باتوں سے ہزار ہزار مطلب نکال لیتی۔

امان نے کرید کرید کر اس سے بہت سے سوال کیے۔ ابا اور ان کی موت کے بارے میں۔۔۔ خاندان کے بارے میں، یہ سوالات اس نے پہلے نہیں پوچھے تھے۔ وہ اپنی باتیں کرتا، اپنی شرارتیں، تھوڑا بہت وہ جانتا تھا، جو کچھ پوچھتا، افق سچ بتا دیتی تھی۔

اسے کبلی بارد کیٹنے کے بعد اس نے بہت سنجیدہ گفتگو کی تھی اس کے ساتھ۔ اس کی باتوں سے افق کو اندازہ تھا کہ وہ امیر ہے۔ لیکن اتنا امیر ہے وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ اسے اپنے خاندان کے بارے میں بتانے لگا۔

وہ چاہتا تھا کہ وہ فیکٹری نہ جائے۔ وہ اسے چھ ہزار دے دیا کرے گا۔ اس کی یہ بات افق کو اتنی اچھی لگی کہ وہ خوشی سے نہال ہو گئی مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ اس سے پیسے لے لیتی۔ فیکٹری نہ جاتی تو امان کو کیا بہانہ کر کے پیسے دیتی۔ امان سمجھ کر چپ کر گیا۔ افق کا انکار کرنا اسے بھی اچھا لگا۔

آنے والے دنوں میں وہ کئی کئی بار اس کے راستے میں کار روک کر کھڑا ہوا۔ چادر کا پلو منہ میں دبائے وہ قریب سے گزرتی رہی۔ ایک نظر دیکھتا اور اگلی نظر کے لیے بے چین ہو جاتا۔ اس نے اس سے زیادہ خود ہی اصرار نہیں کیا۔

اب امان چاہتا تھا کہ افق اچھے نمبرز سے امتحان پاس کرے تو وہ اسے کسی اچھے کالج میں داخل کروادے۔ کم از کم اس کے پاس ایک اچھی ڈگری تو ہوگی۔ امان کے لیے وہ سب اچھی ڈگریاں حاصل کر سکتی تھی۔ وہ اس کی ہر بات مان لیتی تھی۔ ضدی تو وہ تھی ہی نہیں۔



وقت اور زمانے نے کچھ چیزوں، کچھ افکار، کچھ قدروں کو نادر و نایاب بنا دیا ہے۔ اب چور بازاری اتنی ہے کہ شریف انفسی پر جان دینے کو جی چاہتا ہے۔ جھوٹ اتنا ہے کہ بچ کو اٹھا کر طاق میں رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ دغا بازی، فریبی، چالاکی، مکاری، فرعونیت اس حد تک سرایت کر چکی ہے معاشرے میں کہ معصوم اور بھولے بھالے کسی بھولے بھٹکے آدم زاد کو گھر میں تالا بند کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سادگی، معصومیت، سبکی، شرافت، اعلا کرداری، پونو ادرا ت کی فہرست میں درج ہو گئے ہیں۔ امیر لوگ لاکھوں، کروڑوں لٹاتے ہیں ان نو ادرا ت کو اپنے گھروں میں سجانے کے لیے۔

سادہ، معصوم، بوکھلائی سی افق کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور وہ ہاتھ امان کے تھے۔ بات محض وقت گزاری، تفریح اور دل لگی سے شروع ہوئی۔ اب دل کی طرف جاری تھی۔ امان کے دل کی طرف۔۔۔

افق کے حسن کا تیر عین نشا نے پر لگا۔ اس کی سادگی نے امان کا دل موہ لیا۔ کبھی جو اس نے عورت کے لیے ایک معیار بنایا تھا۔ افق اس معیار پر پوری اتر رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا لڑکا ہے۔ وہ جانتا تھا آخری بھی ہوگا۔ وہ قسم کھا سکتا تھا۔ افق سے سادہ طبیعت لوگ نہ منزل بدلتے ہیں، نہ راستے۔ لوگ اور محبت تو بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امان اس کی ہر بات کو بہت پسند کرتا تھا۔

اس نے کبھی اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس سے بات کرتا تھا۔ افق کے لیے یہی محبت تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ افق امان تک جانے میں اور امان افق کے پانے میں۔



ایک پورا دن امان کا فون نہیں آیا اور نہ ہی اگلے دن۔۔۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن افق پریشان ہو گئی۔ اگر وہ فون نہیں کرتا تھا تو میسج ضرور کر دیتا تھا۔ تیرا دن آ گیا۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔ ایسا بھی ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ چھپ چھپ کر فیکٹری میں روٹی رہی۔

اتنے سے ہی دنوں میں اسے لگا کہ وہ اسے چھوڑ گیا ہے۔ یہ خوف مسلسل اس کے اندر قائم تھا۔

امان پر مکمل یقین کے باوجود یہ خوف گاہے بگاہے اس میں در آتا۔

چار دن گزر گئے اسے اپنے خوف پر یقین ہونے لگا۔۔۔ پانچویں دن امان کی کال آئی۔
”آپ کہاں تھے؟“ اس نے پہلا سوال یہی کیا۔

”میں جیل میں تھا۔۔۔ دہی جا رہا ہوں۔۔۔ وہاں سے آگے بھی جاسکتا ہوں۔۔۔ کسی سے کوئی رابطہ نہیں کر سکوں گا۔“ جلدی جلدی کہا۔ اتنی ساری باتیں سن کر وہ سمجھ گئی کہ بس اب وہ جا ہی رہا ہے۔
”چھوڑ رہے ہیں مجھے؟“ روتے ہوئے پوچھا۔

”میں جیل میں تھا افتخ۔۔۔ ایک سیٹنٹ ہو گیا تھا مجھ سے کسی کا۔۔۔ کل باہر آیا ہوں ضمانت پر۔۔۔ آج شام کو دہی جا رہا ہوں۔“ وہ چلایا۔۔۔ افتخ سہم گئی۔
”نہ جاؤ امان!“ اس نے سہم کر بھی یہی کہا۔

”تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ وہ جلدی میں تھا۔ فون بند کرنا چاہتا تھا۔
”پاگل ہو جاؤں گی نہ جاؤ۔۔۔ مجھے اکیلے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“ افتخ باقاعدہ رونے لگی۔
”میں جیل میں نہیں سرسکتا۔۔۔ تمہیں حالات کا اندازہ ہی نہیں ہے۔۔۔ حالات بہتر ہوئے تو تم سے رابطہ کر لوں گا۔“

”ایسے نہ جاؤ امان۔۔۔!“ سب جان کر بھی اس کی ایک ہی ضد۔
”تو پھانسی لگ جاؤں؟“ اسے پہلی بار اس پر شدید غصہ آیا۔
”کیوں ہو گی پھانسی؟“ وہ ڈر گئی۔
”میں جا رہا ہوں۔“ وہ فون بند کرنے لگا۔
”نہ جاؤ۔“ پھر وہی بات وہی انداز۔
”تو مر جاؤں۔۔۔؟“

”میں مر جاؤں گی۔۔۔“ وہ تیز آواز میں رونے لگی۔ اب یہ جا رہا ہے، نہ جانے کب آئے، آئے بھی کہ نہ آئے۔۔۔ ”کچھ بھی نہیں ہوگا۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ یہیں رہو۔“ روتے روتے بھی اس نے یہی کہا۔

”تمہیں نہیں پتا۔۔۔ کیسے ہو جائے گا سب ٹھیک۔“ امان جھنجھلا گیا ساتھ ہی ذرا سا لہجہ نرم کیا۔
”میں دعا کر دوں گی۔۔۔ میں بہت اچھی دعا کرتی ہوں۔ بہت دل لگا کر۔۔۔ اب بھی کروں گی۔“

”دعا۔۔۔!“ امان کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو، کیا بک رہی ہو۔
”جا رہا ہوں میں۔۔۔“ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ افتخ نے دوبارہ نمبر ملایا تو فون آف تھا۔ وہ خوب ہی روئی۔ امان نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔
”کیا ہوا افتخ؟“ نفی میں صرف سر ہلا کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ کتنی دیر باتھ روم میں ہچکیاں دباتی رہی۔

”وہ جا رہا ہے۔۔۔ وہ جا رہا ہے۔۔۔ وہ جا رہا ہے۔“

اسے صرف یہی یاد تھا۔

باقی معاملات کے بارے میں اس نے نہ سوچا نہ ہی ان پر غور کیا۔ حادثہ کیسے ہوا کب اور کیوں ہوا۔ حالات کیسے اتنے بگڑ گئے کہ اسے بھاگنا ہی پڑ رہا ہے۔ ٹھیک کہتا ہے امان کہ اس کے پاس عقل ہے ہی نہیں، وہ موقع کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہی تھی، اپنی ہی بات کہیے جارہی تھی اور ایسے وقت جب امان کو جیل جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا بھلا وہ یہ سوچتا کہ افق کا کیا ہوگا۔

پندرہ دن گزر گئے۔ رور و کروہ بیمار ہو گئی۔ فیکٹری سے اماں نے ایک ماہ کی رخصت لے دی، اماں کہتیں اسے چور بخار ہے۔ رات کو آتا ہے دن کو چلا جاتا ہے۔ اسی بخار میں شاید افق مرجاتی لیکن امان کا خون آگیا۔

”کب مل رہی ہو؟“ اس نے چپک کر پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے وہ رونے لگی۔

”کب مل رہی ہو؟“ سوال پھر کیا۔

”کبھی نہیں۔۔۔“ زندگی آواز لیے کہا۔

”واپس جیل چلا جاؤں۔۔۔؟“ وہ بہت خوش تھا۔

وہ خاموش رہی۔

بہت چھپ کر بھیس بدل کر امان دہی جا رہا تھا لیکن ایئر پورٹ پر پکڑا گیا اور۔۔۔ اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس سے ایک بڑے بزنس مین کے چھوٹے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، ڈرائیونگ امان کر رہا تھا۔ وہ رات گئے اپنے دوستوں کے ساتھ ایک پارٹی سے واپس آ رہا تھا، حادثہ سراسر حادثاتی تھا لیکن اسے حادثاتی مانا نہیں جا رہا۔ انہیں ڈی ایچ اے سے رات گئے گرفتار کر لیا گیا۔ ان کا موقف تھا کہ ان سب نے ڈرنک کی ہوئی تھی۔

حادثے میں لڑکے کی جان تو بچ گئی تھی لیکن وہ کافی زخمی ہو گیا تھا، امان کے والد اور دوسرے تینوں لڑکوں کے خاندان والوں نے بہت کوشش کی کہ کیس عدالت تک نہ جائے وہ جرم مانہ بھرنے کو تیار تھے۔ لیکن وہ مان نہیں رہے تھے ناچار ان کے ارادے دیکھتے ہوئے ان سب کو ایک ایک کر کے مختلف ملکوں کی طرف بھگانا چاہا۔۔۔ مگر یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا۔۔۔ وہ پھر جیل چلے گئے۔

وہ سب مقدمہ بھی لڑ سکتے تھے اور سالوں بعد ہی سہی انہیں سزا سے بھی بچا سکتے تھے لیکن اس سب میں ان کا حال تباہ ہو جاتا، وہ ایک گھنہ جیل میں رکنے کے لیے تیار نہیں تھے، کہاں سالوں گزرتے۔

”اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہوتا ہے امان! اس نے میری دعا قبول کی۔“

جدید صدی کے جدید بچے کے لیے دعا جیسی چیز بہت پرانی اور فرسودہ سی تھی۔۔۔ جیسے اونٹوں پر

سفر کرنا۔۔۔ جیسے ستاروں سے راستہ معلوم کرنا۔۔۔ جیسے طبیب سے علاج کروانا۔

”گھروں میں بیٹھی لڑکیاں اور کرہی کیا سکتی ہیں سوائے رونے اور گڑگڑا کر دعائیں مانگنے کے۔“

اس نے جیسے کھلا مسخر اڑایا۔ جس بات پر اسے یقین نہیں ہوتا تھا۔ اس کا وہ مذاق ہی اڑاتا تھا،

سب ایسے ہی کرتے ہیں وہ بھی یہی کرتا تھا۔ دعا اس کے لیے محض ایک رسم تھی۔

”ہاں، میں ضرور گھر میں بیٹھی تھی لیکن جس سے مانگا تھا اس پر ہر ممکن اعتقاد رکھ کر مانگا تھا۔“

امان نے اس کے فلسفے کو مانا نہیں لیکن بات اور انداز اسے یاد رہ گیا۔

ایسے ہی چند لمحوں کے لیے اسے خیال آیا کہ اچانک کیسے وہ بزنس میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے فیصلہ واپس لے لیا اور جیسے جھٹ سے سب بڑ گیا تھا ویسے ہی سب جھٹ پٹ سنور بھی گیا۔

اس نے پہلی بار خود سے افق کو دعا کے لیے اس وقت کہا، جب اس کے دو عدد پرچے اس کی پسند کے مطابق نہیں ہوئے تھے۔

”میں دعا کروں گی کہ تم پاس ہو جاؤ۔“

روایت زندہ رہی امان ٹاپ کر گیا۔

”میں جانتا تھا۔“ اس نے اس انداز میں اطلاع دی جیسے بادشاہ تو میں ہی تھا نا۔۔۔ تو تاج پوشی

بھی میری ہی ہونی تھی۔

افق احساس کسری کا شکار ہو گئی۔ ایک وہ تھی ہر معاملے میں پیچھے تھی، اس نے ایف اے اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا اور حقیقتاً اس نے بہت محنت کی تھی، اس نے اے کرڈ لیا تھا۔

اس بار بھی امان کو یقین تھا کہ وہ بہت اچھے نمبر لے گی، الٹا وہ فیل ہو گئی، تو یہ جو عورت ہے وہ اس مرد کو اور مرد کی محبت کو اتنا سر پر کیوں سوار کر لیتی ہے کہ کیل ہی ہو جاتی ہے۔ پھر ایسی عورت تھی اور کسی کام کی نہ ہوئی نا۔۔۔ یہ سب سوچنے کا اس عورت کے پاس وقت نہیں ہوتا جو نا کام ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔

افق سب سے انجان ہو گئی۔۔۔ جمال سے اسد سے اپنی امان سے۔۔۔ ان کے کام کر دیتی۔ ان سے بات کرنے کا وقت رہا نہ ڈھنگ۔۔۔ کم گو پہلے ہی تھی۔ اپنی کم گو بھی نہیں تھی اور باتیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔۔۔ خون کا تعلق رکھنے والوں کے بڑے خونی حقوق ہوتے ہیں۔ وہ حقوق نہیں جو کتابوں میں لکھ دیے گئے ہیں۔۔۔ کچھ غیر مرئی حقوق بھی ہوتے ہیں جنہیں انسانی رشتے اور تعلق قائم کرتے ہیں۔

جب وہ دونوں اسے فیکٹری تک چھوڑنے جاتے تو اتنی باتیں کرتے اور وہ ہوں ہاں بھی نہیں کرتی۔ چھٹی والے دن ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہتے۔ افق کمرے میں ایک طرف بیٹھی رہتی۔ کتاب کھلی ہوتی۔

امان سوچتی، فیل ہونے کا صدمہ لے لیا ہے۔ ماموں زاد کا لچ جاتی ہیں، یونیورسٹی جاتی ہیں یہ ٹیوشن بھی نہیں جاسکتی الٹا فیکٹری جاتی ہے۔

”تم فیکٹری چھوڑ دو افق!“ امان نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم تھک جاتی ہو اور تمہیں پڑھنے کا بھی بہت شوق ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں امان!“ اس نے کہہ دیا۔

”گھر کے لیے تمہارے ماموں سے تھوڑا قرض لیا تھا، مجھے صرف اس کے اترنے کا انتظار

ہے۔۔۔ تمہارے بھائی بڑے ہوتے تو میں بھی تمہیں اتنا کام نہ کرنے دیتی۔“

”میں جانتی ہوں امان! آپ فکر نہ کریں۔“

”مجھے دکھ ہوتا ہے۔“

”ایسے نہ کہیں اماں۔۔۔!“ وہ شرمندہ ہو گئی۔ اس کے رویے سے اماں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ کما کر ان پر بہت بڑا احسان کرتی ہے اور انہیں پال رہی ہے جبکہ وہ سب تو ایک ساتھ ایک دوسرے کے لیے محنت کر رہے تھے۔

”تمہیں ٹیوشن رکھو ادوں۔۔۔ معلوم کروں کسی کو چنگ سینٹر کا۔“

”اس بار میں اچھی تیاری کروں گی۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”مجھے تمہاری بہت فکر ہے افق۔۔۔!“ وہ آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ ان کے بچوں نے کبھی انہیں روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں ان کے بچے انہیں روتے دیکھ کر خود بھی روئیں۔

”آج آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں۔“

”افق! نہ جانے کیوں۔۔۔ تمہارے لیے میں اندر ہی اندر ڈرتی رہتی ہوں۔۔۔ کوئی وجہ بھی نہیں۔۔۔ کچھ ہوا بھی نہیں۔ لیکن بہت وہم آتے ہیں۔“

اس کا جی چاہا کہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر انہیں اماں کے بارے میں بتا دے تاکہ اس کی اماں بے فکر ہو جائیں اور وہم کرنا چھوڑ دیں۔

اماں انہیں تو وہ بھی اٹھ کر عصر کی نماز پڑھنے لگی۔ آج کل وہ ایک وظیفہ کر رہی تھی اماں کی کامیابی اور ترقی کے لیے پھر تجویز یہ اٹھ کر ایک اور وظیفہ کرتی۔

اماں نے کہا کہ اس کے والد کی فیکٹری میں آگ لگ گئی ہے۔ الٹا ہیرو کمپنی نے ہی مقدمہ کر دیا ہے ان پر۔ وہ بہت بری طرح سے پھنس گئے ہیں۔ بہت برے حالات سے گزر رہے ہیں۔

”اماں برے حالات سے گزر رہا ہے۔“

افق کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ رات دن وظائف کرتی رہتی، نہ چاہتے ہوئے بھی نہ مانتے ہوئے بھی اماں اسے کہہ دیتا کہ دعا کرنا۔۔۔

کئی بار وہ کہتا کہ اسے اس سے ڈر لگتا ہے کہ وہ اسے بددعا نہ دے دے

”کوئی خود کو بددعا دیتا ہے؟“ افق برا مان جاتی۔

”ہوٹل جا رہا ہوں دعا کرنا۔ ٹیبل مل جائے خالی ورنہ دو گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے۔“

”کب سے کاربک کروائی ہے۔ ابھی تک نہیں آئی۔۔۔“

”ایک پریشانی ہے بتائیں سکتا۔۔۔ پر بہت پریشان ہوں۔“

”ایک آرٹیکل لکھا ہے اقوام متحدہ کے لیے، دعا کرنا آؤٹ اسٹینڈنگ رہے۔“

آرٹیکل آؤٹ اسٹینڈنگ ہو جاتا، ہوٹل میں جاتے ہی ٹیبل مل جاتی، کار آگئی۔ کتاب مل گئی۔۔۔ مقدمے سے جان چھوٹ گئی، ان کبھی پریشانی دور ہو گئی۔ یہ سب اتفاق ہو سکتا ہے لیکن افق نے یقین کر

لیا کہ وہ دل سے دعا کرتی ہے اس لیے اس کی دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے۔۔۔

دوسری طرف اماں اسے کہتا کہ وہ اس کے لیے اچھا سا ن ہے، جیسے نجومی کسی خاص پتھر کو پہننے کے لیے کہتے ہیں اور وہ پتھر اچھا رہتا ہے۔۔۔ سب ٹھیک ہونے لگتا ہے۔ اماں کے لیے وہ اب وہی پتھر بنے

لگی تھی وہ ایسا ہی شخص تھا جو نہیں مانتا تو خدا کو بھی نہیں مانتا اور ماننے پر آتا ہے تو ہر انسان کو خدا مان لیتا۔ وہ انجانی ترکیب کا عجیب انسان تھا، ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ نرالا تھا۔ ایسے ہزاروں لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر مختلف بلاگز پر اپنی پریشانی لکھ کر ان کا حل مانگ لیتے ہیں۔ اپنے مسائل کے لیے گوگل پر بار بار ٹائپ کرتے ہیں لیکن ایک بار بھی اللہ کے پاس نہیں جاتے۔ اللہ تعالیٰ۔۔۔ اللہ تعالیٰ بہت احترام سے کہتے ہیں مگر معلوم نہیں ہوتا کہ اتنا احترام کیوں۔۔۔ عجب اور نرالا ہونا برا نہیں ہے ہاں انجان اور لاعلم ہونا بہت ہی برا ہے۔



اچانک بیٹھے بٹھائے افق کو جو خوف گھیر لیتے تھے ان کے زیر اثر ایک دن اس نے خوف زدہ ہو کر امان سے پوچھ ہی لیا۔
”کیا مجھے تجھے چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچا۔“ جواب میں اس نے ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا۔

”میں مرجاؤں گی۔۔۔ ایسے سوچنا بھی مت خدا کے لیے۔“
”کوئی نہیں مرتا۔۔۔ خدا کے لیے تو مر بھی جاتے ہیں انسان کے لیے بالکل بھی نہیں۔“
”میں مر کر دکھاؤں گی۔۔۔“
”میں دیکھوں گا۔۔۔“
”میں مذاق نہیں کر رہی۔“
”میں بھی مذاق نہیں سمجھ رہا۔“
”اور میں مرجاؤں تو کوئی فکر نہیں؟“
”یہ میں نہیں جانتا۔۔۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔“
”بعد کی۔۔۔ میرے مرنے کے بعد کی؟“ یہ کہتے ہوئے وہ مرنے والی ہو گئی۔ دوسری طرف لوٹ پوٹ ہوتا قہقہہ بلند ہوا۔

”افق! ایسی باتیں کرو گی تو میں تمہیں اٹھالاؤں گا اسی وقت۔“
سارا مرنا مارنا اڑن چھو ہو گیا۔ ڈر، خوف دائیں بائیں نکل گیا۔ افق چپ ہو گئی۔
”اب بولو نا۔۔۔ اب بولتی بند۔۔۔ تو میں تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ آہم! باباجی کو یہ بھی معلوم ہو گا کب۔۔۔؟ بولے باباجی۔۔۔!“
”میری باتیں مذاق لگ رہی ہیں؟“ رونے کی تیاری ہونے لگی۔
”مذاق نہیں ہیں امان کی جان۔۔۔! مختلف ہیں، بوگی ہیں، عجیب تر ہیں، پر مذاق نہیں ہیں، مجھے یقین نہیں آتا لیکن جھوٹ بھی نہیں سمجھتا۔“
”پھر ایک بات سن لو امان۔۔۔! اگر افق کو چھوڑنا ہی پڑے تو عزت سے چھوڑنا امان! مجھ سی بے کار لڑکی کی محبت بے کا نہیں ہے۔ اسے اتنا رتبہ تو ملنا چاہیے کہ عزت سے رکھا اور چھوڑا جائے۔“
”تم یہ سب باتیں کیوں سوچتی ہو؟“

”کیوں کہ میں غریب ہوں، یتیم ہوں، چھوٹے سے ایک گھر میں رہتی ہوں۔ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں۔ کیا ہے میرے پاس۔ سب کچھ تو تمہارے پاس ہے۔“

”اور جس دن تمہیں معلوم ہو گیا کہ تمہارے پاس کیا کچھ ہے تو مجھ سے انسان کو تم اپنے قدموں پر گرا لو گی۔“

”ہر بات مذاق۔۔۔“ اتنی سنجیدہ بات پر بھی ایسا جواب، وہ چڑ گئی۔

”میں یہ سب نہیں جانتا افق! نہ ہی میں اتنی گہرائی میں جا کر سوچتا ہوں۔ بس ایک بات معلوم ہے کہ تم مجھے پسند ہو اور رہو گی۔ آج بھی زندگی میں ہو، کل بھی رہو گی۔ دوبارہ ایسی فضول باتیں نہ کرنا۔“

اور اس نے دوبارہ ایسی فضول باتیں کی ہی نہیں۔ وہ جانتی تھی وہ ہمیشہ اسے عزت ہی دے گا۔ شادی کا وعدہ بھی اسی نے کیا تھا۔ اگر یہ وعدہ نبھانہ سکا تو وہ دہنگ بچ بولنے والا اسے صاف صاف کہہ دے گا اور وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اتنا سچا ہے تو وعدے کا پکا بھی ہو گا۔۔۔ امان اسے کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔۔۔

امان نے کہا کہ اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرے تو اس نے بھی اچھے نمبروں سے ایف اے پاس کر لیا۔ خبر سنتے ہی اس نے ضد پکڑ لی کہ اب تو اسے اس سے ملنا ہی ہو گا۔ ساری رات شش و پنج میں گزار کر قریح نماز کے بعد دعا مانگ کر اور امان پر مکمل یقین رکھ کر وہ فیکٹری سے دو گھنٹے پہلے ہی نکل آئی اور امان کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔ اسے معلوم ہوا کہ دنیا کا ہر کام آسان ہے اس طرح امان کے ساتھ بیٹھنے سے۔۔۔ وہ بیٹھ گئی اور گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو ہی دیکھتے رہی۔ امان نے کئی بار گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ گود میں رکھے ہاتھوں سے نظریں بھی اٹھانے کے لیے تیار نہ تھی اور امان یہی چاہتا تھا کہ وہ ایسے ہی بیٹھی رہے اور وہ اسے دیکھتا رہے۔

”کیا ہوا؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

مشکل سے اس نے صرف نہ میں سر ہلا دیا۔

”آنا نہیں چاہتی تھیں۔۔۔؟“

سرنال میں ہلانہ ہاں میں۔۔۔ نظر اٹھا کر نہ دی۔

جولائی گالوں پر آ جا رہی تھی وہ شرم بھی تھی اور شرمندگی بھی۔۔۔ خوشی بھی اور بچھتاوا بھی۔۔۔ من چاہا بھی اور بردہتی بھی۔

یہ ملاقات اس نے امان کی ضد پر کی تھی اور اب اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زندگی بھر ایسی ملاقات دوبارہ نہ کرے۔۔۔

”تمہیں مجھ سے ڈر لگ رہا ہے افق؟“ امان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ برف کا بت بن گئی۔ ہمت جاتی رہی اور جی چاہا کہ چلا کر کہے ”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، مجھے جانے دو خدا کے لیے۔“

ہاتھ وہیں رہا۔۔۔ سچ بھی اندر ہی رہی۔۔۔

اس نے امان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جیسے فاختہ ڈار سے پھڑک کر سرد بارش میں بھگ گئی ہو۔ کشمیری حسن کے اس طرح بیٹھے رہنے پر اور نظر اٹھا کر ایسے دیکھنے پر ہر رنگ و سل کی عورت کو دیکھ

چکے، پرکھ چکے، مل چکے، جانچ چکے، ڈانس فلور کے شہزادے کو اس ادراپر کمال کا پیار آیا۔
جن کے ساتھ وہ دوستی کے نام پر فلرٹ کرتا تھا۔ وہ تو اس کے گلے میں جھول جاتی تھیں یہ تو محبت کی فہرست کی لڑکی تھی۔ شادی کے خانے میں نام درج۔۔۔
”چلو میں تمہیں واپس چھوڑ دیتا ہوں۔“

اس بار اس نے تائید میں سر ہلایا۔ کہیں وہ یہ ہی نہ سمجھ بیٹھے کہ وہ واپس جانا نہیں چاہتی۔
”میں یہاں رہتا ہوں افق!“ اماں نے گاڑی روک کر ایک بنگلے کی طرف اشارہ کیا۔ افق نے ذرا کی ذرا نظر الٹا کر اس طرف دیکھا۔ لایا تو وہ اسے اندر لے جانے کے لیے تھا لیکن مشکل ہی تھا۔
وہ اسے اس کے گھر پر چھوڑ گیا۔۔۔ وہ اس کے لیے چند تحائف لایا تھا اس کے پاس ہونے پر۔۔۔ پہلی بار ملنے پر۔۔۔ اماں سے اس نے بہانہ بنا دیا کہ فیکٹری کی ایک سہیلی اس کے ساتھ اتار کھلی بازار خریداری کرنے آئی تھی۔ سامان زیادہ تھا تو کچھ شاپرزا سے رکھنے کے لیے دے دیے۔ اماں نے لمحے کے ہزاروں حصے پر بھی اس کی طرف ایسے نہ دیکھا کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ سچ کہ جھوٹ۔
اس نے سب کچھ اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔۔۔ دیکھا بھی نہیں۔

اماں نے کہا کہ وہ اسے کالج میں داخلہ دلادیتا ہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔۔۔ اگر وہ کالج جائے گی تو فیکٹری کون جائے گا اور پھر گھر کیسے چلے گا۔
”میں تمہیں اتنے پیسے دے سکتا ہوں۔“

”میں اماں سے اتنے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی۔“
”میں چاہتا ہوں افق! تمہارے پاس اچھی ڈگری تو ہو۔“

”لی اے کے بعد میں یونیورسٹی ضرور جاؤں گی۔“
”اگر نہ گئیں۔۔۔“ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔

”میں جاؤں گی۔“
”تم نہیں جاؤ گی۔۔۔“ بے انتہا سنجیدگی سے کہا گیا۔

”تم ایسے کیسے۔۔۔“ اسے دکھ ہو رہا تھا۔

”دیکھ لینا۔۔۔ تم زندگی میں کبھی کچھ نہیں کر سکتیں۔۔۔ لوگ ناکام ہوتے ہیں یا آخری نمبروں پر آتے ہیں۔ تم وہاں تک بھی نہیں جا سکتیں۔ تم جیسی لڑکیاں افق گھروں میں ہی رہ سکتی ہیں۔ اچھا ہے گھر میں ہی رہو لیکن اگر ضرورت پڑے اور مستقبل بنانا ہو تو تم جیسی لڑکیاں بے کار ہیں۔ ہر سال میرا ایک لڑکی کے ساتھ ہی مقابلہ ہوتا ہے اور میں ہر بار اسے ہرا کر ٹاپ کر جاتا ہوں پر اس لڑکی کی محنت کی داد دیتا ہوں۔۔۔ کمال کی لڑکی ہے، اگر میں اس کی ٹکر پر نہ ہوتا تو اسی کے نام کے ڈنکے بچتے اور اگر تم اس لڑکی کی جگہ ہوتیں۔۔۔ فرض کیا صرف۔۔۔ نہیں یہ فرض بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

اماں دن بگ بچ بولتا تھا۔ وہ یہ جانتی تھی لیکن اس سچ نے اس کی آنکھیں نم کر دیں۔ چار سال جو اس نے دن رات محنت کر کے فرما بنا یا اور چھ گھنٹے جو وہ فیکٹری میں کھڑے ہو کر کام کرتی ہے۔ ایک دن بھی کسی کو اس کے کام سے شکایت نہیں ہوئی تھی۔ فیکٹری کے چھ گھنٹے اور فرما بنانے کے سولہ گھنٹے اگر وہ

کتاب پر لگاتی تو پاکستان بھر کے طلباء کو پیچھے چھوڑ دیتی۔ جو شخص سیکنڈ ہینڈ کتابیں خریدتا ہے اور جن کتابوں میں بہت سے صفحے پھٹے ہوئے ملتے ہیں اور انہی صفحوں سے کوئی سوال آجاتا ہے تو ایسے شخص کے گریڈ گنتے ہوئے اس کی مشکلات بھی ضرور گنتی چاہئیں۔ اگر وہ کالج جائے اور گھر آتے ہی اسے تین دقت کا کھانا ملے تو وہ بھی امان جیسے ہر طالب علم سے ٹکر لے سکتی ہے، جو بھی ہو، اسے خود پر شرمندگی ہوئی۔

پہلی بار اس نے اپنی زندگی کو شکوے کی نظر سے دیکھا۔ اس نے غصے میں گلاس زمین پر دے مارا۔ اسے غصہ آیا کہ اس کے پاس وسائل کیوں نہیں ہیں۔۔۔ وہ ہی کیوں غریب ہے۔۔۔ فیکٹری گئی تو سارا کام الٹا پلٹا ہو گیا۔۔۔ کہتے ہیں جس اناج میں، حرام کا ایک دانہ آجائے وہ سارے اناج کو تباہ کر دیتا ہے۔ پہلے افق کے مزاج بدلے، وہ ہر وقت چڑھتی رہنے لگی، بات بات پر غصہ کرتی، اماں حیران ہوئیں پھر پریشان رہنے لگیں۔ ایک دو بار پوچھا پر اس نے ایک لفظ نہ کہا۔ اماں انجالی سوچوں سے شرمندہ ہوئی رہیں۔

”ابھی پچھلے دنوں ماموں کے چھوٹے بیٹے کی منگنی کی خبر آئی تھی۔ کبھی ماضی میں ماموں نے کہا تھا کہ وہ کشمیر کی کلی کو اپنے اس بیٹے کے ساتھ باندھ دیں گے۔ اماں سمجھیں شاید اندر ہی اندر اس کی آس تیار درخت بن گئی۔ اب کالے نہیں کٹ رہی، کیا معلوم پسند کرتی ہوا ہے۔ بچپن تک اچھی ہی دوستی تھی دونوں میں۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید۔۔۔ کچھ اور بھی ہو۔

”اس نے صرف اماں کی گود میں سر رکھ دیا۔۔۔ میرے لیے دعا کیا کریں اماں۔۔۔! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔“

اس دوران ایک اور واقعہ ہوا۔ جس فیکٹری میں افق جاتی تھی ان کے پارٹنرز کے درمیان لیبر کی کٹوتی کو لے کر جھگڑا ہوا۔۔۔ کبھی کسی کو فارغ کر دیا جاتا کبھی واپس بلا لیا جاتا۔ جھگڑا بڑھا اور فیکٹری غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دی گئی۔ افق حقیقتاً بہت پریشان ہو گئی۔ بانی کاموں میں اتنے پیسے نہیں بننے تھے اور کوئی کام وہ کر نہیں سکتی تھی۔ کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری کرتی تو بمشکل ہی دو ڈھائی ہزار ملتے۔ اس نے اماں کو آرام کرنے اور خود ان کی جگہ جانے کے لیے کہا پر وہ نہیں مانیں۔

اماں اپنے شہر گیا ہوا تھا، کبھی بکھار ہی اس سے بات ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس بار پاپا سے افق کی بات کرنے جا رہا ہے۔

”وہ نہیں مانیں گے۔“ وہ افسردہ ہو گئی۔

”ہے تو ایسا ہی۔۔۔“ اس نے بھی تسلی نہیں دی۔

”پھر؟“ اب وہ یہی سوال پوچھ سکتی تھی۔

”وہ مانیں گے نہیں، یہ سچ ہے پھر ظاہر ہے کہ مجھے خود ہی اسٹینڈ لینا ہوگا اکیلے ہی۔“

”اکیلے کیسے۔۔۔“

”باگل لڑکی! تم اور میں۔۔۔ میرے اکاؤنٹ میں پیسے ہیں اور میرا مستقبل روشن ہے۔۔۔ مجھے

کوئی مسئلہ نہیں۔“

”وہ مان جائیں تو کتنا اچھا ہو۔“ ایک طرف افق کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ امان اسے اپنے بل بوتے پر بالے گا چھوڑے گا نہیں۔ اپنے خاندان کو جانتا ہے اسی لیے فیصلہ کر چکا ہے۔ دوسری طرف وہ اسی فیصلے سے گھبرا گئی۔

”تم فکر نہ کرو۔ میں نے سب کچھ پلان کر لیا ہے۔“ وہ ایسے ہی آرام سے، اطمینان سے انتہائی سنجیدہ باتیں کیا کرتا تھا، جیسے چونک چار ہا ہو یا مودی دیکھ رہا ہو اور اپنے ملازم سے کہہ رہا ہو۔ ”ہاں ہاں اور بخ جوں ہی۔“

”امان کا مستقبل روشن ہے۔“ افق بے فکر ہو گئی۔ خاندان کی مخالفت اپنی جگہ۔ امان کی حمایت۔ ”پاپا سے، ماما سے بات کروں گا۔۔۔ ہر طرح سے انہیں راضی کروں گا۔ وہ مان جائیں گے۔ میری مان ہی جاتے ہیں۔ تمہیں دیکھیں گے تو اور مان جائیں گے۔“

”مجھ میں ایسا کیا ہے کہ وہ مجھے دیکھ کر مان جائیں۔“ افق کے آگے اس کا چھوٹا سا گھر گھوم گیا۔ ”دیکھیں گے تو ان ہی سے پوچھ لینا۔ جب وہ اپنی پلکیں بھی نہیں جھپک سکیں گے۔۔۔ بت بن جائیں گے۔“ افق مسکرا اٹھی۔

”ایسی بھی بات نہیں ہے۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ تم انہیں مجھ سے زیادہ اچھی لگو گی۔“



وہ ہر طرح کی تعلیمی سرگرمی سے تین ماہ پہلے ہی فارغ ہو چکا تھا۔ یہ عرصہ اس نے پارٹیاں کرنے اور چند دوستوں کی شادیاں انیڈ کرنے میں گزارا تھا۔ اس دوران وہ دوبار گھر ہو کر آچکا تھا لیکن افق کو نہیں بتایا تھا یہاں چھاپا منصفہ نہیں تھا عادت وجہ تھی، ایگل گروپ کے سب ہی کارکنوں نے ساری بتیاں بجھا کر سکرپٹ لائبریر جلا کر مشترکہ حلف لیا تھا کہ وہ اپنی تعلیم کے دوران کے اس عرصے کو ہر رنگ سے سجادیں گے۔ کوئی ٹینشن نہیں لیں گے۔ جو جی میں آئے گا کریں گے، جو دوسرے بنے گا اس کا سر پھوڑ دیں گے۔

تو اس ایگل گروپ کے ہر رکن نے ہر وہ کام کیا جو ان کے جی میں آیا۔۔۔ ہاسٹل کے ہی ایک دوسرے گروپ کے ساتھ ان کی گرما گرمی ہو گئی، انہوں نے ان کے کمروں میں ڈرگ اور شراب چھپادی اور چھاپہ پڑوایا۔

ان ہی دنوں جب وہ زخمی ہو کر بستر پر تھا اس نے افق کو ڈھونڈ نکالا۔

جیسے کالے سیاہ آسمان پر پہلی تاریخ کا چاند ساری توجہ کھینچ لیتا ہے۔ ایسے ہی افق کی آواز اور انداز نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس نے ”جی“ کے نام سے نمبر محفوظ کر لیا۔ مختلف چیزوں کو دیکھتے دیکھتے ان چیزوں میں ایک بدنامیا عجیب ہی سہی رکھی ہوئی مل جائے تو چلتے چلتے قدم رک ہی جاتے ہیں۔ ذرا سا دیکھ لینے کے لیے کہ یہ کیا ہے۔ اسی طرح افق کو ذرا سا دیکھنے کے لیے امان رک گیا۔

کسی لڑکی پر وہ اتنا وقت برباد نہیں کرتا تھا۔ جن لڑکیوں کو اس نے فون کا لڑکی۔۔۔ اس کی دلکش آواز سننے ہی دوسری بار انہوں نے خود کال کی مگر اس لڑکی نے فون ہی بند کر دیا۔ اسے وقتی حیرانی

ہوئی۔۔۔ پھر بات اتنا اور ذاتی ریکارڈ پر آگئی کہ یہ کون لڑکی ہے جو دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں۔۔۔
فون نہیں سنتی۔۔۔ میسج کا جواب نہیں دیتی۔۔۔ ہے کیا یہ لڑکی۔۔۔ اتنا تو وہ اس کے انداز سے سمجھ ہی چکا
تھا کہ اس بے چاری کے لیے ”امان“ پہلا تجربہ ہے۔ امان کا یہ ذاتی ریکارڈ افق جیسی لڑکی توڑ رہی تھی۔
بات وقت گزاری سے آواز کی پسندیدگی تک آئی۔۔۔ ریکارڈ سے دل لگی تک جانے لگی۔

دل لگی سے بات ذرا سنجیدہ ہوگئی۔ امان نے سوچا کہ بے چاری حد سے زیادہ شریف ہے اور غلط کو
غلط ہی سمجھ رہی ہے، وہ غلط کو غلط سمجھنے والی اسے ٹھیک لگی۔ اتنی لمبی فہرست میں کوئی ٹھیک بھی ہونا چاہیے۔
وہ بے چین تو نہیں ہوا ہاں اتنا ضرور ہوا کہ جب اس نے سوچا کہ بھاڑ میں جائے تو سوچنے کے کچھ ہی دیر
بعد وہ پھر سے اسے میسج لکھ رہا تھا اور انتظار بھی کر رہا تھا۔

اسے لگا کہ اس کی ایک رگ اس خاموش لڑکی کے ساتھ پھڑک رہی ہے۔ اس نے ایک چھوٹا سا
ڈرامہ کیا اور اس کا جواب آگیا۔ اسے اچھا لگا۔ خوشی ہوئی۔

اسے افق پسند آگئی۔ اس نے افق کو باقی لڑکیوں سے الگ ہی رکھا۔ اس سے اپنی ذاتی باتیں شیئر
کر لیتا جو وہ کسی اور سے نہیں کرتا تھا، اسے کبھی باہر ملنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ وہ اسے اپنے دوستوں میں
بیٹھ کر ڈسکس نہیں کرتا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک آنکھ دبا کر اس کا کوئی دوست ”کیسی ہے وہ“
کہہ کر افق کے بارے میں پوچھے۔

زمانہ جدید کے لوگوں میں زمانہ قدیم کی افق پر اس کا دل آگیا۔ وہ اسے بے حد پسند تھی۔
وہ اس سے شادی کا وعدہ کر چکا تھا۔ پہلی بار صرف اسی سے کوئی وعدہ کیا تھا وہ جانتا تھا۔ افق کے
معاملے میں وہ گھائے میں نہیں رہے گا۔

اس کے جیل جانے پر بہت سی لڑکیوں نے فون کر کے اپنی پریشانی ظاہر کی، اپنی مدد پیش کی لیکن
جیل سے ضمانت پر رہا ہونے کے بعد جو آواز اس نے افق کی سنی، اس نے اسے حیران کر دیا۔ اسے اس
پر پیار آیا، وہ اسے اور اچھی لگنے لگی۔

پاپا خود ہی لاہور ڈی ایچ اے آگئے۔ اپنے دوست کی آمد کے بارے میں بتانے لگے، وہ سنتا رہا۔
”تمہارا دھیان کہیں اور ہے؟“ انہوں نے پرامانا۔

وہ سنبھل کر بیٹھا۔ ”کب آرہے ہیں انکل؟“
”وہ تو آتا جاتا رہتا ہے۔ اس بار خاندان کے ساتھ آرہا ہے۔ بہت سے لوگ اس کے انتظار میں
ہیں اس بار۔“

”ضرور ہوں گے۔“ وہ ابھی بھی متوجہ نہیں تھا۔
”تم مجھ سے اپنی بات کر لو۔۔۔ یا میری سن لو یا مجھے وقت دے دو لکھ کر کہ اس وقت بات کریں۔“
آواز سختی اور غصے سے تن گئی۔

”مجھے کرنے دیں بات۔“ وہ جان چکا تھا کہ اس دوست کے بارے میں کیوں بتایا جا رہا ہے۔
”ایک لڑکی ہے۔۔۔“ یہی سے مناسب لگاتار شروع کرنا۔

وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔ ”آگے۔۔۔؟“
اس سوال ”آگے“ نے اس کی جرأت کو پیچھے ہی کر دیا کیونکہ آگے پیچھے اور کچھ بتانے کے لیے تھا ہی نہیں۔

”افق۔۔۔ وہ مجھے پسند ہے اور بس۔“ اور یہ سب انہیں جاننا نہیں تھا۔ انہیں جو جاننا تھا وہ، وہ بتا کر شرمندہ ہی ہوگا۔

”وہ میرے کالج سے نہیں ہے۔۔۔“

”اس شہر سے تو ہے نا۔۔۔“ ان کے انداز میں گہری تاڑ تھی۔

”آپ چلیں گے میرے ساتھ۔“ اور تفصیل وہ اور کیا بتاتا۔

”ضرور چلوں گا لیکن تم جانتے ہو کہ جانے میں پہل میں نہیں کرتا۔۔۔ تم انہیں یہاں بلوا لو۔۔۔“

”وہ ایسے نہیں آسکتے۔۔۔“ بات پھر وہیں آگئی تھی۔

”پھر کیسے آسکتے ہیں وہ۔۔۔؟“

اسے لگا کہ اس کا باپ ایک اچھا وکیل صفائی بھی ہے، وکیل استغاثہ بھی اور جج بھی، اعتراضات بھی وہی اٹھائیں گے اور فیصلہ تو کرنا ہی انہیں ہے۔

وہ جھنجھلا گیا وہ جان گیا کہ پایا کیا سمجھ رہے ہیں۔ انہیں لگ رہا ہوگا کہ وہ آگے پیچھے چلتی قیمتی کاروں میں ان کے فارم ہاؤس پر آئیں گے۔ بچ ڈنر ساتھ ہوگا اور اسی دوران سب معلوم ہو جائے گا کہ کون کس کے ہم پلہ ہے۔

”ہماری کلاس کے نہیں ہیں وہ۔“

خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ پھر وہ ایسے ہنسے جیسے پہلے سے ہی جانتے تھے۔

امان کی شکل پر آنے والے تاثرات دیکھنے لائق تھے۔ وہ کئی کواٹری انگلی سے نکالتے تھے نہ ہی سیدھی سے۔ وہ پینڈے میں سوراخ کر دیتے تھے۔ پیش کے ذرا پاس رکھ دیتے اور پکھلا کر نچوڑ لیتے تھے۔

”تمہیں یاد ہوگا کہ تم ایک مسئلے میں کس بری طرح سے پھنس گئے تھے۔۔۔ وہی کار ایکسیڈنٹ

والا مسئلہ۔“

”یاد ہے۔“ حیران ہوا۔

”جانتے ہی ہو گے کہ میں نے کیسے تمہیں اس مسئلے سے نکالا۔ کس کس سے رابطے کیے میں

نے۔۔۔ یہ سب تو میں نے اپنے بیٹے کے لیے کیا۔ وہ اپنے داماد کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ اگر تم کسی

مسئلے میں پھنس جاؤ۔۔۔ تم سے کوئی قتل ہو جائے، تم جیل چلے جاؤ یا کہیں اور دھر لیے جاؤ۔۔۔ کسی دشمن

کی پکڑ میں آ جاؤ تو کسی گورنر، کرمل، جرنل، منسٹر کو فون کروا سکتے ہیں۔۔۔؟ چلو کسی چھوٹے سے ایس پی کو

ایم پی اے کو۔۔۔؟ اگر تم دیوالیہ ہو جاؤ تو کسی بینک سے تمہیں چند کروڑ کا لون دلو سکتے ہیں؟“

اس کے باپ نے تین فیکٹریاں رات سوتے میں سنے دیکھتے دیکھتے ہی نہیں لگائی تھیں۔ وہ تو

فیکٹری میں کام کرنے والے چوکیداروں پر بھی نظر رکھتے تھے۔

اس کا چہرہ اتر گیا لیکن اس نے اپنے باپ کی ہر بات کو درست مانا۔

”مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے۔“ محبت کا لفظ اس نے استعمال نہیں کیا اور اسی کا سہارا لیا جس سہارے سے اسے ہر چیز مل جایا کرتی ہے۔
 ”تمہیں کیا اچھا نہیں لگتا سن۔۔۔! چند سال پہلے تم ایک ہالی ووڈ کی ماڈل کے بارے میں بہت باتیں کرتے رہے ہو اور تم یہ دعا بھی کرتے رہے ہو کہ تم اسے ضرور حاصل کرو گے، تم نے اپنے کمرے کی دیواروں کو اس کی تصویروں سے بھر دیا تھا۔
 ”وہ بچپنا تھا۔“ اسے وہ ماڈل یاد آگئی۔

”تو یہ سب کیا ہے۔۔۔؟“
 ”میں سنجیدہ ہوں۔“ اس نے پہلو بدلا۔
 ”جیسے تم خلائی سفر پر جانے کے لیے سنجیدہ تھے۔“
 ”وہ مشکل تھا۔“ اپنے پاپا کی یادداشت پر وہ عیش عیش کر اٹھا۔
 ”یہ بھی مشکل ہے سن۔۔۔! بہت مشکل بلکہ ناممکن۔۔۔“
 ”مجھے اتفاق سے ہی شادی کرنی ہے پاپا۔۔۔! آپ مان جائیں گے تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔“
 بہت آرام سے درخواست کی۔

”فیصلہ کر چکے ہو؟“ آرام سے ہی پوچھا گیا۔
 وہ خاموش رہا۔
 ”ٹھیک ہے کرلو۔۔۔ تعلیم تو مکمل کر لی چکے ہو۔ شادی بھی کرلو۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ پھر میرا تمہارا تعلق ختم ہو جائے گا۔“
 ”پاپا پلیز۔۔۔!“
 خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا۔
 ”آغا سے مل لو۔“
 ”میں ان سے مل چکا ہوں کئی بار۔۔۔“ آغا کا تذکرہ اسے برا لگا۔
 ”پھر ملو۔“

”مار یہ مجھے پسند نہیں ہے۔“ اس کے اعصاب تن گئے۔
 ”تم اسے ایک بار پر دوپڑ کر چکے ہو۔ واپسی پر تم کافی ڈسٹرب رہے تھے اس کے انکار پر۔“ وہی کمال کی یادداشت۔

”اتفاق اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔“
 ”صرف خوب صورتی پر ہی فدا ہو گئے ہو۔۔۔ تو پھر ڈیل ڈیل کرونا۔۔۔ ڈیل فائدہ لو۔۔۔ مار یہ خوب صورت بھی ہے، آغا کی بیٹی بھی۔“ دے تالی والا انداز تھا۔
 ”پاپا!“ اس نے کچھ اور کہنا چاہا۔

”سن۔۔۔!“ انہوں نے آنکھوں کو گہرا زاویہ دیا اور آواز میں تحفہ اور تہیہ بھری۔ ”اگر میں تمہیں کسی جھوٹے مقدمے میں جیل کروادوں تو تم یا کوئی کیا کرے گا۔۔۔ باہر آ جاؤ گے۔۔۔ شادی کر لو گے

پھر اس لڑکی سے۔۔۔ تو سن۔۔۔ اپنی پشت پر ایک ہاتھ ایسا ضرور رکھو، جو وقت پڑنے پر تھپکی بھی دے اور ہاتھ بڑھا کر گڑھے سے بھی نکال لے۔۔۔ یہ ہاتھ تمہیں خود بنانا ہے۔“
اپنے باپ کے دلائل کے سامنے وہ ابھی بچہ تھا۔

”تمہارے جیسے لڑکوں کی پسند، محبت، عشق سے میں خوب واقف ہوں، چند دن پہاڑوں پر چڑھتے ہیں پھر سمندروں سے عشق کرنے لگتے ہیں، پھر غاروں میں جا چھپتے ہیں، چند دن جنگل جنگل۔۔۔ پھر شہر شہر، گاؤں، گاؤں، تم ایک جنس ہو اور کئی دوسری جنسوں میں حلوں کرتے ہو، جڑتے ہو ٹوٹتے ہو اور پھر واپس خود میں آ جاتے ہو۔۔۔ تو میں تمہارا باپ ہوں۔ خود میں جھانک کر دیکھو۔ تم چاہتے کیا ہو۔۔۔ کیا صرف وہ لڑکی، ہر چیز، ہر رتبے سے بالا تر صرف وہ لڑکی۔۔۔؟ وہ لڑکی تمہیں پسند ہے، ہمیشہ رہے گی، یہ جانتے بھی ہو کہ نہیں۔۔۔“ کندھے پر تھپکی دے کر وہ چلے گئے۔

زبردستی کے وہ قائل نہیں تھے ہاں ترکیب عمل کے بہت بڑے مداح تھے۔ اگلے ہی ہفتے اسے ساتھ لے کر امریکا آگئے کہ انہیں شرمندہ نہ کروائے اور آغا سے صرف مل لے پھر بے شک انکار کر دے۔

آغا ان کے دوست تھے لیکن دولت نے ان میں چار پانچ بڑی یادہ ہی لگا دیے تھے اسی لیے ان کی پرواز سب میں اونچی تھی، دوستی میں چھپے ہوئے گہرے عناد اور بغض کو غلام علی ہی نبھاتے تھے، کسی اور طرح تو آغا کی دولت ہاتھ آتی نظر نہیں آری تھی انہوں نے بہت بار کوشش کی کہ وہ ان کے پارٹنر بن جائیں، کئی بار امریکا بڑے بڑے منصوبے لے کر گئے لیکن وہ سگار پیٹے سنتے رہتے۔ سب سن کر آخر میں سر ہلا کر جواب دیتے۔

”ضرور کرو۔۔۔ ضرور کرو۔۔۔ بیٹ آف لک۔“

ان کی اتنی باریک بیٹ آف لک کے باوجود غلام علی نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔۔۔ کھوٹے سکے اور کھوٹے بیٹے کی طرح انہیں یقین تھا کہ یہ آغا بھی ضرور کام آئے گا۔ غلام علی کو یقین تھا کہ وہ رشتے داری پر آ رہے ہوں گے۔

ہوٹل سے یہ لوگ پہلے ان ہی کے پاس گئے۔ ماریہ نے شاید شوق شوق میں پاکستانی لباس پہنا تھا۔ سفید شیٹوں کی ٹیٹس اور سفید ہی چوڑی دار پاجامہ۔۔۔ دوپٹا ہلکا گولڈن تھا اور ستاروں جیسا جھلکا رہا تھا۔

عدن نے ہاتھ آگے کیا تو اس نے تین انگلیوں سے اس کے ہاتھ کو چھو کر ہائے کا جواب دیا۔ دوپٹا جو اس سے سنہالا نہیں جا رہا تھا وہ کبھی کندھے سے ڈھلکتا تو کبھی گردن سے۔ وہ اکٹھا کر کے گردن میں چن دیتی، پھر بھی ذرا سا ہمتی تو وہ ڈھلک کر گرنے کو آ جاتا۔ تو وہ اسی مشغلے میں مشغول تھی۔

عدن ٹھیک آٹھ سال بعد اسے دیکھ رہا تھا اور۔۔۔ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وقت کے ساتھ لوگ بدل جاتے ہیں لیکن کیا وہ وقت کے ساتھ ساتھ اور سے اور خوب صورت ہوتے جاتے ہیں۔ ایک بار خوب صورت پیدا ہونے والے پھر بس کیوں نہیں کرتے۔ مصری حسناؤں کی فرعونیت سی ادا لیے وہ لا تعلق سی ایک طرف بیٹھی تھی۔

عدن کی بہن شائل نے اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی مگر وہ چند ایک بار ہونٹ کھول کر بند کیے بیٹھی رہی، یہی کام عدن نے کیا تھا اور اس کا جواب بھی یہی ملا تھا۔

ذکر کے لیے انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ اس کے پاپا اور ماریہ کے ڈیڈ پہلے سے ہی وہاں موجود تھے، عدن کی ماما، ماریہ کی ماما سے بات کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ذکر کے لیے وہ باہر جانے لگیں تو ماریہ جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی، ابھی تو دوپٹا پھر پھسل کر ایرانی قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ عدن ذرا سا چھکا اور دوپٹے کو پکڑ لیا۔

وہ خود جھک کر اٹھانے والی نہیں تھی، وہ بنا دوپٹے کے ہی نکل جانے کے ارادے سے تھی، اتنے نخرے اس نے کبھی انسانوں کے نہیں اٹھائے تھے، کہاں ایک کپڑے کے اٹھائی۔

شیفون کے جھلمل کرتے دوپٹے کو اپنے ہاتھ میں لے کر عدن نے ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر جرایا۔۔۔ اور دو انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔

”آسمان سے اتر کر سیدھی یہیں آ رہی ہو؟“

اس نے جیسے سنا ہی نہیں، قدم بڑھاتی آگے چلے گی۔۔۔ عدن بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔۔۔ چند قدم آگے چل کر اسے خود سے دو قدم پیچھے محسوس کر کے اس نے گردن موڑی۔

”ابھی تک ویسے ہی ہو۔“

عدن نے اپنا جاندار قبضہ اس کی پشت پر چھوڑا۔ جب وہ انیس سال کا تھا تو تیسری بار امریکا ان کے پاس گیا تھا۔ پہلی بار وہ صرف چھ سال کا تھا دوسری بار صرف نو سال کا اور تیسری بار میں نئے نئے جوش اور نت نئے خیالات سے بھر اٹھیں سالہ عدن تھا۔ پاپا تو آتے جاتے رہتے تھے لیکن وہ صرف تین بار ہی گیا۔

پاپا نے اس سے بار بار کہا تھا کہ وہ ماریہ سے دوستی کر لے۔۔۔ اس کے ساتھ گھومے پھرے۔۔۔ اس کے دوستوں سے ملے۔۔۔ لیکن ماریہ کا ذکر اتنی بار سننے کے باوجود وہ اس بات کے لیے بالکل بھی راضی نہیں تھا۔

وہ اپنی مرضی سے بولتا تھا، دوست بناتا تھا اور لڑکی نام کی چیز کو اس نے اب تک صرف زچ ہی کیا تھا۔ ماریہ کے ساتھ بھی وہ یہی سب کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن ہوا کچھ یوں کہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس نے گھنٹوں تک اسکرٹ، لاٹک شوز اور لمبے بالوں کی پونی ٹیل میں ایک حورا سپورٹس کار میں بیٹھتے دیکھ لی اور کھڑے کھڑے ہی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صرف اسی سے شادی کرے گا بلکہ ساتھ ہی لے کر جائے گا۔

دودن سے یہ لوگ ان کے یہاں تھے لیکن ماریہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ماما نے بتایا تھا کہ وہ کسی ایجنسی کے ساتھ پیرس ماڈلنگ کے لیے گئی ہے۔

ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے لیے جانے کے بجائے وہ سارا دن ماریہ کا گھر میں ہی انتظار کرتا رہا۔ لچ ہو گیا، ذکر ہو گیا، رات گہری ہو گئی لیکن وہ نہیں آئی، انتظار کرتے کرتے وہ کھڑکی کے پاس ہی کرسی پر اونگھنے لگا۔

کار کے تار چر چر جانے کی آواز پر وہ جاگا جب تک گردن نکال کر دیکھا۔ اس کی پشت ہی نظر آئی، چڑ کر عدن بیڈ پر جا سویا، شادی کا ارادہ کر کے وہ اسے اپنے بیوی ہی سمجھ بیٹھا تھا اور اس کی بیوی اتنی دیر سے گھر آئی تھی، رات دیر تک جاگنے کے باوجود وہ صبح جلدی اٹھا کہ وہ پھر نہ چلی جائے، لیکن وہ دیر تک سوئی رہی، سچ ٹائم پر ناٹا کیا۔

”ہائے“ وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ نامناسب سالباں پہنا تھا، شیشے کی میز پر ٹانگیں رکھی تھیں اور ان ہی ٹانگوں کی سیدھ میں کاؤچ پر وہ آکر بیٹھا تھا۔

”ادوہائے!“ اس نے ہاتھ آگے کیا۔ ”کیسے ہو۔۔۔ کب آئے؟“

”ایک ہفتے سے یہاں ہوں۔“ اس نے جیسے شکوہ کیا۔

”گڈ۔۔۔ دیکھ لیا امریکا؟“ ہر پاکستانی کو امریکا میں ایسے سوالات سے ہی کیوں نوازا جاتا ہے۔

”میں امریکا دیکھنے نہیں آیا۔“

”تو۔۔۔؟“ براؤن بریڈ کا پیس اس نے ادا سے کترا۔

”اکیلے کیسے دیکھ لوں۔۔۔“ اسے نئی ترکیب سوجھی۔

”تمہارے مام ڈیڈ بھی تو آئے ہیں۔“ فریش جوس کا گھونٹ لیا۔

”اگر تم پاکستان آؤ تو میں تمہیں خود سارا پاکستان گھماؤں۔“

”وہ ہنسی۔ جوس کا ایک گھونٹ لیا۔“ پاکستان گھومنا کون چاہتا ہے۔“

پاکستان سے تو عدن کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بے عزتی اسے اپنی آفر کے ایسے مذاق اڑائے جانے پر ہوئی۔

گلاس میز پر رکھ کر وہ اٹھ کر چلی گئی، عدن منہ دیکھتا رہ گیا۔

اگلے تین دن وہ اس کا منہ دیکھنے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ رات گئے آتی، صبح سویرے ہی چلی جاتی۔ یہاں سے اس نے پوچھا تو مام نے بتایا کہ آج کل ریہرسل چل رہی ہیں۔ پتالے کروہ اسٹوڈیو ہی آگیا۔ کسی کمرشل کے لیے ریہرسل کی جا رہی تھی، سو کے قریب لوگ تھے، عدن نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا۔۔۔ اسے دیکھ کر وہ صرف مسکرائی اور اپنا کام کرتی رہی۔ ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔

عدن سچ ٹائم کا انتظار کرنے لگا۔۔۔ سچ ٹائم آیا۔۔۔ نیل ہوئی اور وہ ایک لڑکے کے ساتھ ایک طرف چلی گئی۔ وہ ایک طرف کرسی پر ہی بیٹھا رہا۔ دوبارہ جب وہ نظر آئی تو سچ بریک ختم ہو چکا تھا۔۔۔ درمیان میں اس نے ایک بار اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور ادب کر باہر آگیا۔ اگلے دن اس سے ملاقات ہوئی تھی تو جیسے اسے یاد ہی نہیں تھا کہ وہ اسٹوڈیو آیا تھا۔

”سچ کے لیے چلیں مارے!“ اس سے پہلے کہ وہ پھر نکل جائے اس نے اسے دیکھتے ہی آفر کی۔

اس نے صرف ہونٹ سیٹھے یعنی نہیں۔

”ڈنر کے لیے؟“ اس بار اس نے سر بھی ہنسی میں ہلا دیا۔

”کیوں؟“ غصہ دبا کر وہ بولا۔ عدن کو انکار کیا جا رہا تھا۔

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”میں شوٹنگ پر جا رہی ہوں۔۔۔ تم چاہو تو ساتھ آ جاؤ۔“
 وہ جانتا تھا ساتھ لے جا کر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔
 ”اپنے مہمان کے ساتھ تمہیں ایک دقت کا کھانا تو کھانا ہی چاہیے۔“
 ”تم میرے مہمان نہیں ہو۔“ اس نے بات ہی ختم کر دی۔ ماریہ کے ہاتھوں پہلا تھپڑ عدن کے گال پر آگیا۔

”تمہارا مہمان نہیں ہوں دوست تو بن سکتا ہوں نا؟“ تھپڑ کھا کر بھی عدن نے ہمت نہیں ہاری۔
 اس نے ردِ عمل میں ایک ابرو اچکا لی، اسے دیکھا اور اٹھ کر چلی گئی۔ چونکہ وہ اسے شادی کر کے اپنے ساتھ لے جانے کا اپکا ارادہ کر ہی چکا تھا سو اسے انگریزی القابات سے نہیں نواز سکا، خاموشی سے اس کی ادا کو پی گیا، یعنی کہ وہ جانتی ہے کہ وہ کس قدر خوب صورت ہے، اسی لیے ایسی ادائیں سکھ لی ہیں۔
 چند دنوں بعد وہ اسے لان میں بیٹھی مل گئی۔
 ”کیسا ہاشوٹ؟“ اس کے پسندیدہ موضوع سے بات شروع کی۔
 ”وئڈر فل!“

”فارغ ہو؟“ وہ اپنی بات کی طرف آنے لگا۔
 اس نے کچھ دیر سوچا۔ ”تقریباً۔“
 ”باہر چلیں۔۔۔“ اس کا جی چاہا کہ اجازت چھوڑے۔ اسے اٹھا کر گاڑی میں بٹھائے اور نکل جائے۔

”ٹھیک ہے چلو۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں نے ایک ساتھ سینما میں مووی دیکھی اور کافی پینے کے لیے ایک اوپن ریستورنٹ میں آ گئے۔
 ”تم ایسے ہی سب کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہو؟“ بے حد رومانٹک ماحول میں سنجیدگی سے کی گئی یہ بات عدن کو اچھی نہیں لگی لیکن وہ اپنا موڈ خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔
 ”سب کو نہیں، صرف تمہیں۔“ عدن نے بہت پیار سے کہا۔
 اس نے سارس سی بمبی گردن کو ادا سے ہلکا سا خم دیا اور کرسی کی پشت سے لگ کر دائیں ہاتھ کو دائیں گال پر رکھ کر اسے دیکھا۔ وہ الفاظ سے ہی طنز کرنا نہیں جانتی تھی۔
 ”میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟“ وہ اصل بات کی طرف آنے لگا۔
 ”جیسے تم ہو۔۔۔“ کافی پیتے جواب دیا۔

”کیسا ہوں میں۔۔۔؟“ اس کا دل لڑکیوں کی طرح دھڑک رہا تھا۔
 ”دم کہاں ہے تمہاری۔۔۔؟“ سر کو ذرا سا جھکا کر پیچھے اس کی طرف دیکھنے کی اداکاری کی، نئے نئے محبت کے غبارے سے بھرے عدن کے ایک اور چائنا آکر لگا۔

”کیا مطلب؟“ یہ سوال اس نے اس لیے کیا کہ شاید وہ مطلب نہ ہو، جو وہ سمجھ رہا ہے۔ اس نے کندھے اچکائے اور کافی کا لگ اٹھا کر منہ سے لگالیا جیسے سنا ہی نہیں، اس نے کچھ پوچھا ہی نہیں۔
 اتنے دنوں سے عدن بہت جوتوڑ کر چکا تھا۔ اگر وہ بے حد خوب صورت تھی تو وہ بھی کم نہیں تھا۔

اگر وہ مس یونیورس تھی تو وہ مسٹر پاکستان تو ضرور ہی تھا۔

ایک پوائنٹ یہ ہوا۔۔۔ دونوں کے والد آپس میں دوست ہیں، دوسرا پوائنٹ۔۔۔ دونوں اس رشتے پر خوش ہوں گے، تیسرا پوائنٹ اور سب سے اہم پوائنٹ کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرے گا، امریکیوں کی طرح نہیں کہ چند دنوں میں چھوڑ جائے۔

امریکا جیسے دھوکے باز معاشرے میں عدنان جیسے ہیرے کو تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔۔۔ یہ پوائنٹ زبردست تھا۔۔۔ بیٹھے بٹھائے اس نے اپنے اندر بے تحاشاں خوبیاں کھوج لیں۔۔۔ اور اسے اپنی ذات اعلا وار فخر نظر آنے لگی، دنیا کا ہر شخص ماریہ کے لیے بے کار اور ناکارہ نظر آنے لگا اور ماریہ اسے اپنی محبت کا دم بھرتی نظر آئی۔

”تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔“ اس نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

کافی کالگ اس نے سامنے میز پر رکھا اور دونوں ہاتھ پیٹ کی طرف باندھ لیے۔ ”ریٹلی؟“ اس کی ہمت بندھی اور اثبات میں سر ہلایا۔

”اتنی اچھی کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔“ اپنی طرف سے اس نے دھماکا کیا۔
”گدا! وہ اسی انداز سے بیٹھی رہی۔

”تم سے محبت کرتا ہوں ڈیر!“ دوبارہ اس لیے کہا کہ اسے اچھی طرح بتا دے کہ یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ ایشیا کے مرد کی محبت بہت بڑی چیز ہے۔
”مجھ سے تو ہر دوسرا لڑکا محبت کرتا ہے۔“

”مجھ میں اور ان میں فرق ہے۔“ اب وہ دلائل پر آیا۔

”کیا فرق ہے؟“ اب وہ دلائل لینا چاہتی تھی۔

”میں سچی محبت کرتا ہوں۔“ اسے صرف یہی بات سمجھ میں آئی کہنے کے لیے۔
”سچی محبت کسے کہتے ہیں؟“

”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اسے یہی جواب مناسب لگا۔

”میں تم سے شادی کیوں کروں؟“

”کیونکہ میں تمہارے لیے پرفیکٹ ہوں۔“ گردن کو اٹھا کر فخر سے کہا۔

وہ اتنی زور سے ہنسی کہ اس پاس کی میزوں پر بیٹھے لوگ گردنیں موڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

”آج رات میرے ساتھ چلو گے؟ میرے فرینڈز نے ایک پارٹی دی ہے۔“ سارس کی لمبی گردن

تن گئی۔ اتنی ہی بات پر وہ یہ سمجھا کہ وہ اسے اب سب سے ملوانا چاہتی ہے۔

”کیوں نہیں۔“ اس نے بہت جوش سے ہامی بھری۔

جس وقت وہ اس کے ساتھ پارٹی میں گیا اس کی آن بان شان کی ہوا نکل گئی۔ پارٹی اور وہاں موجود لوگ اتنے ہائی فائی اور ہائی فیشن ایبل تھے کہ ان سب میں وہ ٹاٹ کا پیوند ہی لگ رہا تھا۔ اس نے بھی براؤن ڈچیز، ہی پینی ہوئی تھیں۔ جینز، سوٹ ہینڈ بینڈز، جیل لگے کانوں سے اوپر کی طرف کھڑے بال، چمکتا دسکتا منہ، ہونٹوں پر بلاسٹڈ پنک لپ اسٹک، یہاں آنے سے پہلے گھنٹہ تو اس نے ہاتھ روم میں

ہی گزارا تھا، اگلا ایک گھنٹہ ڈرینک روم میں۔۔۔ پھر۔۔۔ پھر یہ سب کیا ہو گیا؟
وہ سب وہاں ہالی ووڈ کی فلموں کے ہیرو، ہیروئن لگ رہے تھے۔ خود کو مسٹر پاکستان سمجھنے والا
صرف ”مسٹر“ بھی نہیں لگ رہا تھا۔

جس پہلے لڑکے سے ماریہ نے اسے ملوایا اس نے پیلے رنگ کی اسکن ٹائٹ پینٹ پہن رکھی تھی۔
سفید ملل کی طرز کے کپڑے کی شرٹ جو پیچھے گھٹنوں سے اوپر تھی اور آگے سے پیٹ تک۔۔۔ اور جب
وہ حرکت کرتا تو وہ ذرا سا پیٹ پر سے اوپر اٹھ جاتی۔

ہیئر اسٹائل فنی تھا، شوز سرخ تھے۔ گلے میں رسیاں سی پہن رکھی تھیں۔ اس سب اٹلے پٹلے میں وہ
بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ ہر لڑکی، لڑکا اپنی جگہ پر ایک الگ براؤن بنا کھوم رہا تھا۔ سب کے اسٹائلز
مختلف تھے۔ کچھ کے عجیب تھے، کچھ کے عجیب تر اور اس سب میں ایک ہی چیز مشترک تھی کہ وہ سب نیلی،
سبز، جمہوری آنکھوں والے ایک سے بڑھ کر ایک شان دار لگ رہے تھے۔

اس کے چہرے پر در آنے والے تاثرات کو ماریہ نے طنزیہ نظروں سے دیکھا، جیسے پوچھا۔
”کیا واقعی تم میرے لیے پرفیکٹ ہو؟“

اس نے بھی اس کی نظریں پڑھ لیں۔ ”یکھ جاؤں گا یہ سب بھی۔“
کچھ دیر تو ماریہ اس کے ساتھ رہی، پھر غائب ہو گئی۔ وہ اکیلا ہی ادھر ادھر اٹھتا بیٹھتا رہا۔ پارٹی
فائیو اشار ہوئی کی چھت پر بھی۔ کچھ ہی دیر میں تمام روشنیاں گل کر دی گئیں۔ خوب ہو با ہوئی۔ آسمان پر
فائر ورک سے پہلے پھول بنے۔ پھر دس سے الٹی کتنی لکھی جانے لگی۔

”نائن۔۔۔ ایٹ۔۔۔ سیون۔۔۔“ سب یک زبان کان پھاڑنے لگے۔
”سکس۔۔۔ فائیو۔۔۔ فور۔۔۔“ ہر نمبر الگ رنگ سے آسمان پر جگمگاتا اور پھر پھیل کر معدوم

ہو جاتا۔

”تھری۔۔۔ ٹو۔۔۔ ون۔۔۔“

”اف! اتنا شور۔“ عدن نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ ”ون“ کے ساتھ ہی ڈانس فلور کی
لائٹس روشن ہوئیں۔ صرف وہ ڈانس فلور سے ذرا ہی دور تھا۔ اس کا فلور مختلف روشنیوں سے جل بجھ رہا تھا
اور فلور کے عین اوپر لگا بڑا گلوب روشن ہو گیا۔ وہاں دس جوڑے کھڑے تھے۔ وہ مختلف پوزیشنوں میں
پوز بنائے جامد کھڑے تھے۔ لڑکیوں نے گھٹنوں تک اوپچی فرائک پہن رکھی تھی۔ اوپچی ٹیل اور ہیل بہت
اوپچی پہنی تھیں۔ فلور کی لائٹس روشن ہوتے ہی شور کچھ دیر کو تھما۔ میوزک بچنا شروع ہوا۔ میوزک کے بجتے
ہی ایک ایک کر کے ہر جوڑے نے اپنا اپنا جامد پوز توڑا اور ناچنا شروع کر دیا۔

”اوہ!“ عدن کا منہ کھل گیا۔ جوڑے بڑے گول فلور پر اس کی نظر ماریہ پر پڑی۔ وہ جس لڑکے
کے ساتھ تھی، اس کی شخصیت کے سحر کے سامنے وہ خود ہم بڑ گئی تھی۔

دو گھنٹے تک اس فلور پر ڈانس ہوتا رہا۔ ہارنے والے ساتھ ساتھ نکلتے رہے۔ دس سے چھ اور چھ
سے چار رہ گئے۔ تیسرے نمبر پر ماریہ بھی باہر آ گئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ پسینے سے کھلی ہو رہی
تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کی فرائک اس کے جسم کے ساتھ چپک گئی تھی۔ دونوں نے اتنے کمال کا ڈانس کیا تھا

کہ عدن حسد سے جل کر خاک ہو گیا۔ یہ امریکی ہر کام میں اتنے آگے کیوں ہوتے ہیں اور اتنے ہاکمال۔۔۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد ریکس نے ڈانس فلور پر مومن واک کی اور مومن واک کرتے وہ مائیکل جیکسن کا باپ لگ رہا تھا۔ ایک طرف کھڑی ماریہ جوش سے ”ہاؤ، واؤ“ کرتی رہی۔ اگر عدن اس سے اتنا حسد نہ کر رہا ہوتا تو وہ بھی تالی مارتا اور ”واؤ، واؤ“ ضرور کرتا، اس کے ایسے شان دار بے عیب ڈانس پیش کرنے پر۔۔۔

عدن کو اس کا جواب مل گیا تھا۔ وہ اسی لیے اسے پارٹی میں لائی تھی۔ اب اگر مذاق میں ہی سہی، وہ دونوں کا ڈانس مقابلہ کروا لیتی تو سب عدن کا ڈانس دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ بہت کھرے اور کمال انداز سے ماریہ نے اسے جواب دیا تھا۔ امریکن ہیرو کے سامنے تو وہ زیرو ہی تھا تا، اپنے گروپ میں وہ بے شک ہاکمال تھا۔

چند مہینے وہ ماریہ کے عشق میں گھلتا رہا۔ کبھی طیش میں آ جاتا کہ ماریہ کو ضرور مزا چکھائے گا۔ یہ اس کی پہلی بھر پور بے عزتی تھی، جو کسی نے کی تھی۔ خاص کر کسی لڑکی نے۔ وہ بھولا تو نہیں، لیکن یاد کر کے تکلیف بھی ہوتی۔ جب پایا پوچھتے۔

”ماریہ کون کیا۔۔۔ ہائے بھلو کیا اس سے؟“ تو وہ غصے میں آ جاتا۔

پھر وہ کبھی امریکا نہیں گیا۔ پایا ہی اسے لے کر جاتے تھے۔ دو سال بعد جب وہ جانے لگے اور اسے بھی ساتھ لے جانا چاہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ پھر اگلے چکروں میں انہیں بھی اندازہ ہو گیا کہ ماریہ نامی چیز ان کے ہاتھ آنے والے نہیں اور اب یہ ماریہ نامی چیز ان کے گھر آئی تھی مہمان بن کر۔۔۔ ہمیشہ کی طرح کم گوشتی۔ اپنے آپ میں ہی تھی۔ لان میں ڈنر کے دوران اس کے ڈیڈ ہی اس کی پلیٹ بھرتے رہے۔ منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر کچھ کہتے تو وہ مسکرانے لگتی۔ عدن کو محسوس ہوا کہ وہ کسی وجہ سے پریشان ہے۔ اس کے انداز سے دھماکہ خیزی غائب تھی۔ وہ جو اسے اپنے انسان اور ماریہ ہونے پر فخر تھا، آج وہ فخر اس کی ذات میں سے نہیں جھلک رہا تھا۔ اسے فخر تھا کہ اس کی ماما زبستان کی ہیں اور وہ ازبک بیوی ہے۔

”کتنی بار سرجری کروڑ چکی ہو؟“ اس نے موقع ملتے ہی اس کے کان میں سرگوشی کی۔

اس نے سوالیہ انداز لیے دیکھا۔

”اب تو شاہکار بن چکی ہو۔“

ایک دم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی اور یہ پہلی مسکراہٹ تھی، جس میں طنز اور تسخر نہیں تھا۔

”فلٹ کر رہے ہو؟“ آنکھیں ترچھی کیں۔

”آٹھ سال پہلے ایسا صدمہ ملا تھا کہ اس قابل بھی نہ رہا۔“ ماریہ کی آنکھوں میں سوچ سی در آئی۔

جیسے وہ یاد کرنا چاہ رہی تھی کہ اس نے کیا کیا تھا۔

”تو وہ صدمہ تھا؟“

”صدمے سے بڑھ کر۔“ اسے دیکھتے ہی سب کچھ عدن کی زبان سے نکلتا ہی چلا گیا۔ اس نے

خود کو نہیں روکا۔

ماضی کا ہی سہی ریکارڈ کو خراب نہیں ہونے دینا چاہیے۔ ایک بار وہ اس میں مبتلا ہوا تھا۔ ایک بار تو ماریہ کو بھی اس میں مبتلا ہونا چاہیے تھا۔

”اوکے۔۔۔ میں جانا چاہوں گی، کیا تھا وہ؟“

”بتانے کے لیے تو مجھے ساری عمر چاہیے۔۔۔ ہے تمہارے پاس اتنا وقت؟ ساتھ ساتھ بتاتا جاؤں گا۔“

وہ اتنی زور سے ہنسی کہ گردن موڑ کر اس کی مام اور ڈیڈ نے اسے دیکھا اور یہی کام عدن کے ماما، پاپا نے کیا۔ غلام علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ منظر بے حد حسین لگا انہیں اور اس منظر سے بننا پس منظر بھی۔

”کمال ہو جائے گا۔“ دل میں سوچا۔ ”کمال ہی ہو جائے گا۔“

ڈنر کے بعد ان کے اصرار کے باوجود وہ ان کے گھر نہیں رکے۔ اگلے دن عدن ہوٹل چلا گیا۔ ماریہ کو لے کر مختلف جگہیں گھمائیں اور وہ ساتھ ساتھ رہی۔ ہنس بھی دیتی تھی۔ بول لیتی تھی۔ چند دن وہ اسے ایسے ہی لیے گھومتا رہا۔ دو بار اس کے مام ڈیڈ پھر ان کے گھر آ گئے۔ عدن سے بھی لمبی باتیں کیں۔ ادھر ادھر کے کئی سوال پوچھے۔

”اب آگے کیا کرو گے؟“ انداز ایسا تھا کہ کتنے پانی میں ہومیاں؟“

”اپنا اسپتال بناؤں گا۔ اسی کے لیے پلاننگ کر رہا ہوں۔“

”سرجن نہیں بننا؟“

”اس کے بارے میں چند سال بعد سوچوں گا۔“

”یعنی ابھی پیسے بنانا چاہتے ہو۔ اپنے باپ پر گئے ہو۔“ عدن کو برا تو لگا۔ لیکن ان کے مقام

(دولت کے مقام) کو دیکھ کر خاموش ہی رہا۔

”شادی کے لیے کیا پلاننگ کی ہے؟“

”کوئی نہ کوئی تو مجھے پسند کر ہی لے گا۔“ بہت بھونڈے انداز سے انکساری دکھائی گئی۔

”تمہاری بھی کوئی پسند ہوگی؟“ سگار کومنہ میں لیا اور تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”جوشی، اسے بتا دیا تھا۔“ آنکھوں کا زاویہ ذرا دور بیٹھی ماریہ کی طرف موڑا۔ وہ دونوں اردو میں

بات کر رہے تھے اور ماریہ اردو بہت کم سمجھتی تھی۔

انہوں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور کمال انداز سے نظریں واپس موڑیں کہ وہ جان نہ سکے

کہ وہ اس کی نظر کے تعاقب میں گئے ہیں۔

”کالج کے زمانے میں تمہارے باپ کے بہت معاشقے چلے تھے۔“ اتنا کہہ کر وہ جناتی قہقہہ لگا

کرنے۔

”اے بارے میں بتاؤ، کیا کیا، کیا کالج میں؟“ اتنا کہتے انداز سرگوشی جیسا ہو گیا۔ جیسے دو دوست

آپس میں بیٹھ کر رازداری کی باتیں کرتے ہیں۔

عدن کو اندازہ ہو گیا کہ اس انسان نے امریکا میں اسٹورز کی چین کیسے بنائی۔ نظر کی نظر پر تھی ان

کی۔

”چلو! جوانی میں سب چلتا ہے۔ کیا خیال ہے۔“ بہت عقل والے انسان تھے۔ سیدھی طرح بات بھی نہیں کر رہے تھے اور سب سیدھے جواب بھی لے رہے تھے۔
اس نے ناچار سر ہلا دیا۔ ماریہ سے متعلق اشاروں میں بھی ابھی کوئی بات نہیں کی تھی اور خود سارے اشارے اکٹھے کر رہے تھے۔

”تمہاری ایک بات مجھے پسند ہے۔ تم میں تحمل بہت ہے۔ میری اور غلام علی کی بہت پار لڑائی ہوئی۔ لڑائی بھی کیا۔۔۔ صرف میں ہی لڑا۔ لیکن غلام علی نے جی جان سے دوستی نبھائی۔“ پھر جنائی قہقہہ بلند ہوا۔ ”وہی تحمل مجھے تم میں نظر آ رہا ہے۔“

نہ جانے یہ تعریف کا کون سا انداز تھا۔ عدن خوش نہیں ہو سکا۔
اس رات وہ واپس گئے تو غلام علی غلام نے عدن کو بڑھ کر سینے سے لگالیا۔
”ڈیزرسن۔۔۔ مبارک ہو۔“

وہ سمجھا ہی نہیں۔

”تم نے کیا جادو کیا ہے آغا پر؟ وہ خود کہہ گیا ہے تمہارے اور ماریہ کے لیے۔ مجھے امید تو تھی، لیکن اس طرح کی بہت سی امیدیں وہ دلائے رکھتا ہے۔ بہت بار میں نے اسے اپنا پارٹنر بننے کے لیے کہا۔ لیکن بتا نہیں۔ اس بار۔۔۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ۔۔۔ کہہ رہا تھا امریکا میں ہی اسپتال بن جائے گا۔“

جو کچھ ہو رہا تھا، وہ عدن کے سامنے ہی تھا۔ لیکن اس اچانک خبر پر وہ بوکھلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ماریہ کبھی نہیں مانے گی۔ اب وہ کیسے مان گئی، کس وجہ سے؟
”ہو سکتا ہے انہوں نے ماریہ سے نہ پوچھا ہو۔“
”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ آغا کچے کام کرتا ہی نہیں ہے۔“

عدن بہت سی کیفیات کا ایک دم شکار ہوا۔ پہلی کیفیت حیرانی کی تھی۔ خود پر حیرانی۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ تو ماریہ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا اور اتنے سال وہ ماریہ کو ہی دوسری لڑکیوں میں ڈھونڈتا رہا ہے۔ وہی اس کی پہلی پسند اور محبت تھی۔ تھوڑی بگڑی ہوئی تھی۔ لیکن ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کے عورتوں کے لیے مقرر کیے گئے معیار سے ذرا آگے پیچھے تھی۔ لیکن اتنا تو چل ہی جاتا ہے اور پھر اس سے زیادہ نادر موقع کہاں ملے گا، ماریہ کو اپنے آگے پیچھے ٹھمانے کا، اس سے بدلہ لینے کا، اسے اپنی محبت میں مبتلا کرنے کا، شوہر بن کر اسے ہرانے کا۔

دوسری کیفیت میں اسے اتنی یاد آئی۔ آج کل وہ اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔ ایک آدھ میسج بھیج دیتا تھا۔ اتنی سے متعلق کیفیت بہت عجیب تھی۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ اتنی دراصل ماریہ کا ہی نعم البدل تھی۔ ماریہ جتنی ہی حسین، لیکن اتنی صرف حسین تھی۔ ماریہ سب کچھ تھی۔ ماریہ تو اتنا کچھ تھی کہ وہ اس کے سامنے خود کو بونا سمجھتا تھا۔ ماریہ ہی اس کی ٹکری لڑی تھی۔ ایک ایسی لڑکی، جسے دھکا دے کر یہ نہ کہا جاسکے کہ ”جاؤ! مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔“ جس کا فون نہ اٹھایا جائے۔ ایک ایسی لڑکی نہیں جو روٹی

ہے، رلاتی ہے۔

کھڑے کھڑے عدن، ماریہ اور افق کو اوپر نیچے کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ زندگی کا مزا ایک ایسی ہی لڑکی کے ساتھ ہے جو غلطی بھی کرے، ناراض بھی خود ہی ہو جائے اور کان پکڑ کر ”سوری“ بھی کہلوائے۔ ایسے نہیں کہ وہ خود ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگے۔

عدن بہت ذہین تھا۔ ایسے ہی نہیں وہ دونوں میں ایک کتاب ہضم کر کے ٹاپ کر جاتا تھا تبدیلی کو پسند کرتا تھا۔ خاص کر کسی کو جواب دہ نہیں تھا۔ اس نے بہت سی لڑکیوں سے دوستی کی تھی اور سب ہی اچھی تھیں، لیکن افق ان سب میں اچھی تھی اور اچھے زندگی کے ضامن نہیں ہوتے۔ وہ اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ بڑے لوگ انہیں روند کر ان کی لاشوں پر اپنے محل بنا لیتے ہیں۔ تو ایسے روندے جانے والوں کے ساتھ کون زندگی گزارے۔

غلام علی غلام نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ وہ اپنا باپ خود نہیں ہے۔ وہ اپنے خون کو جانتے تھے۔ جس محبت، محبت کی رٹ اس نے لگائی تھی۔ ایسی رٹ تو وہ آئندہ زندگی میں بھی بہت بار لگائے گا۔ محبت تو اسے بہت بار ہوگی۔ ہر محبت کو وہ حاصل کرنا چاہے گا اور ہر محبت کو بھول بھی جائے گا۔ یہ محبتیں ساحل پر قدموں کے نشانات سے بھی کم دیتی اور کمتر ہوتی ہیں۔ بظاہر پاؤں ریت میں بری طرح سے دھنس کر پورا مکمل نشان بناتے ہیں۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ سمندر کی ایک معمولی لہر اس معمولی نشان کو اس کی اوقات دکھا جاتی ہے۔

وہ ماریہ کو ڈنر کے لیے گیا اور جس وقت وہ ماریہ کو انگوشی پہنارہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت افق روتی ہوئی گھر سے باہر نکلتی۔

”بھابھی جی!“ دھاڑے ان کا دروازہ کھول کر وہ چلائی۔ وہ سب رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ ”بھابھی جی۔۔۔ اماں۔۔۔“ ننگے پاؤں بنا دوپٹے کے وہ کھڑی تھی۔ وہ سب غور آٹھے۔ اس کے ساتھ لپکے۔ اماں کچن میں چو لہے کے پاس بے ہوش پڑی تھیں۔ افق زار و قطار رو رہی تھی۔



بھابھی کے ساتھ جا کر اماں نے سرکاری اسپتال سے ٹیسٹ کروائے تھے، ٹیسٹ ٹھیک نہیں تھے یا انہیں کرنے اور پڑھنے والے ڈاکٹر، سرکاری اسپتال سے ہی انہیں دوائیں مل گئیں، وہ کھاتی رہیں، درد پھر بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ جیسے تیسے اسکول چلی جاتیں۔ آکر سو جاتیں، نہ ظاہر کرتیں نہ ہی بتاتیں کہ کتنا درد ہے، بس دوا کھا لیتیں۔ درد کو چھپائے رکھتیں۔

”ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ ابھی ہو جائے گا۔“ کرتے کرتے انہیں باورچی خانے میں چو لہے کے پاس پہلا ہارٹ ایک ہوا۔ انہیں اٹھا کر اسپتال لے جانے تک دوسرا ہوا۔ جمال اور اسد پریس گئے تھے۔ افق ہاتھ پیر ملسکتی رہی۔ بھابھی گود میں سر رکھے بیٹھی رہیں۔ جھاگ سی ان کے منہ سے نکلنے لگی۔ بے جان کی ہو گئیں۔

”اماں۔۔۔!“ وہ پاگلوں کی طرح انہیں پکار رہی تھی۔

اور اس وقت اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں آگ کیسے نکلتی ہے۔ جسم سے جان کیسے نکلتی ہے۔ بے سہارا

رہ جانے کا اصل مطلب کیا ہے۔ قیامت کسے کہتے ہیں۔
ایمر جنسی میں تیسرا ایک ہونے سے ڈاکٹر نے انہیں بچالیا۔ بھابھی کے شوہر اور ان کے سر
ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ وہ بچپیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ بھابھی
خود حالات کے پیش نظر بری خبر کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔

دودن اماں ایمر جنسی میں رہیں۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کھری کھری سنار ہاتھا۔
”جب مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو لے آتے ہیں۔ تیسرے ایک سے کیسے ہم نے بچایا ہے۔
ہم ہی جانتے ہیں۔ ابھی بھی ان کی حالت بہت پیچیدہ ہے۔ نہ معلوم کن ڈاکٹروں کے پاس ان کا علاج
ہوتا رہا ہے۔“

بھابھی اور ان کے شوہر ہر جھکائے سنتے رہے۔ ماموں کو فون کر دیا تھا۔ وہ ایک، دودن میں آنے
کا کہہ رہے تھے۔ چچا دو گھنٹے گزار کر جا چکے تھے۔ اکلوتی پھوپھی ملتان میں رہتی تھیں۔ فون کر کے انہوں
نے بھی حال چال پوچھ لیا تھا۔ جمال اور اسد کو بھابھی نے ناشتا کرا دیا اور اس کے لیے بھی بنا کر ان کے
ہاتھ اسپتال بھیج دیا۔ دوپہر کے بعد بھابھی بھی آ جاتیں۔ شام کو ان کے شوہر آ جاتے۔ ڈاکٹر سے بات
کرتے۔ ضروری دوائیاں لادیتے۔ اسد اور جمال کے پرلے کے مالک نے پیسوں سے کچھ امداد کی
تھی۔ وہی پیسے استعمال میں آ رہے تھے۔ تین دن سے وہ بہن، بھائی سبہ سبہ آنے والے وقت سے
ڈرتے رہے کہ اب کیا ہو۔۔۔ اب کیا ہو جائے۔ ان کی پیاری صورتیں مرجھا گئیں۔ ان کی اماں
ایمر جنسی میں تھیں۔ زندگی اور موت کے درمیان۔ زندگی کو جھیلنے کے لیے وہ تین اکیلے تھے۔۔۔ کم تھے۔
اسد اور جمال اپنی ماں کے ہمت اور حوصلے کے سکھائے سارے سبق بھول گئے اور افق کے سینے
سے لگ کر خوب روئے۔ بار بار اس سے پوچھتے۔

”اماں ٹھیک ہو جائیں گی نا۔۔۔ باجی! ہٹاؤ نا، کب ٹھیک ہوں گی؟“

باجی خود سر ہلا کر رو رہی تھی۔ ان تین دنوں میں اس نے بار بار اپنے سر پر آسمان گرتے دیکھا۔ خود
کو بھرے بازار میں بے یار و مددگار کھڑے دیکھا۔ جنگل میں گم ہوتے دیکھا۔ اس پر دکھ کا ہر احساس ہو
ہو کر گزرا۔ ہر احساس نے اسے پٹخ پٹخ مارا۔ ڈر کے مارے اس کا اپنا دم نکل گیا۔ اس نے دل سے یہ
خواہش کی کہ کاش! اپنی ماں کی جگہ بروہ ہوتی۔ تین دن اور تین راتیں وہ احساسات کے لمبے لمبے سفروں
سے ہو کر آئی۔ دعائیں مانگتی رہی۔ گڑ گڑاتی رہی۔

آس پاس کے چند دور و نزدیک کے رشتے دار آ کر دیکھ کر چلے گئے۔ اماں کے اسکول کی پرلپل
آئیں۔ اسٹاف آیا۔ ان سب کے اس طرح آنے پر افق اور ڈر گئی۔ تین دن بعد اماں کو دارڈ میں شفٹ
کر دیا گیا۔ ایک ہفتے بعد وہ گھر آ گئیں۔ ان سمیت گھر میں سب کو چپ لگ گئی۔
ماموں فیصل آباد سے ایک اور بار ہو کر چلے گئے۔ اس کا جی چاہا کہ ماموں کے قدموں میں
گر جائے۔

”خدا ارہماری مدد کیجیے۔ ڈاکٹر نے اتنی خطرناک باتیں کی ہیں اور نہیں تو آپ زیادہ پڑھے لکھے
ہیں۔ چل کر ڈاکٹر کی بات اچھی طرح سے سمجھ لیں وہ تو نہ جانے کیا، کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا واقعی سچ کہہ

رہے ہیں؟“ اتنے سوال تھے افق کے پاس۔ اس نے چند ایک پوچھے۔ ماموں نے اسے اچھے سے تلی دے دی۔



”کچھ بنا افق؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ سر پھر گھٹنوں میں دے لیا۔

”ماموں کیا کہتے ہیں؟“

”وہ کہتے ہیں۔ علاج سے اچھا پرہیز ہے۔ اچھی خوراک کھائیں، دوا لیں، ورزش کریں، ڈاکٹروں کی تو عادت ہوتی ہے بکواس کرنے کی۔“ وہ ورٹے ہوئے انداز میں بولی۔

”اور چچا۔۔؟ انہیں بلاؤ یہاں۔“

”انہوں نے کہا کہ پیسوں کا انتظام ہو جائے تو میں انہیں یہاں بلا لوں۔ وہ ان کے ساتھ چلے جائیں گے۔“

”اب کیا ہوگا افق!“ وہ بے چاری بہت گھبراہٹ اور پریشان تھیں۔ افق کی ماں، اپنی منہ بولی خالہ کے لیے۔

افق ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ وہ پھر رونے لگی۔

”بھابھی جی! کچھ کر دیں۔ میری اماں کو۔۔۔ کچھ ہونہ جائے۔“

بھابھی بے چاری خود سفید پوش گھرانے سے تھیں۔ اس سب کے دوران ان کے بھی چند ہزار لگ گئے تھے۔ مزید اور بھی چند ہزار ہی دے سکتی تھیں۔ انہوں نے ہی اپنے بھائی سے اسلام آباد بات کی۔ وہ وہاں سی ایم ایچ میں ملازم تھا۔ اس نے اپنے بی ہاف پر تھوڑے بہت ڈسکاؤنٹ کی بات کی۔ لیکن اس سب پر بھی انہیں باقی پاس سرجری کے لیے کافی پیسے چاہیے تھے۔ ڈاکٹر نے صاف صاف کہا تھا کہ اگر مریض کو مارنا ہے تو انتظار کرو، چند ماہ ہی لگیں گے۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو فوراً باقی پاس کروالو۔ یہ بات بھابھی کے شوہر نے اپنے گھر بلا کی کی تھی۔ رپورٹس ان کے پاس تھیں۔ انہوں نے اسلام آباد اپنے سالے سے بھی بات کر لی تھی۔ وہ جتنی مدد کر سکتا تھا، کرنے کے لیے تیار تھا۔ اپنے گھر رکھنے، خدمت کرنے، باقی بھاگ دوڑ کرنے کے لیے تیار تھا۔

باقی مسئلہ صرف پیسہ تھا۔ اسکول کی میڈم اور اسٹاف پہلے ہی پندرہ ہزار دے چکے تھے۔ اماں کا علاج ایک نیم سرکاری اسپتال سے ہوا تھا۔ بہت سے اخراجات انہیں خود اٹھانے پڑے تھے۔ اسد اور جمال بیس ہزار اور لے آئے تھے اپنے استاد سے۔ ان کے خود کے پاس تو صرف تین ہزار روپے تھے۔ اب کوئی ایسا شخص نہیں بچا تھا، جس سے وہ پیسے لے سکتے تھے۔

افق اسکول کی میڈم کے پاس ہی گئی۔ انہوں نے دس ہزار اور دے دیے تھے۔ جو مدد کرنے والے تھے وہ پیچھے نہیں ہٹ رہے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کی اپنی چادریں محدود تھیں اور جن کی محدود نہیں تھیں، وہ مدد کرنے والے نہیں تھے۔ ان کے پاس سونے کے نام پر ایک چھلکا بھی نہیں تھا کہ بیچ

دیتے۔ گھر کا محمد و سامان تھا۔ محدود تعلقات تھے اور بس۔ اماں بستر کی ہو کر رہ گئیں۔ ایک ایک روپیہ بچانے کے لیے وہ تین بہن، بھائی ایک ہی وقت کی روٹی پر آ گئے۔ وہ بھوکے بھی رہ سکتے تھے۔ انہیں اپنی جان سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ پیٹ تو بالکل بھی نہیں تھا۔ اماں کے لیے ڈاکٹر نے ایک چارٹ دیا تھا خوراک کا۔۔۔ انہیں ہر صورت وہی دینا تھا۔ رات گئے اماں سو جاتیں تو تینوں بہن بھائی باورچی خانہ میں بیٹھ کر چپکے چپکے باتیں کرتے۔ ”افق باجی! کچھ کرنا۔“ جمال کو ڈاکٹر کی بات پر بڑا یقین تھا۔ اس نے چند مہینے ہی کہا ہے تو ایسا ہی ہوگا۔

محبت اور پناہ کے نام کے اکلوتے سہارے کے بارے میں اگر کوئی ایسی پیش گوئی کر دے تو کیا ہوتا ہے۔ بہت کچھ ہوتا ہے بس وہ نظر نہیں آتا۔ جن پر سے ہو کر گزرتا ہے۔ انہیں ہی معلوم ہوتا ہے۔ ”میں دعا کرتی ہوں۔“ تسلی کے نام پر اس کے بس یہی الفاظ تھے۔ ”وہ تو میں بھی کرتا ہوں۔“ اسد بولا۔

وہ تینوں ایسے نظر آتے تھے جیسے تینوں کا بالٹی بالٹی بھر خون نکال کر بہا دیا گیا ہو۔ ”جاؤ! سو جاؤ تم۔۔۔“

”مجھے ڈر لگا ہے افق باجی!“ انارکلی کی سنسان سڑکوں اور گلیوں سے رات گئے اکیلے آنے والے کو اب ڈر لگ رہا تھا۔

”مجھے بھی لگتا ہے۔“ جمال بھی بولا۔

”مجھے بھی۔۔۔“ افق نے سوچا۔۔۔ بولی نہیں۔

وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ اب وہ بار بار اٹھ کر اماں کو دیکھیں گے کہ ان کی سانسیں چل رہی ہیں نا۔ وہ کچن میں ہی چوکی پر بیٹھی رہ گئی۔ فون اس کی گود میں تھا۔ اس نے عدن کا نمبر پھر سے ملایا۔ فون بند جارہا تھا۔ جب اماں ایمر جنسی میں تھیں تو تین دن بعد اس نے فون کیا تھا۔ فون تب بھی بندی ملا تھا۔ فون اس سے ایک ہفتہ پہلے سے ہی بندل رہا تھا۔ اس سے پہلے اس کے ایک، دو میسجز آ گئے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ ”وہ آج کل بہت مصروف ہے اور نہ جانے کب تک فارغ ہو، وہ خود رابطہ کرے گا۔“

جس وقت افق باورچی خانے میں بیٹھی تھی اس وقت تک وہ اپنے نکاح سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کی چند دوسری دوست لڑکیوں تک اس کی شادی کی خبر پہنچی تو وہ اسے فون پر فون کرنے لگیں۔ یہ وہ چند لڑکیاں تھیں جن کا خیال تھا کہ وہ ان سے شادی کرے گا۔ وہ اسے اپنی فیملی سے بھی ملوا چکی تھیں۔

عدن کے پاس ایک پرسنل نمبر بھی تھا، جو صرف فیملی اور چند قریبی دوستوں کے لیے ہی تھا۔ دوسرے نمبر پر اس کے ہر طرح کے رابطے تھے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح ان لڑکیوں نے پرسنل نمبر تک بھی رسائی حاصل کر لی۔

ان کے نمبر حاصل کرتے ہی اس نے پرسنل سم کو جس سے وہ افق سے بات کیا کرتا تھا۔ اپنے کمرے کے ہاتھ روم کے فلیش میں بہا دیا۔ وہ نیا اکلوتا نمبر استعمال کرنے لگا۔ پہلے اس نے ایک بار سوچا کہ وہ افق کو فون کرے اور اسے بتائے کہ اس کے پاپا نہیں مان رہے۔ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور ان

کی صحت کی خاطر وہ ان کی پسند سے شادی کر رہا ہے۔
 پھر اس نے اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ ایک تو اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ دوسرا افق کے لیے تو بالکل نہیں تھا اور پھر اس نے افق کے ساتھ کیا ہی کیا تھا؟ ہاتھ تک تو کبھی اسے لگا یا نہیں تھا۔ صرف بات ہی کی تھی نا۔ نہ کبھی ڈیٹ پر لے کر گیا۔
 یہ سب سوچتے اس کے اندر کہیں ایک ہلکی سی خلش ضرور تھی۔۔۔ بے حد معمولی۔۔۔ اور یہ معمولی سی خلش بھی دلہن بنی ماریہ کو دیکھ کر جاتی رہی۔
 شادی کے دوسرے ہی دن وہ لوگ دعائی آگئے۔ اتنی سی بات تھی۔ اس سب میں نہ کوئی نقصان ہوا، نہ ہی گھانا، جب ہم کسی ایک چیز سے دور ہوتے ہیں تو کسی دوسری چیز کے قریب ہو ہی جاتے ہیں۔ یقین جاپے یہ فلسفہ بالکل سچا ہے۔ جیسے رات کے بعد دن کا آنا۔ یہ فلسفہ عدن جیسے لوگوں کے لیے ہے۔ ان ہی پر صادق آتا ہے۔



افق کے پاس اب کوئی ایک بھی شخص ایسا نہیں بچا تھا، جس کے پاس جا کر وہ پیسے لے آتی۔ مدد اور سہارے کے نام پر اس کے پاس ٹیک ہی انسان تھا۔
 ”اماں۔“

اسپتال سے آئے اماں کو تین ہفتے گزر گئے تھے۔ ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سفید رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ اس دوران وہ ایک بار پھر چیک اپ کے لیے گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے پرانی ہی بات کی افق سے۔ افق کا منہ لنگ گیا۔

سرکاری اسپتال والوں نے تو پہلے ہی اماں کو مار دیا تھا ”سب ٹھیک ہے۔۔۔ سب ٹھیک ہے“ کہہ کر۔ وہ نہ درد کو پکڑ سکے نہ ہی مرض کو۔ لب وہ کیا کریں گے۔ اس کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ افق پاگلوں کی طرح اماں کو فون کرتی رہتی تھی۔ میچ لکھتی۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ وہ خود اتنی پریشان تھی کہ اس نے سوچا ہی نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس کا فون اتنے دنوں سے کیوں بند ہے۔

چوتھے ہفتے اماں کے سینے میں درد اٹھا۔ بھابھی کے ساتھ حواس باختہ وہ ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ وہ دونوں کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ”اب بھگتو۔“

رات بھر اماں درد کو برداشت کرتی رہیں۔ آہ نہیں کر رہی تھیں۔ لیکن ان کا وجود بتا رہا تھا کہ ان کے اندر کیا چل رہا ہے۔ وہ تینوں دم سادھے ان کے پاس بیٹھے تھے۔ اسد اور جمال ان کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ افق بھی ہاتھ سہلائی، کبھی سینہ۔۔۔ رات ان سب نے سولی پر گزار دی۔

صبح ہوتے ہی افق بڑی سی چادر میں لپٹ کر ڈی ایچ اے آگئی۔ یہ خیال اسے پہلے بھی آیا تھا۔ لیکن چاہہ کبھی وہ جانے سکی۔ ہر دن یہی سوچتی آج تو اماں ضرور ہی فون کرے گا۔

آج آج کرتے کئی ہفتے گزر گئے۔ اس کے گھر سے اس کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔ کوئی دوست مل جائے گا۔ ورنہ کوئی ملازم تو ضرور ہی ہوگا۔ کوئی پیغام دے سکتی ہے وہ انہیں۔ رکشہ رکوا کر وہ عین اس کے گھر کے باہر کی۔ بیل دی۔ چھوٹا دروازہ کھولا گیا۔

”السلام علیکم جی! وہ امان ہے؟“ چوکیدار کی بڑی بڑی مونچھیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔
 ”امان۔۔۔!“ اس نے سوچا۔ ”گورا صاحب۔۔۔؟“
 ”گورا تو وہ بہت تھا۔ افق نے سر ہلا دیا۔“ وہ ہیں؟“
 ”نہیں۔۔۔“

”کہاں ہیں وہ۔۔۔؟“
 ”وہ صاب لوگ ہیں۔ نہ ہمیں بتاتے ہیں۔ نہ ہم پوچھتے ہیں۔“ خان نے غصہ نہیں کیا، لیکن چڑ گیا۔

”ان کا کوئی فون نمبر ہو تو مجھ دے دیں جی! میں بہت پریشان ہوں۔“
 اتنا کہتے اس کی آواز بھیگ گئی اور اس کے ساتھ ہی پورچ میں تھوڑا سا شور ہوا۔ چوکیدار نے جھٹ بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ طویل پورچ سے ایک کار آتی نظر آئی۔ کار پر نظر پڑتے ہی افق چوکیدار سے پوچھتا چاہتی تھی کہ ”کار میں کون ہے۔ کیا اس کا کوئی دوست۔۔۔“، لیکن چوکیدار اندر کی طرف دوسرے دروازے کے پاس کھڑا تھا اور وہ گیٹ کے باہر چھوٹے دروازے کی طرف۔ لمبی شان دار کار باہر نکلی پچھلی سیٹ پر بیٹھے سیاہ، سفید، گھنی اوپر کی طرف اٹھی مونچھوں والے شخص کی نظر ایسے ہی لمبی سی چادر میں لپی لڑکی پر پڑ گئی۔ اس نے نظر پڑتے ہی کار کو روکنے کا اشارہ دیا۔ چوکیدار بھاگا کھڑکی تک گیا۔
 ”کون ہے یہ؟“

”گورا صاحب کا پوچھ رہی ہے جناب۔“
 ”عدن کا؟“ یہ کہتے ایک اور نظر اس پر ڈالی۔ دراصل جو پہلی نظر پڑ گئی تھی، وہی واپس مشکل سے پلٹائی تھی۔ اپنے زمانے میں وہ رنگین مزاج مشہور تھے۔ آج بھی اکثر اٹھی نظریں اس خطاب کی گواہی دے جاتی تھیں۔ سیاہ چادر میں پریشان صورت حسن پر دوسری نظر ڈالتے ہی وہ سمجھ گئے کہ یہ کون ہے۔ اپنے خون کو جانتے تھے۔ اگر وہ اس پر فدا ہوا تھا تو غلط نہیں ہوا تھا۔
 ڈرائیور نے کار واپس پیچھے کر لی۔ کار سے اتر کو وہ اندر چلے گئے۔ افق کو لے کر چوکیدار اندر آ گیا۔

اس نے صرف اتنا ہی کہا ”آؤ ہمارے ساتھ۔“ یہ نہیں بتایا کہ یہ صاحب کون ہیں۔
 ڈرائنگ روم کے چوڑے لکڑی کے منقش دروازے کے لیے عین سامنے بڑے سفید رنگ کے صوفے پر وہ مونچھوں والا، دونوں ہاتھوں کو صوفے کی پشت پر دائیں بائیں پھیلائے، دائیں پیر کو بائیں گھٹنے پر رکھے شان سے بیٹھا تھا۔

نظر پڑتے ہی افق نے چادر سنبھال لیے سلام کیا۔ ان آنکھوں کی طرف اس کی پہلی نظر ملی تو دوبارہ ان کی طرف دیکھتے رہنے کی اس کی ہمت جاتی رہی۔

”بیٹھو۔“ سلام کا جواب نہیں دیا۔ ہاں اس بار اسے نیچے تک دیکھا۔

ان کے سامنے رکھے ایک صوفے پر وہ بیٹھ گئی۔

”اب بولو۔“

اس انداز پر وہ گھبرا گئی۔ کیا بولے کہ۔۔۔ امان کہاں ہے؟ اپنے باپ کی عمر کے شخص کے سامنے۔۔۔ کیسے؟

”کون ہو تم لڑکی؟“ لہجے میں اس سوال سے ہی اتنی ہتک نمایاں کردی گئی کہ اس کی رسی سہی ہمت جاتی رہی۔

”افق۔۔۔“ وہ بمشکل بولی۔ نظریں لکڑی کے چمکتے فرش پر تھیں۔

”نام سے مجھے مطلب نہیں ہے۔ کام بولو۔ کون ہو، کیا ہو، یہاں کیوں آئی ہو؟“ کمال کے فنکار بنے تھے اس وقت۔ جان بوجھ کر ہتک آمیز انداز اپنا رہے تھے۔ وہ بالکل ہی ٹھس ہو گئی۔ جی چاہا، بھاگ جائے۔

”مجھے امان سے ملنا تھا جی۔“ جب وہ کمزوری نالائق سی ہو جاتی تو بہت جی، جی کرتی۔

”امان کون؟“ وہ جانتے تو تھے کہ ان کے سیا لکھوٹے بیٹے نے ایک عدو فیشن ایبل نام رکھا ہوا ہے اپنا، لاہور شہر میں۔ لیکن انجان بن گئے۔

اب وہ ٹپٹا گئی۔ اسے لگا، سامنے بیٹھا شخص ضرور ہی امان کا باپ ہے ورنہ کوئی انکل ہوگا۔ اس کے گھر میں اس کے جاننے والے ہی ہوں گے نا۔

”عدن۔“ اس نے گھکھکیا کہ اس کا نام لیا، امان نے اسے اپنا اصل نام بتا تو دیا تھا ساتھ ہی منع بھی کیا تھا کہ وہ اسے کبھی اس نام سے نہ پکارے اور اصل نام اس نے اسے دیکھنے کے بعد بتایا تھا ورنہ اکثر لڑکیاں تو اس کا اصل نام جانتی ہی نہیں تھیں۔

”عدن؟“ حیران ہونے کی اداکاری کی۔ ”تمہارا کیا لگتا ہے وہ؟ کیسے جانتی ہو تم اسے؟“ وہ چیخڑ، ٹی شرٹ میں کٹے بالوں اور بنا دوپٹے کے آئی ہوئی تو اس سے یہ سوال نہ پوچھے جاتے اور ایسے حلیے میں آئی کوئی بھی لڑکی بہت مزے سے کہہ جاتی ”ہو دا ایل آر یو ٹو آسک۔“ (تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔)

الفاظ کو اس انداز سے ڈھالا گیا جیسے عدن کوئی سات پردوں میں رہنے والا مرد ہے۔ نظریں نیچی رکھنے والا، ٹخنوں سے اونچی شلوار پہننے والا اور سامنے بیٹھا شخص کوئی گدی نشین ہے اور کسی نا محرم لڑکی کے منہ سے اپنے بیٹے کا ذکر سن کر کانپ اٹھا ہے۔

افق شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ لکڑی کے تازہ پالش شدہ فرش سے نظریں اٹھا کر اس نے صوفے پر بیٹھی شخصیت کی طرف دیکھا اور جھٹ نظریں جھکا لیں۔

”وہ مجھے جانتے ہیں۔“

آواز کانپ رہی تھی۔ انداز بڑا ترس آمیز تھا۔ صوفے پر بیٹھے شخص کا جی چاہا کہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جائے اور پھر سامنے بیٹھی پری کو اٹھا کر ہوا میں اچھال دے۔ اس کی ایک ایک حرکت قابل توجہ تھی۔۔۔ نظریں جھکا نا، نظریں اٹھانا، تھیلیوں کو پوسٹ کیے بیٹھے رہنا اور اس طرح بیٹھنا کی جیسے جنبش پر ٹوٹ جائے گی۔ کسی عجائب خانہ میں رکھی جانے والی مورت ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ ان کے عین سامنے۔۔۔ اکیلی۔۔۔ صرف ایک چادر کی حفاظت میں۔۔۔

”کالج میں پڑھی ہو اس کے ساتھ؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر کیسے جانتی ہو اسے؟“ جھنجھلا کر پوچھا گیا۔

وہ چپ رہی، اور لگ رہا تھا کہ وہ اٹھ جائے گی، جب اگلا سوال آ گیا۔

”کہاں سے آئی ہو؟“

”انارکلی سے۔۔۔“ ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

”انارکلی ہو۔۔۔ مزار سے آئی ہو۔“ بہت ہی بھونڈا مذاق تھا۔ بھونڈے انداز سے کہا گیا تھا۔

بھونڈے انسان نے کہا تھا۔

”جی۔“ اس نے جھٹ سرائٹھا کر دیکھا۔

”کس محل سے آئی ہو؟“ دونوں بازو بدستور دائیں بائیں صوفے کی پشت پر پھیلے تھے۔ اس سوال

پر گھٹنے پر رکھا پاؤں ہلنے لگا۔

”گھر سے آ رہی ہوں اپنے۔“ ایک ہاتھ سے پیشانی پر آئے بال پیچھے کیے۔

”گھر سے یہاں کیوں آئی ہو؟“ وہ تو اسے ایسے بٹھائے ساری زندگی زچ کر سکتے تھے اور کتنے

مزے میں گزرتی ایسی زندگی۔

”مجھے کام تھا عدن سے۔“ نظریں اٹھا کر انہیں دیکھ کر التجا سے کہا۔

”کیا کام تھا؟“ پیر زور و شور سے ہلنے لگا۔

عدن ہوتا تو وہ بتا دیتی۔ ان صاحب کو کیسے بتاتی۔ تھوڑی ہمت کی۔

”مجھے بتادیں، وہ کہاں ہیں، میری بات کروادیں۔“

”تم کام بتاؤ۔ میں عدن کا بھی بتا دیتا ہوں۔“ وہ خاموش بیٹھی لفظ جوڑتی رہی کہ ایک بار پھر کیسے

التجا کرے کہ عدن کا بتادیں۔

”میں باپ ہوں اس کا لڑکی۔۔۔! بتاؤ، تمہیں کیا کام ہے؟“

وہ باپ تھا عدن کا اور ہونے والا سر تھا اس کا۔۔۔ تو اس کو ذرا سی ڈھارس ملی۔۔۔ گو اپنی اوقات

یاد تھی۔ لیکن مشکل کے وقت انسان اپنی اوقات بھول ہی جاتا ہے۔

”شاباش! بتاؤ کیا کام تھا؟“ نرم لہجے میں کہا۔ اس بار افاق تو آبدیدہ ہی ہو گئی کہ ان سے اپنے

سارے ہی دکھ درد کہہ ڈالے۔

”اماں کی سرجری کروانی ہے۔ مجھے پیسے چاہیے تھے عدن سے۔ اماں ٹھیک ہو جائیں گی تو ضرور

ہی واپس کر دوں گی۔“ اس پر اس کا انداز پراعتماد تھا۔

”محمد بخش۔“ اس آواز کی ایک بھڑک ماری۔ افاق ذرا سا ڈر گئی۔ محمد بخش دروازے میں نمودار ہوا۔

”میرے بیڈروم سے میرا بریف کیس لاؤ۔“

”بریف کیس آ گیا۔ چیک بک نکالی۔“

”دس لاکھ ٹھیک ہیں؟“ اتنی پیاری آواز میں پوچھا کہ افاق نے انہیں جان لیا کہ وہ تو اتنے اچھے

ہیں۔ ضرور ہی ان دونوں کی شادی کے لیے راضی ہو جائیں گے۔ اماں ایسے ہی ڈرتا تھا۔
 ”نہیں جی۔۔۔ اتنے نہیں۔۔۔ یہ بہت زیادہ ہیں۔“

”چھ لاکھ کر دیتا ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اتنے نہیں۔۔۔“

”اچھے سے اسپتال سے سرجری کروانا۔۔۔ چار لاکھ ٹھیک ہیں؟“

اس نے ”نہیں“ کہا۔ انہوں نے چیک لکھ کر سامنے شیشے کی میز پر رکھا۔

”بس لکھ دیا میں نے۔“ وہ اٹھ کر چیک پکڑنے لگی تو وہ بولے۔

”آرام سے بیٹھو۔۔۔ کوئی ٹھنڈا گرم پیو۔۔۔ محمد بخش!“ وہی بھڑک دار آواز نکالی۔ چیک پکڑے

بغیر وہ واپس بیٹھ گئی۔

”میڈم کے لیے فریش جوس لاؤ۔“

اتنا سن کر افقی کے گالوں پر سرخی آ گئی۔ اس کے سامنے اس کے سر بیٹھے تھے۔ انہوں نے کتنے

پیارے اس کی مدد کر دی تھی۔ اب اس کی خاطر مدارات کر رہے تھے۔

”عدن سے بات نہیں کرو گی؟“ بازی آنکھیں اس پر گاڑ کر اس گدھ نے پوچھا۔ افقی نے سر نفی

میں ہلایا۔ وہ یہاں ان کے سامنے کیسے بات کر سکتی تھی۔ بہت شرم کی بات تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی نہ

ہوتیں تو وہ دیکھتی کہ انہوں نے موبائل کے بشن کو پیش کیا ہے۔

”ہائے پاپا!“ اسپیکر پر عدن کی آواز ابھری۔ اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”کیسے ہوائی سن؟“

”فٹ۔۔۔ اور آپ کیسے ہیں؟“

”مار یہ کہاں ہے؟“

”کانچ میں ہے۔ سورہی ہے۔“

”کیسا جابا رہا ہے تمہارا ہنی مون سن؟“

وہ ہنسا۔۔۔ ”آپ کو بتایا تو تھا۔“

”اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔ خوب انجوائے کرو دونوں۔ شادی کی طرح ہنی مون بھی شان دار ہی ہونا

چاہیے۔“

افقی نامی انارکلی کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے والی لڑکی کو واقعی اب اٹھا کر ایک عجیب خانے

میں رکھ دینا چاہیے تھا۔ اس جیسی لڑکیوں کو بچرے بنا کر ان میں رکھ کر تالا لگا کر چابی گم کر دینی چاہیے۔

یہی ان کا اصل مقام ہے۔ اب وہ نظریں نہیں جھکا رہی تھیں۔ پلکیں نہیں جھپک رہی تھیں اور اپنے ہونے

والے سر صاحب کو دیکھ رہی تھی۔ اب وہ واقعی جنبش کرے گی تو ٹوٹ کر، گرچی کرچی ہو کر زمین کی

آخری تہہ تک جا پینے گی۔ پیروں کی دھول بھی نہیں رہے گی۔

”عدن اپنے ہنی مون پر ہے ماریہ کے ساتھ۔ بچپن سے پسند کرتا تھا اسے۔ تمہیں نہیں بلایا اس

نے شادی پر۔۔۔؟“ اس موچھوں والے کو تو کسی تھیر میں کام کرنا چاہیے۔ اس نے کوئی جنبش نہ کی، نہ

ہاں، نہ ناں۔

غلام علی غلام کا جی چاہا کہ اب تو ضرور ہی اسے جا کر بچ کر لیں۔ ایک انگلی سے ہی سہی۔۔۔ اور کبھی بھی لیں تو انہیں روکے گا کون؟ وہ اٹھے اور چل کر اسی صوفے پر آ بیٹھے، جس پر وہ بیٹھی تھی۔ ٹپ ٹپ آنسو افق کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ صدمے کا پہاڑ اس پر ٹوٹا تھا۔

”روتی کیوں ہو۔۔۔ ٹھیک ہو جائیں گی تمہاری امی۔“ ذرا سا قریب ہوئے۔

بھرم ایسے ہے تو اسے ہی سہی۔۔۔ وہ رونے میں اور رواں ہو گئی۔

غلام علی غلام کا ہاتھ آگے بڑھا۔ سر پر پیار دینے کے لیے نہیں۔۔۔ گود میں رکھے ایک ہاتھ کو انہوں نے اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ افق رونے اور عدن کے صدمے میں اتنی مگن تھی کہ ذرا دیہ میں چوکی۔

ہاتھ دو مردانہ ہاتھوں میں تھے۔ اچنبھے، حیرت اور سرسیمگی سے اس نے انہیں دیکھا اور لمحے کے ہزار ویں حصے میں وہ لڑکی سے عورت اور عورت سے سیانی بن گئی۔

عدن اپنی بیوی کے ساتھ ہے۔ سنتے ہی وہ خود فراموش ہو گئی۔ وہ یہاں کیوں ہے۔ اس کا نام کیا ہے۔ حتیٰ کہ اماں کی بیماری بھی بھول گئی۔ اس لمحے میں اس پر بہت کرب ناک قیامت ٹوٹی۔ جیسے اس کے عین سر کے اوپر گرم سیال اندھیلے جا رہا ہے اور نیچے اس کے ہاتھ، پاؤں بندھے پڑے ہیں۔ منہ کو سوئی دھاگے سے سی دیا گیا ہے۔ دو مردانہ ہاتھوں میں ہاتھ کے آتے ہی وہ اس ساری کیفیت سے باہر آ گئی۔ لیکن اگلی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ قبر میں زندہ گاڑے جانے کی۔ ایسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دنیا میں یہ سب بھی ہوتا ہے۔ یہ سب اور ایسے۔۔۔ جسے وہ سرمان رہی تھی وہ اسے عورت سمجھ رہا تھا۔ صرف ”عورت۔“

ذرا سے جھٹکے سے اس نے ہاتھ آزاد کر دیا۔ خوف زدہ اور بزدلانہ انداز میں اٹھی اور صرف دو قدم ہی چلی تھی۔

”پیسے نہیں چاہئیں؟“ آواز میں لگاوٹ بھی تھی اور دھمکی بھی تھی۔ دلار بھی تھا اور پچکار بھی۔

پیسوں کے نام پر اسے اماں یاد آ گئی ان کی تکلیف یاد آ گئی۔ آنے والی ان کی موت یاد آ گئی۔ وہ رکی رہی قدم نہیں بڑھائے۔

”اپنی ماں کو مارو گی کیا؟“ وہ اس کی پشت کی طرف صوفے پر بیٹھے بول رہے تھے۔

افق نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا کہ شاید یہ شخص وہ نہیں، جو وہ سمجھ رہی ہے۔ شاید امیروں میں تسلی ایسے ہی دی جاتی ہے۔ ہاتھ پکڑ کر، گلے سے لگا کر۔۔۔ اس نے سوچا وہ کم عقل ہے۔ یہ سب نہیں جانتی، آخر وہ عدن کا باپ ہے، اسے ایسے نہیں سوچنا چاہیے ان کے بارے میں۔

دوسری طرف غلام علی غلام سوچ رہے تھے کہ لڑکی پیسوں سے تو شاید ہی قابو آئے۔ کم بخت مارے ان غریبوں میں عزت نفس بہت ہوتی ہے۔ عزت۔۔۔ عزت کو روٹے پھرتے ہیں۔ چاہے اڑیاں رگڑتے مر جائیں۔

”دھوکا دیا ہے ناعدن نے جنہیں۔۔۔ ہے نا۔۔۔ تم جیسی معصوم سی، پیاری سی لڑکی کا فائدہ اٹھایا

ہے نا؟“

اتنی سی سچائی سے افق کے آنسو پھر رواں ہو گئے۔
”میں جانتا ہوں اسے۔ بہت روکا بہت منع کیا۔ کالج میں نہ جانے کتنی لڑکیوں کے ساتھ وعدہ کر چکا تھا۔ لیکن شادی اسے صرف ماریہ سے ہی کرنی تھی۔“
اسی کے باپ کے منہ سے عدن کے بارے میں ایسی حقیقت جان کر وہ دھواں دھواں ہو گئی۔
”تمہیں اس کے لیے رونے اور آنسو بہانے کی ضرورت نہیں ہے لڑکی!“ اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

”یہ چیک لو اور اپنی ماں کی زندگی بچاؤ۔۔۔ میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔“
افق نے ایک نظر گھنی مونچھوں والے کی طرف دیکھا۔ اس نے بے نام اشکوں کو پیچھے دھکیلا اور چار قدم کے فاصلے پر رکھی شمشے کی میز کی طرف بڑھ گئی۔ عدن کے دھوکے کے باوجود وہ اس کے باپ سے یہ پیسے لینے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ اس احسان کو لینے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچتی یا اپنی انا اور خودداری کے بارے میں؟
جیسے ہی وہ میز کی طرف جھکی دوہاتھا اس کی پشت پر آئے۔
”خوش رکھوں گا تمہیں۔۔۔ اور تم۔۔۔“

اس کا وجود کانپ کر سمندر کے ریلے میں بہنے والا پتھر بن گیا۔
”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ چیک نیچے گر گیا۔ سب کچھ صاف اور واضح ہو گیا۔ مکمل تصویر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔
”کیا کر رہا ہوں؟“ کندھوں سے پکڑ کر اسے سیدھا اپنی طرف کیا۔ غرا کر کہا۔ ”تمہیں نہیں پتا، کیا کر رہا ہوں۔۔۔؟ پچی ہو۔۔۔؟ عدن کیا کرتا رہا ہے تمہارے ساتھ؟ اس سے زیادہ محبت دوں گا تمہیں۔“

یہ انداز، یہ الفاظ۔ افق کی ساری عزت بہہ کر اس کے پیروں میں آ گئی۔ عزت کا جانا کیسا۔ وہ تو اتنے پر ہی چلی گئی۔
”چھوڑ دیں مجھے۔۔۔“ پہلی کوشش میں اس نے ڈر کر کہا۔ آواز بمشکل ہی نکلی۔ دونوں کندھوں پر ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

”پاکل مت بنو لڑکی۔۔۔ سمجھ داری کا ثبوت دو، میں تمہیں دولت میں نہلا دوں گا۔“
اس بات پر افق کا جی چاہا کہ اس شخص کو آگ لگا کر جلا ڈالے۔۔۔ اس کی گردن نوج لے۔
”چھوڑ دو مجھے۔۔۔“ وہ اتنی زور سے چلائی کہ آواز گھر کے آخری کونے تک گئی ہوگی۔ محمد بخش منتش دروازے کی اوٹ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اندر کے منظر پر ایک نظر ڈالتے ہی سب سمجھ گیا۔۔۔ تیز تیز قدم اٹھاتا باہر چوکیدار کے پاس گیا۔

غلام علی غلام کا منہ اس کے منہ کے قریب آتا جا رہا تھا۔ وہ پشت کے بل میز پر جھک رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ غلام علی غلام کو خود سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتے

ہاتھوں میں سے دائیں ہاتھ کو اس نے اوپر اٹھا کر ایک زوردار تھپڑ غلام علی غلام کے منہ پر دے مارا۔ اب تک کی اپنی ساری قوت کو جمع کر کے۔۔۔

تھپڑ پڑتے ہی وہ باؤ لے کتے کی طرح ہو گئے۔ اسے نیچے پٹنا۔

میز کے قریب۔۔۔ نیچے گرتے اس نے جھٹ میز پر رکھا شے کا گل دان اٹھا کر اسے دے مارا۔ گل دان عین غلام علی کی ناک پر لگا۔ خون کی ایک لکیر بہہ نکلی۔ گل دان مارتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر میز کی دوسری طرف سے گھوم کر باہر بھاگی۔

”بخش۔۔۔ صوفی۔۔۔“ ناک پر ہاتھ رکھے وہ دھاڑتے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

ڈرائیور صوفی وہاں موجود نہیں تھا۔ بخش، خان کے ساتھ گیٹ کے پاس کھڑا زرداری سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ خود تین بیٹیوں کا باپ تھا۔ خان کے ساتھ وہ جلدی جلدی کھسر پھسر کر رہا تھا اور اسے اندر کی صورت حال بتا رہا تھا۔

اسے خان کے پاس آئے دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ لڑکی پوریج سے بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ خان نے جھٹ چھوٹا گیٹ کھول دیا۔ پیچھے غلام علی کی شکل نمودار ہوئی۔

”پکڑو اسے۔۔۔ بخش۔۔۔“ چوکیدار۔۔۔ حرام زادو! پکڑو اسے۔“

دونوں بوکھلائے، منہ اٹھائے غلام علی کو دیکھنے لگے۔ ناک پر ہاتھ رکھے وہ لڑکھڑاتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔

”کیا ہو اجنب آپ کو؟“ بخش لپک کر اپنے صاحب کی طرف آیا۔ چوکیدار نے لڑکی کی طرف بھاگنے کا ڈراما کیا جبکہ لڑکی تنگی کی طرح کھلے گیٹ سے نکل گئی۔

”کتے اس کے پیچھے بھاگ۔“ غلام علی دھاڑا۔ بخش گیٹ سے نکلا۔ چوکیدار بھی نکلا۔ لڑکی سڑک پر دوڑ جاتی نظر آئی۔

دونوں نے اس کے پیچھے بھاگنے کی کمال اداکاری کی اور لڑکی دور سے دور ہوتی گئی۔ دونوں غلام علی کے ملازم تھے۔ اس کے غلام نہیں تھے۔ انسانیت رکھتے تھے۔ اپنے مالک سے تنخواہ لیتے تھے۔ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے ایمان پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ مالک کی خصلت کو جانتے تھے۔ چوکیدار نے تو اس سے زیادہ ڈرامے دیکھے تھے۔ جب یہاں پانچ لڑکے رہتے تھے۔ جس وقت بخش جوں کا گلاس رکھ کر گیا تھا وہ اسی وقت سے ذرا اوٹ میں کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ کوئی اپنی ہی مانگی دعا تھی، جس نے افق کو بچا لیا تھا۔

کیا وہ واقعی بچ گئی۔۔۔ یا یہ وقت ہی طے کرے گا؟

ڈی ایچ اے کی کشادہ سڑک پر بھاگتے ہوئے اسے بہت شرم آئی۔ اس کی چادر اب اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ بالوں کی کئی لٹیں گردن اور پیشانی پر پھیل گئی تھیں۔ اس کا وجود بری طرح سے کانپ رہا تھا۔ وہ ایک قدم تک نہیں اٹھا سکتی تھی۔ لیکن اسے بھاگنا تھا۔ اپنی عزت کے لیے اسے بھاگنا تھا۔ سڑک پر قیمتی کاریں رواں دواں تھیں۔ سڑکیں کشادہ اور صاف تھری تھیں۔ وہ بڑے بڑے پھانکوں اور بنگلوں کے آگے سے گزر رہی تھی۔ سانس اتنی پھول چکی تھی کہ اب دم ہی نکل جائے گا۔ بہت دیر تک ڈر

کے بھاگتے بہت سی سڑکیں پار کرتے وہ فٹ پاتھ نما جگہ پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ وہ وہاں اکیلی تھی۔ بچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

وہ اپنی عزت بچا کر وہاں سے نکلی تھی۔۔۔ نہیں۔۔۔ دراصل وہیں تو اس کی ساری عزت اتر گری تھی۔ عدن جس سے وہ محبت کرتی رہی، وہ اسے چھوڑ گیا اور اس کے باپ نے اس سے بڑھ کر کیا۔ آئندہ زندگی میں جتنے بھی دن وہ زندہ رہے گی، کیا وہ اس طرح اپنا تار تار کیا جانا بھول جائے گی۔ اگر وہ دو دن بھی زندہ رہ پائی تو۔۔۔ اور پھر یہ زندہ رہنا نہیں ہوگا۔

افتی کو بہت ترس آیا اپنی ماں پر۔۔۔ اپنے مرے ہوئے باپ پر، جس کی اس جیسی بیٹی تھی۔ جسے اس طرح بھاگنا پڑا تھا۔ جسے اس طرح دھوکا دیا گیا تھا۔ جو اس جگہ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ جس کی چادر اتر گری تھی۔ جس پر صاف صاف سامنے سے حملہ کیا تھا۔ جس کے سامنے پہلے پیسے پھینکے گئے تھے۔ تو یہ تھا وہ حسن جو اتنے غضب کا تھا کہ غضب ہی کر دیا تھا۔ حسن اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ لیکن آج تو وہ اپنا آپ دکھا ہی گیا۔ لیکن اگر وہ حسین نہ بھی ہوتی تو قریب قریب ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ کس کس بات کے لیے ماتم کرتی۔۔۔ اپنے لیے۔۔۔ امان کے لیے یا ابھی جو ہوا، اس کے لیے۔ اسے صرف ایک ہی چیز کے لیے ماتم کرنا چاہیے۔ اپنے ”کم عقل“ ہونے کے لیے۔

بہت دیر تک وہ وہاں ایسے ہی بیٹھی رو رہی۔ اس کا جی چاہا کہ اب وہ مر کر ہی گھر جائے۔ کاش! آج ہی قیامت کا دن آن پہنچے۔۔۔ حشر ہو۔۔۔ یوم حساب ہو اور وہ دو لوگوں کے گریبان پڑے۔ ”ہے (Hey)“ آواز افتی کے قریب ابھری۔ ساتھ ہی کندھے پر ہاتھ آیا۔ ڈر کے افتی نے سر اٹھایا۔

”کیا ہوا؟“ اس کی دھواں دھواں شکل پر نظر پڑتے ہی ایک ہاتھ میں کیونوس بورڈ پکڑے لڑکی چونک گئی۔ لڑکی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا ڈیر؟“ سرخ بہتی آنکھوں سے افتی نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے بیک میں سے ٹشو نکال کر آگے کیا۔ افتی نے ٹشو نہ پکڑا۔ لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں صاف کیں۔

”بتاؤ نا۔۔۔ کیا ہوا۔ میں دس منٹ سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔ وہاں سے۔۔۔“ لڑکی نے ہاتھ سے اشارہ کیا ایک طرف۔۔۔ افتی سے ذرا سادہ اور اپنی سرخ گاڑی کی طرف۔۔۔ افتی نے اٹھنا چاہا۔

”میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔۔۔ کہاں جانا ہے تمہیں؟“ افتی نے نہ میں سر ہلایا۔۔۔ دنیا کا پھر دل انسان بھی اس وقت اسے دیکھ لیتا تو موم ہو جاتا۔ کیونوس بورڈ پکڑے اس لڑکی کو بھی بہت ترس آیا۔

افتی اٹھ کر چند قدم آگے چلی۔ لڑکی نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”آؤ! میرے ساتھ۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔“ لڑکی نے ہاتھ نہ چھوڑا اور ساتھ لے کر

کار تک آئی۔ قطار در قطار وہاں نئی کاریں کھڑی تھیں۔
 ”بیٹھ جاؤ پلیز۔۔۔“ لڑکی نے دروازہ کھولا۔ افق ہونق بنی لڑکی کی طرف دیکھ گئی اور پھر بیٹھ گئی۔
 لڑکی نے کار اشارٹ نہ کی۔ ”اب بتاؤ کیا ہوا ہے؟“
 افق نے لڑکی کی طرف الجھ کر دیکھا۔ کیا بتائے، کیسے اور کیوں؟
 ”نام کیا ہے تمہارا؟“ لڑکی بہت پیار سے بول رہی تھی۔ اس کی آواز اور انداز دونوں ہی نرم تھے۔
 ”افق؟“ اس نے آنکھیں پھیلی کی پشت سے صاف کر کے بتایا۔
 ”افق! وہاں ایسے بیٹھی کیوں رو رہی تھیں؟ بتاؤ مجھے۔ ہو سکتا ہے، میں کچھ کر سکوں۔ کچھ ہوا ہے
 تمہارے ساتھ؟“ افق جب بیٹھی رہی۔
 ”جب تک تم بتاؤ گی نہیں میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔“
 ”اماں مر رہی ہیں۔“ وہ ایک دم پھٹ پڑی۔ عدنا اور اس کے باپ کا نام بھی زبان پر لانا اس
 نے حرام جانا۔

”اسپتال میں ہیں وہ؟“
 نفی میں سر ہلایا۔ ”گھر میں ہیں۔۔۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ نئے سرے سے اس کی ہچکی
 بندھی۔

”چلو! گھر چلتے ہیں۔“ لڑکی نے کار اشارٹ کی۔
 اس نے گھر کا پتا بتایا۔ لڑکی نے پانی کی بوتل اس کے ہاتھ میں دی۔ ٹشو ہاتھ میں پکڑائے۔ ایک
 ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ اسے تسلی دیتی رہی۔
 ”بہت بیمار ہیں وہ۔۔۔؟“

”جی۔۔۔ اگر ان کی سرجری نہ ہوئی تو وہ مرجائیں گی۔“
 ”تم ایسے مت روؤ پلیز۔۔۔ ان کی سرجری بھی ہو جائے گی۔ بی بی (بہادر بنو)۔“ ساتھ ساتھ
 وہ اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے پھکی دیتی رہی۔ اماں کی بیماری کی نوعیت پوچھتی رہی۔
 کار پارک کر کے وہ افق کے ساتھ اس کے گھر آ گئی۔ افق نے لڑکی کو پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ وہ
 اماں کو اس کے رونے اور اس جگہ بیٹھنے کے بارے میں مت بتائے۔ اماں دوا کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ وہ
 بھابھی کو کہہ گئی تھی، گا ہے بگا ہے انہیں آ کر دیکھتے رہنے کا۔ لڑکی رپورٹس لے کر چلی گئی۔
 جس جگہ افق بیٹھی رو رہی تھی، وہ ایک پرائیویٹ آرٹ کالج کی پارکنگ تھی۔ وہاں رش نہیں تھا۔
 کاریں اس سے ذرا سے فاصلے پر پارک تھیں۔

رات میں لڑکی، جس کا نام دانیہ تھا۔ اپنی دو دوستوں کے ساتھ آئی۔ باہران کا ڈرائیور بھی تھا۔
 انہیں ڈرائیور کے ساتھ جانا تھا اور ہر طرح کے اخراجات کے لیے وہ ڈرائیور سے کہہ سکتی تھی۔ وہ تین
 دوستیں مل کر افق کی اماں کی سرجری کروا رہی تھیں۔
 یہ ان کے لیے آسمان سے اتاری گئی امداد تھی یا زمین پر پڑی گئی تھی۔ لیکن افق اندر تک اللہ کی مشکور
 ہو گئی۔ اس جیسی گناہ گار پر یہ بہت بڑا کرم تھا۔

اماں کے ساتھ افق اسلام آباد آگئی۔ بھابھی کا بھائی وہاں ان کے لیے موجود تھا۔ اسد اور جمال بھابھی کے سپرد کر دیے گئے۔ نئے سرے سے اماں کے ٹیسٹ ہونے لگے۔ انہیں چیک کیا گیا اور پھر بائی پاس سرجری کا دن آگیا۔

اگر دانیہ جیسا کوئی اس کا رشتہ دار ہوتا۔۔۔ اگر دانیہ جیسا اس کے پاس کوئی اور ہوتا تو اس دن اس کی انا اور عزت کا کٹورا ایسے خالی نہ ہوتا۔ اماں نامی انسان کو لے کر وہ اندر ہی اندر بہت کھٹی۔۔۔ راتوں کو چھپ چھپ کر وہ بہت روئی۔ اپنا ہی منہ فوج لینے کو اس کا جی چاہتا۔ خود کو مار لینے کا۔ ان کی اماں نے زندگی میں انہیں بہت سے سبق یاد کروائے تھے۔ محنت کرنے کے، نہ رونے کے، حوصلہ رکھنے کے، کسی سے کوئی امید نہ رکھنے کے، خود داری کے، وفاداری کے، زندگی کے سامنے ڈٹے رہنے کے۔۔۔ دنیا کو پرکھنے کا کوئی سبق وہ نہیں دے سکی تھیں۔ بھٹیڑیوں کی، بھٹیڑ میں انسانوں کی شناخت کا اور انسانوں کی بھٹیڑ میں شیطانیوں کی۔۔۔

”عورت جانتی کم اور بھتی زیادہ ہے۔“

یہ مقولہ ایک بڑی حقیقت ہے، لیکن عورت کو اس مقولے کو ہر ادینا چاہیے۔

”عورت جانتی زیادہ اور ہارنی کم ہے۔“

معاشی میدان میں انہوں نے بھوک کو ہرا دیا تھا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بھوک پیٹ سے مارتی ہے اور انسان روح سے۔۔۔ جن انسانوں کی رو میں دوسرے انسانوں کے ہاتھوں مر رہی ہیں، ان انسانوں کو بڑی کرب ناک سزائیں ملتی ہیں۔۔۔ اندر ہی اندر۔۔۔ کھٹی کھٹی۔۔۔ چھپی چھپی۔۔۔



”میں نے تمہیں پروپونز نہیں کیا تھا۔ تم نے مجھے کیا تھا۔“ فرزام نے یاد دلایا۔

”میں نے انکار نہیں کیا۔“ دونوں کندھے اچکائے گئے۔

”اب جب میں تمہارے بغیر نہیں رہنا چاہتا تو تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”کیا۔۔۔ میں نے کچھ کیا؟“ بالوں کو جھٹک کر پوچھا گیا۔

”کیا وہ سب میرے دوست تھے۔۔۔ کیا ڈرگ کا چارج مجھ پر لگا۔۔۔ کیا پولیس مجھے لے

گئی۔۔۔ تم جاننے ہو کہ کالج میں کتنی باتیں ہو رہی ہیں؟“ رومی نے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

”تم وہ سب باتیں سن رہی ہو اور مجھے نہیں۔۔۔؟“

”سن تو لیا تمہیں۔“ وہ جھلا گئی۔

”اتنی سی بات پر تم ہمارا رشتہ توڑ رہی ہو؟“

”اوہ۔۔۔ تو یہ اتنی سی بات ہے۔“ واہ واہ کا انداز۔

”یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے۔“ مضبوط انداز میں جتا گیا۔

”ایسی ہی سوچ تمہیں یہاں تک لے آئی ہے۔“ وہ چڑ گئی۔

”یعنی سوچ۔۔۔؟“ وہ برامان گیا۔ پچھلے دودن سے وہ سب کی باتوں کا برا ہی مان رہا تھا لیکن کسی

کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

”تم اس سب کو چھوڑ دو۔ کیا تم میرے بغیر رہ لو گی؟“ اسے لگا یہ سوال بہت بڑا ہتھیار ہے۔ اس ہتھیار سے وہ ضرور گھائل ہو جائے گی۔

”کچھ فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں۔“ کندھے پھرا چکے۔

”مجھے چھوڑنے کا فیصلہ؟“ ہتھیار کا وار خالی گیا۔

وہ چپ رہی۔

”اچھے خامسے سمجھ دار ہو تم۔۔۔ اچھی بھلی زندگی کو تم نے الٹا دیا۔۔۔ اب تم کیا چاہتے ہو، اس الٹ پلٹ میں، میں تمہارا ساتھ دوں؟“ خاموشی کے وقفے کے بعد وہ پھر اپنا پوائنٹ واضح کرنے لگی۔

”تم اب برطانیہ میں رہ نہیں سکتے۔ اگلے پانچ سال تک آ بھی نہیں سکتے۔ کیا میں پانچ سال تمہارا انتظار کروں؟ اور پانچ سال بعد تم صرف اپلائی کر سکتے ہو۔ اس کی بھی گارنٹی نہیں ہے کہ تم یہاں دوبارہ آ ہی جاؤ گے۔“

”تمہیں انتظار کرنے کے لیے کس نے کہا۔۔۔ تم تعلیم مکمل کرتے ہی پاکستان آ جانا یا ان سالوں میں، میں کسی اور ملک کے لیے اپلائی کروں گا۔ ہم وہاں رہ لیں گے۔“

”تم اپنی پلاننگ خود کرو۔۔۔ پلیز۔“

”یعنی تم میری پلاننگ کا حصہ نہیں بننا چاہتیں؟“

”میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی۔“ منہ نگاڑ کر کہا۔

”جب تم نے محبت کے لیے سوال کیا تھا تو میں نے جواب نہیں دیا تھا؟“

”وہ تمہاری مرضی تھی۔“ منہ کا زاویہ دینا ہی تھا۔

”پھر تم نے منگنی کے لیے کہا۔“ اس نے ٹیبل پر ہکا مارا۔

”تم انکار کر دیتے۔“ اس نے ہاتھ لہرا کر گود میں رکھ لیا۔ دوسرا ٹیبل پر رہا۔

”میں انکار اس وقت کرتا، جب مجھے تم سے لگاؤ نہ ہوتا۔ یہ سب تم بھابھی کے کہنے پر کر رہی

ہوتا؟“

”میں فیڈر نہیں پیتی۔“ مزاج اور انداز مزید بگڑ گیا۔

”رومی پلیز۔۔۔“ اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ ارادہ بھانپ کر رومیہ نے یہ ہاتھ بھی

میز پر سے پرے کر لیا۔

”رنگ میں تمہیں دے چکی ہوں فرزام! فیصلہ بھی کر چکی ہوں۔ تمہیں پسند بھی خود ہی کیا تھا۔ اب

اپنا فیصلہ بھی خود ہی بدل رہی ہوں۔“

”تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔“ پھر وہی محبت کا ہتھیار۔

”تم میرا اور وقت ضائع نہیں کر سکتے۔“ بیک اٹھا کر وہ چلی گئی۔

”رومی۔۔۔ رومی۔۔۔ رکو۔۔۔“ کی آوازیں اس کے تعاقب میں گئیں۔ لیکن رومی تیزی سے

سڑک پار کر کے ٹیکسی میں بیٹھ گئی اور وہ واپس پلٹ کر سڑک کے ایک طرف بنے اوپن لی کارز کی کرسی پر

بیٹھ گیا۔ یہ برطانیہ کے شہر لیڈز کی ایک پر رونق سڑک پر واقع لی کارز ہے۔ یہاں دنیا میں پائی جانے والی

مختلف قسموں کی مختلف ذائقوں کی چائے با آسانی مل جاتی ہیں اور یہ سب ذائقے رومی کو ہی پسند تھے۔

رومی نامی لڑکی جاچکی ہے۔

فرزام نام کا لڑکا مایوس بیٹھا ہے۔ سامنے رکھی چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ ٹھنڈیڈز میں بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ دو دن پہلے اس کی ماما نے اسے انگوٹھی دیتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ رومی دے گئی ہے۔“

انگوٹھی پر نظر پڑتی ہی وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ زیادہ عرصہ پاکستان میں گزارا تھا تو دھوم دھام سے پہنائی گئی منگنی کی انگوٹھی کے اس طرح واپس آنے پر گم گشتہ ہو گیا۔

”یہ کیا مذاق ہوا بھلا۔“

”اسی سے پوچھ لو فرزام۔۔۔!“ وہ شاید بھابھی سے پوچھ چکی تھیں۔ اسی لیے آبدیدہ نظر آ رہی تھیں۔

اس نے بھابھی کو فون کیا۔ جسے اٹھایا ہی نہ گیا۔ پھر رومی کو فون کیا۔۔۔ وہ بھی نہ اٹھایا گیا۔۔۔ وہ بھابھی کے گھر گیا، جوان کے فلیٹ سے پندرہ منٹ کی داک پر تھا۔

”یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے۔۔۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔“ وہ تو منگنی ہوتے ہی اس انتظار میں تھیں کہ وہ ٹوٹے اور وہ فرزام کو یہ سب کہہ سکیں۔

”آپ کو اس سے بات کرنی چاہیے۔۔۔ بھابھی پلیز۔۔۔ وہ تو میرا فون بھی نہیں اٹھا رہی۔“

”دبئی نہیں ہے وہ۔ کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہو گا نا۔“

”ان پندرہ دنوں میں آخر ایسا کیا ہو گیا کہ اسے یہ سب کرنا پڑا؟“

”یہ تم اسی سے پوچھو۔۔۔“ ایسے کہا انہوں نے کہ میری اور میری بہن کی جان چھوڑو۔

فرزامی، رومی کے گھر گیا۔ وہ گھر پر نہیں ملی۔ اس کی مام بیڈروم سے باہر نہیں نکلیں۔

آدھ گھنٹہ انتظار کر کے وہ آ گیا۔

فون کرتا رہا۔ لیکن اس نے فون نہیں اٹھایا۔ میجر چھوڑے اس کے لیے، وائس میجر الگ بھیجے۔ رات گئے اس کا ایک جواب آیا۔

"Its over now, Don't disturb me."

(سب ختم ہو چکا ہے، مجھے پریشان مت کرو۔)

اس نے فوراً کال بیک کی۔ وہ اس سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک ان میں بحث ہوتی رہی۔ وہ منگنی ختم کر چکی تھی اور اس کے ڈیڑھ بھی اب اسے منانہیں سکتے تھے تو وہ کیا چیز تھا۔

پندرہ دن پہلے وہ اپنے چار دوستوں دو برطانوی، ایک برازیلیں اور ایک جاپانی کے ساتھ منشیات کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ وہ اکثر اپنے ان دوستوں کے پاس ہاسٹل چلا جاتا تھا۔ شام کو وہ ان کے روم میں بیٹھا تھا۔ جب انہیں گرفتار کیا گیا۔

وہ منشیات کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ اتنا ضرور جانتا تھا، ان میں سے تین کبھی کبھار اسے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب انہیں گرفتار کیا گیا تو فرزام کو معلوم ہوا کہ دو اس کے ایجنٹ بھی تھے۔

گرفتار کمرے سے سب کو گرفتار کیا گیا۔ پندرہ دن کی تفتیش بھگت کروہ آگیا۔ کالج سے سب کا نام خارج کر دیا گیا اور اس پر جرم ثابت نہ ہونے کے باوجود اس کے کاغذات پر اسٹیمپ لگا دی گئی۔ اسے ایک ہفتے کے اندر اندر برطانیہ چھوڑ دینا تھا اور اگلے پانچ سال تک وہ دوبارہ نہیں آسکتا تھا۔

مصیبت اچانک ہی آتی ہے اور یہ سب اچانک ہی ہوا۔ اس کا گرفتار ہونا، کالج سے نکال دیا جانا، برطانیہ سے بھی نکال دیا جانا، بہت تکلیف دہ تھایہ سب۔۔۔ لیکن اس سے زیادہ تکلیف دہ کچھ اور تھا۔

”رومی کا رنگ واپس کرنا“ اس کا ایک ہی موقف تھا کہ وہ مجرم ہی ہے۔ ڈرگز پلائی کرتا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے دوست یہ کام کریں اور اسے معلوم نہ ہو۔ اسے واقعی معلوم نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تو وہ اتنی بڑی مصیبت میں خود کو چھسنے دیتا۔

”ایک چھوٹے سے حادثے سے تم مجھ سے اتنی دور ہو گئیں رومی؟“ جو کچھ ہو رہا تھا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اتنی جلدی اس کی زندگی اتنی تلخ ہو گئی۔

”تمہاری اصلیت سامنے آگئی۔“

”اگر یہ میری اصلیت ہوتی تو کیا میں صرف پندرہ دن بعد باہر ہوتا۔۔۔ کیا وہ مجھے ایسے چھوڑ دیتے؟“

”تمہیں کالج سے ایسے ہی نہیں نکالا گیا۔“

”کالج نے اپنی ساکھ کے لیے یہ کیا۔“

”میں اپنی ساکھ کے لیے کر رہی ہوں۔“

رومی نے اتنی بڑی بات کہہ دی اور اسے سن کر بھی وہ اس سے ملنے کے لیے بار بار کہنے لگا۔

دو دن بعد وہ اسے ملی اور اپنی مرضی کا فیصلہ بنا کر چلی گئی۔ جس شخص کا مستقبل پہلے روشن تھا، اب وہ تاریک ہو چکا تھا، جو انسان پہلے اچھا لگ رہا تھا، وہ اب برا لگ رہا تھا۔ اب اسے اٹھارہ دن پہلے وہ اس کے ساتھ مودی دیکھنے سینما گئی تھی اور اٹھارہ دن بعد وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ٹھیک ہے، تعلقات ٹوٹ ہی جاتے ہیں، لیکن اس طرح۔۔۔ ایک دم سے۔۔۔ کیا تعلق توڑنے کے لیے لوگ اتنے تیز رفتار رہتے ہیں؟ جاپانی الیکٹرک ٹرین سے بھی زیادہ۔۔۔؟

وہ چھٹی جماعت میں تھا جب یہاں آیا تھا۔ اس کا بڑا بھائی امرایف ایس سی کرتے ہی برطانیہ آگیا تھا، وہ اسٹوڈنٹ ویزے پر آیا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے آتے ہی ایک پاکستانی ہوٹل میں اچھی جاب مل گئی تھی اور پھر اسے اپنی ہونے والی بیوی تانیہ مل گئی کالج میں۔

امرکی جاب اچھی تھی۔ اس نے صرف ایک سال کی کورٹ شب کے دوران ہی تانیہ سے شادی کر لی۔ دونوں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگے۔ پاکستان میں امرکی غریب خاندان سے نہیں آیا تھا۔ اس کی ماما کڈزگار منٹس کا ایک اسٹور چلاتی تھیں۔ گلیمرگ میں ان کی ایک کونٹری تھی۔ کار تھی، تھوڑا بہت بیکن بلیٹس تھا۔ امرکی برطانیہ آنے سے چھ ماہ پیشتر ان کے ڈیڈی کی وفات ہو چکی تھی۔

صرف ڈیڑھ سال میں ہی امر نے ماما اور فرزام کو برطانیہ بلوایا۔ وہ برطانیہ میں اپنا بزنس کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اسے پیسے چاہیے تھے۔ اس نے ماما کو راضی کر لیا کہ وہ سب کچھ بیچ کر یہاں اسی کے

پاس آجائیں۔ وہ مل کر ایک جگہ رہ بھی لیں گے اور وہ کاروبار بھی کر لے گا۔ ماما نے سب کچھ سچ کر پیسے اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ اس نے اپنے سر اور سالے کے ساتھ مل کر ٹریولنگ ایجنسی کھول لی۔ فرزام نے اسکول میں ایڈمیشن لے لیا اور وہ اور ماما مل کے احمر کے اربنچ کیے گئے ایک فلیٹ میں رہنے لگے۔

یہاں تک سب ٹھیک تھا۔ احمر ماما کو ہر ماہ ایک محدود رقم دے دیا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی اس کا کاروبار سیٹ نہیں ہوا۔ پھر وہ اپنی بیوی کے ساتھ دو کمروں کے فلیٹ سے ایک بڑے اور کشادہ فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ اس پر اس کا کہنا تھا کہ یہ فلیٹ تانیہ کے گھر والوں کی طرف سے تانیہ کے لیے شادی کا تحفہ ہے۔ ان کی ماں مسز گوہر پاکستان میں اپنا چلتا ہوا کام چھوڑ کر آئی تھیں، صرف اپنے دونوں بیٹوں کے مستقبل کے لیے۔ اپنے بیٹے احمر کی خوشی کے لیے۔ ورنہ انہیں اپنے کام سے بہت لگاؤ تھا۔ احمر نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ حالات ٹھیک ہوتے ہی وہ انہیں ویسا ہی کاروبار یہاں کر دے گا۔ حالات ٹھیک ہو رہے تھے۔ لیکن صرف احمر اور تانیہ کے۔ دونوں نے الگ الگ کاریں لے لی تھیں۔ ان کے گھر کی سجاوٹ دیکھنے لائق تھی۔ ان کے شانگن بلز دیکھنے کے لائق تھے۔

ایک کاروباری عورت کو یہ سب باتیں سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ لیکن اب وہ کر کچھ نہیں سکتی تھیں۔ پاکستان میں کچھ بچا نہیں تھا۔ یہاں اثاٹے کے نام پر ان کے پاس صرف فرزام تھا اور فرزام چھوٹا تھا وہ اسے یہ سب باتیں بتا کر احمر سے باغی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ فرزام اپنی ڈگری مکمل کر لے اور ایک جاب حاصل کر لے۔ ابھی فی الحال احمر ہی اس کے سب اخراجات پورے کر رہا تھا۔ وہ احمر سے کوئی بھی بات کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جتنے پیسے احمر انہیں دیتا، وہ پیسے وہ خاموشی سے رکھ لیتیں۔

پاکستان میں وہ ایک فعال زندگی کی مالک تھیں۔ یہاں فی الحال وہ چند کورسز کر رہی تھیں۔ وقت کی نبض پر ہاتھ تھا، جانتی تھیں، کسی بھی وقت خود مکا نے کی نوبت آ سکتی ہے۔ بیٹے، بہو اور ان کے درمیان ایک بھرم کا پردہ تھا۔ کسی بھی وقت پردہ چاک ہو سکتا تھا۔ لیکن اس سب میں ایک گڑبڑ ہو گئی، تانیہ کے لیے۔ تانیہ کی چھوٹی بہن رومیہ، فرزام کی دوست بن گئی۔ پھر کالج میں بھی ساتھ ہو گئے۔ رومی، فرزام کے ساتھ بہت خوش ہوتی تھی۔ تانیہ پہ سب پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے میاں کے بھائی کو اپنے میاں کے سیٹ کیے گئے کاروبار میں حصہ دار نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اگر رومی اور فرزام میں رشتہ استوار ہو جاتا تو اس کی ذہین و فطین بہن ضرور اس کاروبار میں سے فرزام کا حصہ نکال لیتی۔ اس نے اپنے والدین کو بھی اپنا حامی بنالیا۔ لیکن رومی نے کسی کی نہیں سنی اور فرزام سے منگنی کر دیا کر ہی چین لیا۔

منگنی سے پہلے تانیہ کے پاس کوئی ایسی ٹھوس وجہ نہیں تھی، جو وہ اپنی بہن کو بتاتی اور وہ فرزام سے دور رہتی۔ لیکن فرزام کے پکڑے جانے اور برطانیہ میں اس کی موجودگی پر پابندی سے اس کے ہاتھ بہت کچھ آ گیا تھا۔ اس نے اچھی طرح سے اپنی بہن کا ذہن صاف کر دیا تھا۔

کالج میں ان دونوں کے مشترکہ دوست طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ چھوٹی سی خبر تھی۔ اخبار میں بھی آ گئی۔ مقامی ٹی وی چینل پر بھی۔۔۔ کالج میں ہر کسی نے اس بارے میں باتیں کی تو فرزام کے

ساتھ پکنک پکنک کھینے والی، اس کے پنکلوں پر ہنسنے والی، اس جھفٹ کے لمبے چوڑے ہنڈسم کے ساتھ فخر سے چلنے والی رومی پریشانی کی ہلکی سی گرم ہوا برداشت نہیں کر سکی۔ جو فریڈز اسے لگی تھیں، وہ اب فرزام کے متعلق باتیں بنانے لگی تھیں۔ اس کی بہن اور گھر والے الگ اسے اکسارہے تھے۔ ساری جمع تفریق کر کے اس نے انکوھی اتار کر اس کی ماں کے ہاتھ میں دی۔ برطانیہ میں تو فرزام کا مستقبل تھا۔ لیکن پاکستان میں کیا تھا۔ کسی دوسرے ملک میں قدم جمانے کے لیے اسے بہت دقت اور مشقت درکار ہوگی اور اسے اس لفظ مشقت سے چڑھی۔

”ماما! یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا؟“ وہ مسز گوہر کی گود میں سر رکھ کر لیٹا، رودینے کے قریب تھا۔

”شاید کسی اچھے کے لیے۔“ مسز گوہر اچھا، اچھا ہی سوچتی تھیں۔

”اس میں کیا اچھا ہے۔۔۔۔ ہر بار ایک ہی فلسفہ۔۔۔۔ جب میں یہاں نہیں آنا چاہتا تھا، آپ مجھے زبردستی یہاں لے آئیں اور اب میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا تو پوری کی پوری حکومت ہی مجھے نکال باہر کر رہی ہے۔ یہ کون سی قوت ہے ماما! جس نے حکومت کو یہی حرکت دے دی کہ نکالو اس فرزام کو یہاں سے اور پھر آپ کا یہ فلسفہ۔۔۔۔ کچھ اچھا نہیں ہے اس میں۔۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔“

”یہ تمہیں آنے والی مصیبت میں طے کرنا ہے فرزام!“

”آپ ہمیشہ ایسے ہی سوچتی ہیں۔“

”بری سوچ تو نہیں ہے یہ۔۔۔۔؟“

”کچھ ایسی فائدہ مند بھی نہیں ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ رومی کو ایسے نہیں کرنا چاہیے۔“

”آنے والے وقت میں شاید وہ سمجھ جائے۔“

”شاید۔۔۔۔ کاش! ایسا ہی ہو۔“

”تم اسے بہت پسند کرتے ہو؟“

”صرف اسے ماما!“

”تمہیں اس میں کیا پسند ہے بیٹا؟“

مسز گوہر نے ہمیشہ اپنے دونوں بیٹوں کی پسند کو ہی پسند کیا تھا۔ تانیہ کی بار بھی احمر نے صرف ایک تصویر بھیج دی تھی اور فون پر بات کروا کر اپنی شادی کی تاریخ بتا دی تھی اور انہوں نے خوشی خوشی اجازت دے دی تھی۔

”تمہیں اس میں کیا پسند ہے؟“

یہ سوال وہ پہلی بار فرزام کی کسی بھی پسند کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ اب انہیں لگتا تھا کہ انہیں اپنے بچوں کی پسند پر مسکرا کر ”ہاں“ نہیں کہہ دینا چاہیے۔ بلکہ انہیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ جن چیزوں، لوگوں کو وہ پسند کر رہے ہیں، وہ پسند کیے جانے کے لائق بھی ہیں یا نہیں۔ چیزوں کی تو خیر ہے بدلی جاسکتی ہیں، جھٹکی جاسکتی ہیں۔ لیکن لوگوں کا کیا جائے ان کے بیٹے نے تانیہ پسند کر لی۔ برطانیہ میں ہمیشہ کے لیے رہنا پسند کر لیا اور اس کا نقصان ابھی تو انہیں ہو رہا تھا۔ آنے والے وقت میں شاید اسے بھی

ہو۔

”یہ کیسا سوال ہے مام! بس وہ مجھے پسند ہے۔“

”تم اپنے جوتے، کپڑے، موبائل، لپ ٹاپ اور ایسی ہی دوسری چیزیں کو الٹی دیکھ کر لیتے ہو نا؟ تو چیزوں میں کو الٹی ساخت اور انسانوں میں۔۔۔ تم نے اپنے دوست بناتے وقت بھی یہی غلطی کی اور اس غلطی کی تمہیں اتنی بڑی سزا ملی۔ خود کے ٹھیک ہونے کے ساتھ ساتھ خود کے ساتھ جڑے لوگوں کا ٹھیک ہونا بھی ضروری ہے۔“

”محبت میں یہ سب نہیں دیکھا جاتا ماما۔۔۔! یہ خوبی۔۔۔ یہ خامی۔۔۔ یہ سب محبت میں نہیں چلتا۔“

انہوں نے پیشانی پر پیار کیا۔ ”میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہاری ہر خوبی اور خامی کو تسلیم کرتی ہوں۔ رومی کا کہنا بھی یہی تھا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ پھر اس نے صرف تمہاری خوبیاں ہی کیوں قبول کیں؟ اس نے تمہیں چھوڑ دیا، وہ تمہارے ساتھ خوشی میں رہی اور دکھ، پریشانی میں چھوڑ گئی۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور چونکنے کی کیفیت لیے انہیں دیکھنے لگا۔ جیسے بچے چونک جاتے ہیں۔ ”آسمان پر تو کوئی بڑھیا نہیں۔“

”تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے اس برے وقت کا۔ یہ وقت تمہیں بہت کچھ بتا رہا ہے فرزام! جو وقت بتا رہا ہے، اسے سنو۔ وقت کبھی برا نہیں ہوتا۔ ہاں انسان بہت برا ہوتا ہے۔ وقت تو بہت اچھی کتاب ہے۔ اسے پڑھو۔۔۔ سمجھو۔“

صوفی پر اسے سوچنے کے لیے چھوڑ کر وہ کوٹ پہننے لگیں۔

”میں احمر کی طرف جا رہی ہوں۔ تم کھانا کھا کر اپنی پیکنگ دیکھ لینا۔ شاید مجھے آنے میں دیر ہو جائے۔“



”وہ یہاں سے جا رہا ہے۔ تم اسے اس کا حصہ دے دو۔“

”کون سا حصہ؟ وہ جو اتنے سال یہاں رہا ہے۔ میں نے اس کے سارے اخراجات پورے کیے۔ اس کی تعلیم کی ذمہ داری اٹھائی۔“ اپنی ماں کے اس مطالبے پر اسے بہت غصہ آیا۔ ابھی تانیہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔

”احمر۔۔۔! اگر میں حساب کتاب کرنے لگی تو تمہارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ اس کے باپ کی پراپرٹی میں اس کا حصہ بھی تھا۔۔۔ تمہارے برابر۔۔۔ وہ سب میں نے تمہارے حوالے کر دیا۔۔۔ غلط کیا۔۔۔ اس کے حصے کے پیسوں کا منافع صرف تم نے استعمال کیا اور میرے ہاتھ پر تم صرف چند ہزار پونڈ ز رکھتے رہے۔“ بھرم کا پردہ مسز گوہر نے چاک کیا اور صاف صاف حساب پر آ گئیں۔ فرزام کے ساتھ وہ زیادتی کیسے ہونے دیتیں۔

”اس پیسے سے کاروبار میں نے شروع کیا۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام میں نے کیا ہے اور آپ دونوں کو میں بہت پیسے دیتا رہا ہوں۔ اتنا تو کم کا کر دیا ہے میں نے۔ ماما! آپ ایسے کیسے حساب اور حصے پر اتر آئیں؟ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں کتنے سالوں سے کتنی محنت کر رہا ہوں؟“ احمر کو پہلے سے ہی

خدا شکر تھا کہ ماما ایسا کچھ کہیں گی۔

”ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ اب تم صرف یہ کرو کہ جو میرا چوتھائی حصہ ہے۔ وہ تم اپنے پاس رکھو۔ تم فرزام کو اس کے حصے کے پیسے دے دو۔ تم اسی قدر دے دو جتنے تمہیں ملے تھے۔“ وہ محل سے بولیں۔ انہیں معلوم تھا کہ بات کرنے کی دیر ہوگی اور وہ چیخنے چلانے پر آجائے گا۔ واویلا کرے گا اور وہ یہی نہیں چاہتی تھیں۔

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں ماما! آپ صرف اسی کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ میری محنت آپ کو نظر نہیں آرہی۔ میں نے کیا کچھ نہیں کیا آپ دونوں کے لیے۔“

”میں نے تمہاری ہر بات مانی احمر۔۔۔! اپنا کاروبار تک تمہارے لیے چھوڑ دیا۔ سب کچھ بیچ دیا۔“

”تو کیا میں نے آپ کو یہاں نہیں بلایا؟ آپ کے اخراجات نہیں پورے کیے؟ آپ کا خیال نہیں رکھا؟“

”احمر۔۔۔!“ انہوں نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ ”صرف فرزام اور اپنے حصے کا پیسہ میں کسی بھی بزنس میں لگا دیتی تو مجھے اس سے کئی گنا زیادہ منافع ہوتا جو تم مجھے دیتے ہو اور میں کسی بھی وقت اپنا پیسہ واپس نکال سکتی تھی۔ فرزام کے ساتھ میں یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ تمہیں اس کے حصے واپس کرنے ہوں گے۔“

”اور جو رات دن میں محنت کرتا رہا ہوں؟“

”اس رات دن کی محنت کا پھل تم نے خوب کھایا ہے۔“ انہوں نے گھر پر ایک نظر دوڑائی۔ اس بات اور انداز پر احمر تلملا کر رہ گیا۔

”کون سے پیسے اور کیسے پیسے؟“ تانیہ زیادہ دیر تک اس گفتگو سے الگ نہیں رہ سکی۔

”ہم دونوں بات کر رہے ہیں۔“ مسز گوہر نے سختی سے کہا اور تانیہ کو آگ ہی لگ گئی۔

”آپ پوچھ لیں احمر! ماما سے کہ یہ کن پیسوں کی بات کر رہی ہیں۔ ایسے ہی اتنی لمبی گفتگو میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔“ وہ صاف صاف جتا رہی تھی کہ رقم دی تھی؟ اچھا! تو کوئی ثبوت ہے؟ اگر ہے تو کہاں ہے۔۔۔ کیسا ہے۔۔۔ کیا ثابت کرو گے؟

احمر نے اپنی ماں اور سویت ہارٹ کی طرف دیکھا۔ سویت ہارٹ کا پیش کیا گیا خیال اسے پسند آیا۔

”ماما! آپ کن پیسوں کی بات کر رہی ہیں؟“

”احمر۔۔۔!“ مسز گوہر کو یقین نہیں آیا۔

”تانیہ ٹھیک کہہ رہی ہے ماما!“

تانیہ نے اپنی ساس کی طرف ایسے دیکھا، جیسے پوچھ رہی ہو۔ ”اور کچھ ماما جی؟“

”تم ایسے نہیں کر سکتے۔“ اتنا کہتے ان کی آواز کانپ گئی۔ وہ پیسے دینے میں تامل کرے گا، ان کا

خیال تھا مگر وہ تو صاف مکر رہی رہا تھا۔

”آپ اس لفظ کی اتنی حمایت کیوں کر رہی ہیں؟“
 مسز گوہر نے بے یقینی سے اپنے پڑھے لکھے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی یہ الفاظ لاؤنج کی طرف آتے فرزام نے بھی سنے۔ وہ ماما کو لینے کے لیے آیا تھا۔ اکیلے کھانا کھانے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ماما کو لے کر وہ باہر کہیں جا کر کھانا چاہتا تھا۔

”اپنے بھائی کو لفنگا کہہ رہے ہو؟“ سب باتوں سے بڑھ کر انہیں اس بات کا زیادہ صدمہ ہوا۔
 ”تو جیل میں کون لوگ جاتے ہیں۔ کالج سے کن کو نکالا جاتا ہے۔ اس کا تو ویزا بھی منسوخ کر دیا گیا ہے۔۔۔ اور کیا نشانیاں ہوتی ہیں بد معاش لوگوں کی؟“

”بد معاش لوگوں کی کچھ اور نشانیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ دوسروں کے مال ہضم کر جاتے ہیں۔“
 ”ماما پلیز! آپ جانیں یہاں سے۔“ احمر نے اتنے جھک آمیز لہجے میں کہا کہ مسز گوہر کو چکر آ گئے۔ فرزام لپک کر اپنی ماں کے پاس آیا۔

”یہ کیسے بات کر رہے ہیں آپ ماما سے؟“ دونوں بھائیوں نے کبھی ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ فرزام کی آواز یہ کہتے کافی بلند ہو گئی۔
 ”یہ تم مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہو؟“

”اس سے اچھے انداز میں ہی بات کی ہے، جس انداز میں آپ نے ماں سے کی۔“

مسز گوہر انہیں۔ فرزام کا ہاتھ پکڑا۔
 ”چلو فرزام! یہ میرے اور احمر کے درمیان کی بات ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ۔“ وہ کبھی بھی نہیں چاہتی تھیں کہ دونوں بھائی آمنے سامنے آئیں۔

”آپ کی آپس کی بات میں یہ مجھے بد معاش کہہ رہے تھے۔“

”تو سچ ہی تو کہا ہے احمر نے۔“ احمر کی سویٹ ہارٹ بولی۔

ان سب کے تعلقات اس نوعیت پر پہنچ چکے ہیں، اس کا اندازہ فرزام کو اپنے اکلوتے بھائی کے انداز سے اب ہو رہا تھا۔ ٹھیک ہے لمحوں میں حالات بدل جاتے ہیں۔ لیکن یہ رشتوں، پیاروں اور لوگوں کو کیا ہو جاتا ہے کہ وہ لمحوں کا وقت کبھی نہیں لیتے بدلنے میں۔ مسز گوہر کو تانیہ کی یہ بات آگ لگائی۔
 ”ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے ناتمہارے خاندان والے؟ فرزام کے پیسوں سے ایک

بڑا گھر انہیں بھی نصیب ہو گیا۔“

تانیہ کا منہ ایسے سرخ ہو گیا۔ جیسے دائیں بائیں گال پر زور زور سے تین چار تھپڑ لگے ہوں۔
 ”فرزام کے پیسے۔۔۔ مانی فٹ۔۔۔ اوقات ہے اس کی اتنی؟ اب تک تو اپنے بھائی کے پیسوں پر پل رہا ہے۔“

”اب تک تم اس کے پیسوں پر پل رہی ہو اور دوسروں کو بھی پال رہی ہو۔“

مسز گوہر اب پیچھے ہٹنے والی نہیں تھیں۔ فرزام کو ان پیسوں کے معاملات کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔ اب تک اس نے ایک بے فکری کی زندگی گزاری تھی۔ مسز گوہر اسے کسی بھی معاملے کی ہوا لگنے دینا نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اپنے بھائی سے متنفر ہو جائے، لیکن اتنی احتیاط کے باوجود ان سے براہی ہوا۔

احمر اپنی بیوی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ بات واقعی بڑھ گئی تھی۔
 ”آپ کو جو کرتا ہے، کر لیں ماما جی!“ تانیہ نے ”ماما جی“ کو کھینچ کر کہا۔ ”یہاں سے جائیں اب۔“
 مسز گوہر کی زندگی بھر کسی نے اس طرح بے عزتی نہیں کی تھی، جواب ہو رہی تھی۔
 ”اپنا لہجہ اور الفاظ سنبھال کر بات کریں مسز احمر۔۔۔ پلیز۔“ فرزام نے یہ بات تحمل سے ہی کی تھی۔ لیکن وہاں بیٹھے دو لوگ بہانے اور بھڑکنے کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے۔ اس لیے احمر فوراً بھڑک اٹھا۔
 ”تم اپنی زبان سنبھالو اور نکلو یہاں سے۔۔۔ جاؤ۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔“
 وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فرزام گھبرا گیا۔ جو بھی تھا، وہ احمر سے ڈرتا تھا۔ اس کا احترام تو بہت ہی کرتا تھا۔ اس کے باپ کی جگہ تھا وہ۔

مسز گوہر گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ پیسے مانگنے کی دیر تھی کہ یہ سب ہو گیا۔ اب پاکستان میں وہ کیا فٹ پاتھ پر رہیں گے۔ ان کے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں اور جو حالات اب بن گئے تھے اگر وہ یہاں رہیں تو بھی احمر انہیں سپورٹ نہ کرتا۔

”چلو آؤ فرزام! میرے ساتھ۔“ انہوں نے اسے لے جانا چاہا۔ لیکن اس انداز پر فرزام کو جس صدمے نے آن گھیرا تھا، وہ اس کی بابت بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مسز گوہر اسے چلنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

”پلیز ماما! دوبارہ میرے گھر ایسے لڑائی جھگڑا کرنے مت آئیے گا۔“ احمر یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکا۔ مطلب گھر آئیے گا ہی مت۔

”کیا ماما آپ سے لڑ رہی ہیں؟ آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟“ فرزام جاننا چاہتا تھا۔ مسز گوہر نے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔

”تم اپنی بکواس بند کرو۔“

”میں بکواس کر رہا ہوں؟“

”فرزام! چلو میرے ساتھ۔۔۔“

”ایک سینڈ مام۔۔۔ اذرا کلیئر کر لینے دیں۔ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ آپ ایسے بات کیوں کر رہے ہیں؟“

”مجھے تمہیں ایک روپیہ نہیں دینا۔ سن لیا ماما آپ نے بھی؟ یہ سب میں نے رات دن کی محنت سے بنایا ہے۔ آپ ایسے ہی میرے ساتھ یہ سب نہیں کر سکتیں۔“ فساد کی جڑ وہی پیسہ۔۔۔

”مام! کوئی پیسوں کا مسئلہ ہے؟“ فرزام اپنی مام کی طرف دیکھنے لگا۔ مسز گوہر نے خود کو بولنے سے روک لیا۔ اب تو لڑائی اور ہی بڑھتی نظر آرہی تھی۔

”یہ مجھ سے میرے پیسے مانگ رہی ہیں، تمہیں دینے کے لیے۔“ احمر نے زیادتی اور جھوٹ کی حد پار کر لی مزے سے۔ جب اس نے حد پار کر لی تو مسز گوہر نے بھی سوچا کہ کم سے کم فرزام کو اب تو سچ معلوم ہونا ہی چاہیے۔

”پاکستان میں جو ہماری پر اپڑی تھی، اسے میں نے احمر کے کہنے پر بیچ دیا اور سارے پیسے اسے

دے دیے۔ اب اصولاً اسے تمہارے حصے کے پیسے تمہیں دے دینے چاہئیں۔“
 ”یہ جو آپ اتنا عرصہ یہاں رہی ہیں۔ یہ یہاں رہا ہے، اسے کالج تک بھیجا۔ ہر طرح کے
 اخراجات پورے کیے تو وہ تھوڑے سے پیسے ابھی تک باقی ہیں؟“
 ”تھوڑے سے احمر۔۔۔ ڈھائی کروڑ کا تو صرف میرا گھر ہی تھا۔“

”ڈھائی کروڑ یہاں پر ڈھائی کروڑ نہیں رہتے۔“
 ”ماما۔۔۔!“ فرزام نے اپنی ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
 ”ابھی دو دن پہلے آپ نے مجھے کہا تھا کہ وقت کی زبان پڑھنا سیکھو۔ اب میں سیکھ رہا ہوں تو
 آپ کیوں بھول رہی ہیں؟“

”لیکن فرزام۔۔۔!“ آنسوؤں کی آنکھوں سے نکلنے لگے۔ تانیہ صوفی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے
 بیٹھی تھی، احمر ”ہونہہ“ کی صورت بنائے کھڑا تھا۔

”ماما۔۔۔! احمر بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کو ان سے اختلاف نہیں کرنا چاہیے، آپ آئیں
 میرے ساتھ۔“ مسز گوہر نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں دیکھا اور دکھی ہو گئیں۔ دونوں ماں بیٹا بلڈنگ
 سے باہر آ گئے، بہت دیر تک واک کرتے رہے خاموشی سے۔۔۔

”دو دن بعد میں جا رہا ہوں ماما۔۔۔! یقین چاہیے میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں مجھے بہت عقل آ گئی
 ہے۔ اب میں مرد ہوں۔ رو نہیں سکتا اور ایسا کچھ برا بھی نہیں ہوا ہمارے ساتھ۔ جو کچھ ہوتا ہے، اچھے
 کے لیے ہوتا ہے۔“ وہ آنکھیں صاف کرتی اپنی ماں کو تسلی دے رہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس سب پر مسز
 گوہر بہت دکھی تھیں۔

”آپ بھائی کے پاس ہی رہیں گی۔ جب تک پاکستان میں، میں سیٹل نہیں ہو جاتا۔“
 ”میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ میں نہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ تانیہ کے شوہر کے ساتھ میں
 کہاں رہوں گی؟“

”چند ماہ تو رہیں یہاں۔“

رات گئے تک ان کی واک جاری رہی۔

اگلے دن فرزام نے گتے کے ایک بڑے ڈبے میں کارڈز، کچھ شرفش، چند کھلونے اور چند اور
 مختلف چیزیں رکھیں۔ ڈبا اٹھا کر ٹیوب سے وہ اپنے کالج آ گیا اور گیٹ کے باہر ایک طرف بیٹھ کر انتظار
 کرنے لگا۔

”رومی!“ بیٹھے بیٹھے ہی اس نے اسے آواز دی۔ وہ اپنی تین دوستوں کے ساتھ باہر آرہی تھی۔ وہ
 ان تین دوستوں کو بھی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ انہیں دور سے ہی ہاتھ ہلا کر ”ہائے“ کہا۔ انہوں نے بھی
 ہاتھ ہلایا اور وہیں کھڑی رہیں، نہ چاہتے ہوئے بھی رومی کو اس کے قریب آنا پڑا۔ منہ بنائے کھڑی رہی
 کہ بولو کیا بات ہے۔

”یہ تمہاری چیزیں لایا ہوں۔“ اس نے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

رومی کا منہ اور بڑ گیا۔ ”گھر تو تم ملتیں نہیں۔ سوچا یہیں دے جاؤں۔“

”اس ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟“

”جیسے تمہیں ”محبت“ کا ڈراما کرنے کی ضرورت تھی۔“

”کافی غصے میں لگ رہے ہو۔“ وہ مسخرے ہنسی۔ ”فیک ایٹ اپری۔“

”اب ہی تو غصے میں نہیں ہوں۔ پھر تو تم سے کبھی ملاقات ہو گئی نہیں۔ تم میری دی ایک ایک چیز واپس کر دینا۔“ وہ کہہ کر جانے لگا۔

”اپنی اگلی گرل فرینڈ کو دو گے، میری استعمال کی گئیں چیزیں۔۔۔؟“ وہ ہنسی۔

”اسے دکھاؤں گا اور بتاؤں گا کہ چیزوں سے محبت کرنے والوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ سچی بنی محبت کرنے والے سے۔۔۔ صرف ہنسنے، گانے، مزے کرنے والوں سے۔۔۔ جب تک اسکول، کالج کی ہر لڑکی کا مجھ پر کرش رہا۔ اس وقت تک میں تمہیں عزیز رہا کہ ”میں نے جیت لی فرزام نام کی لڑائی۔“ جب اسی کالج میں میرے خلاف باتیں کی گئیں تو تم نے خرابی کو اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیا۔“

”ہونہہ۔۔۔ اب تو تم پاگل بھی ہو گئے ہو۔“ ہو ہوا وہ اپنی بہن تانیہ جیسی لگ رہی تھی۔

”بہت وقت پر پاگل ہوا ہوں۔ نہ جانے مجھے کیوں لگ رہا ہے۔ میرے ساتھ بہت بڑا معجزہ ہوا ہے۔ مجھے اتنا کچھ معلوم ہو گیا۔ اتنا سب کچھ تو کوکل بھی نہیں بتا سکتا۔ ورنہ میں تو ہر سڑے تمہارے ساتھ مودی پر ہی جاتا رہتا۔“

”معجزہ تو میرے ساتھ ہوا ہے مسٹر فرزام۔۔۔! میری زندگی بچ گئی۔“ بالوں کو جھٹک کر کوٹ کی دونوں جیسوں میں ہاتھ دے کر اس نے کہا۔

”اور میرا دل۔۔۔ تمہاری زندگی نہیں بچی۔ صرف تمہاری پلاننگ محفوظ رہی ہے۔ ایک بڑا گھر ہو، خوب صورت شوہر ہو، ویک اینڈ پر پارٹی ہو، آؤٹنگ ہو۔۔۔ اس برائٹ پلاننگ میں تمہیں مشقت نامی چیز کو ارا نہیں تھی۔ مشکلات تمہیں پسند نہیں اور پاکستان میں ایک تھرڈ کلاس زندگی کا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔“

”اب تم جو چاہو، سوچو۔۔۔ میں تمہیں فارغ کر چکی ہوں۔“ بھرپور طنز کیا۔ اسے طیش دلا نا چاہا۔

”اس پر میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“ جھک کر وہ کورٹش بجالایا۔ رومی پلٹ کر آگے چلنے لگی۔

”رومی۔۔۔!“ اس نے پیچھے سے آواز دی۔ رومی نے صرف گردن موڑ کر دیکھا۔

”نہ جانے مجھے یہ بھی کیوں لگتا ہے کہ تمہاری زندگی میں آنے والے بھی تمہیں بار بار فارغ کریں گے۔ اگر ان میں تھوڑی سی بھی عقل ہوئی تو۔۔۔“

”ہونہہ۔۔۔!“ کی شکل بنائے رومی ڈبے کو وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ اس محبت کا اختتام بہت آرام سے ہو گیا، جس کا رومی صرف چند ہفتے پہلے تک بہت دھوم دھام سے جشن مناتی رہی تھی۔



چھ ماہ وہ پاکستان میں جھنگ میں پایا کے ایک دوست کے پاس رہا۔ وہ کمپیوٹر سائنس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ کالج سے وہ نکالا گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی اور پاکستان میں ابھی کسی بھی کالج میں

ایڈیشن نہیں لے سکتا تھا کیونکہ سیشن شروع ہو چکے تھے۔ اب اسے سیشن ختم ہونے کا ہی انتظار کرنا تھا۔ انکل ہاشمی کی مدد سے اتنا ضرور ہوا کہ اسے ایک کوچنگ سینٹر میں انگلش ٹیچر کی جاب مل گئی۔ ایک اس کی انگلش ہی اچھی تھی اور یہی بڑھا سکتا تھا۔ ماما نے اسے آتے ہوئے پیسے دیے تھے۔ پیسوں کا اسے مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن اب وہ فارغ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ زیادہ وقت کوچنگ سینٹر میں ہی رہتا۔ استقبالیہ پر بھی بیٹھ جاتا۔ جب وہ فرارگریزی میں بات کرتا تو انگلش کے لیے ٹیوشن کا پوچھنے آئے لڑکے لڑکیاں ایڈیشن لے لیتے۔ کوچنگ سینٹر کا مالک اس سے بہت خوش تھا۔ اچھے پیسے دے دیتا تھا۔

چھ ماہ جھنگ میں اس کا اچھا ہی وقت گزر گیا۔ پھر مسز گوہر بھی پاکستان آ گئیں۔ ان کا آبائی شہر لاہور تھا۔ یہیں سے وہ برطانیہ گئے تھے۔ ان کے بانی رشتے دار بھی مختلف ملکوں میں سیٹل تھے۔ ماموں دینی میں رہتے تھے اور احمر کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ نہ ہونے کے سلسلے میں ناراض تھے۔ اتنے ناراض تھے کہ بات ہی نہیں کرتے تھے۔ خالہ کینڈا میں تھیں اور ان کے شوہر قدامت پسند ہی تھے۔ انہیں گوہر خاتون کے کئے ہوئے بال پسند نہیں تھے اور فرزام کے چچا کے ساتھ وہی معاملہ درپیش تھا، جو ان کا احمر کے ساتھ تھا۔ برسوں پہلے انہوں نے بھی ان کے حصے کی گاؤں کی زمین اپنے نام کروائی تھی۔

چند دن جھنگ میں رہ کر وہ دونوں لاہور آ گئے۔ انکل ہاشمی نے ان کے لیے ایک کرائے کے گھر کا انتظام کر دیا تھا۔ یہ گھر ایم او کالج کے قریب تھا۔ بمشکل چارمر لے کا ہوگا۔ تین کمرے نیچے تھے۔ دو کمرے اوپر تھے۔ انہوں نے ایک سال کا ایڈوانس کرایہ دے دیا۔ ان چھ مہینوں میں مسز گوہر نے کسی نہ کسی طرح سے احمر سے کچھ پیسے لے ہی لیے تھے۔ کچھ ان کی اپنی بچت تھی اور پاکستان میں بنائے گئے سونے کے زیورات۔ چند زیورات انہوں نے تانیہ کو دے دیے تھے۔ بانی ان کا خیال تھا کہ اسے ڈیزائن بدلو کر دے دیں گی۔ لیکن آنے والے وقت میں وہ جب اسے کچھ کچھ گئیں تو انہوں نے ایسا کچھ بھی نہ کیا۔

زیورات بھی انہوں نے بیچ دیے۔ دو بیڈروم اوپر سیٹ کر لیے۔ سیکنڈ ہینڈ فرنیچر مناسب اور اچھی حالت میں انہیں آرام سے مل گیا۔ ان دونوں کو زیادہ سامان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

لاہور شہر میں اب پڑھنے والے کم ہی ہوں گے۔ لیکن پڑھانے والے جگہ جگہ اڑے بنا کر بیٹھ گئے۔ فرزام کو اس کا بہت فائدہ ہوا۔ وہ شام سے رات تک تین مختلف ایڈمیوں میں ایک ایک، دو دو، چیرڈز لینے لگا۔ دن میں وہ مسز گوہر کے ساتھ ان کے کام کرتا۔

برطانیہ جانے سے پہلے مسز گوہر اپنے گھر میں بچوں کے روایتی ملبوسات بنانے کا کام کرتی تھیں۔ ایک اچھی لوکیشن میں ایک اسٹور کرائے پر لیا تھا۔ جہاں میٹرل تیار ہونے کے بعد فروخت کیا جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ دوسرے اسٹورز میں بھی ڈسپلے کیا جاتا تھا۔ کوٹھی کے نیچے والے پورشن میں یہی کام ہوتا تھا۔ وہیں ان کا چھوٹا سا آفس بھی تھا۔ احمر سے جب بار بار انہوں نے اپنے ٹھیک ٹھاک چلتے ہوئے کام کے بارے میں کہا تو احمر نے ہزار مثالیں دیں، انہیں سمجھایا کہ وہ یہی کام یہاں بھی کر سکتی ہیں۔ بلکہ یہاں تو ان کے کام کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ انڈین اور پاکستانی تو ترستے ہیں کہ انہیں روایتی پہناوے مل جائیں۔ انہی یقین دہانیوں پر سب بیچ باج چلی گئیں اور آخر میں ان کے ہاتھ گھٹا ہی آیا۔

انہوں نے پرانے کاریگروں سے رابطے کیے۔ لیکن جس معاوضے پر وہ لوگ اب پاکستانی انڈسٹری میں کام کر رہے تھے۔ وہ اتنا معاوضہ انہیں دے نہیں سکتی تھیں۔ اب انہیں کم معاوضے پر لیکن اچھے کام کرنے والے چاہیے تھے۔ کنگ کا کورس تو وہ برطانیہ سے کر آئی تھیں۔ ساتھ ہی دوسرے چھوٹے بڑے کنس کا۔ اسی لیے اب انہیں کنگ ماسٹر رکھنے کی تو ضرورت نہیں تھی۔ دو ماسٹر جی رکھے سلائی کے لیے۔ ایک کاریگر مشینی کڑھائی کے کام کے لیے اور ایک کاریگر فریم ورک کے لیے۔ ایک مہینے سے وہ شاہ عالمی بازار جا کر میٹرل اکٹھا کر رہی تھیں۔ پہلے انہیں یہ سہولت تھی کہ ان کے پاس کاریگر اور مخصوص دکان داروں کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ انہیں کسی کے بھی ہاتھ میٹرل کی فہرست بھیج دیتیں اور پھر جا کر چیک کر کے لے آتی تھیں۔ رنگ ساز کے ساتھ ماہانہ حساب کتاب تھا۔

شاہ عالمی میں انہوں نے پرانے دکان دار ڈھونڈنے چاہے مگر ان میں سے صرف ایک ہی ملا۔ وہ ایک ہی بہت تھا۔ فہرست ہاتھ میں لیے انہیں بار بار بازار جانا پڑتا، پھر اتنا سامان دونوں کو اٹھا کر رکشے میں ڈال کر لانا پڑتا۔ فرزام تو انہیں سامان اٹھانے نہ دیتا۔ لیکن اپنے بیٹے پر اتنا بوجھ ڈالنا انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ شروع شروع میں فرزام شاپریزی پکڑ لیتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے عجیب کام کیا۔ وہ ایک بڑا اور چوڑا کپڑا اپنے ساتھ لے آیا۔ سارے سامان کو اس میں باندھا اور دکان دار کی مدد سے اس نے وہ گھڑی اپنے سر پر کھوالی۔ سڑگو ہر کی چیخ نکل گئی۔

”فرزام! تمہاری گردن میں جھٹکا آجائے گا۔ خدا کے لیے ایسے مت کرو۔ پلیز اسے اتار دو۔“
 ”نہیں ماما۔۔۔! میری گردن ٹھیک رہے گی۔ میں نے بہت سے لوگوں کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ آپ مجھے بھی کرنے دیں۔“

”تمہیں عجیب نہیں لگ رہا؟“ وہ خوف زدہ نظروں سے اس کے سر پر جچی گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ اب گری کہ اب گری۔
 ”نہیں ماما! ایسی باتیں بھی عجیب لگتی ہیں کیا؟“

شاہ عالمی کے رش میں وہ دونوں جگہ بتاتے آگے پیچھے۔ کبھی ساتھ ساتھ گزر رہے تھے۔
 ”مجھے تو بہت مزا آ رہا ہے اس روٹین کا۔ جانتی ہیں ایک بہت بڑی جاپانی کمپنی کا مالک اپنے گھر کی کیاریوں کی خود دکھ بھال کرتا ہے، کھاؤ ڈالتا ہے، کانٹ چھانٹ کرتا ہے۔ جب میں نے اس کے بارے میں پڑھا تو سوچا کہ جب میں بھی اس جتنی بڑی کمپنی کا مالک بن جاؤں گا تو میں بھی ایسے ہی پودوں میں کھاؤ ڈالا کروں گا۔ اپنے جوتے پالش کیا کروں گا۔ پر مجھے اب معلوم ہوا ماما کہ وہ یہ سب کمپنی بنانے سے پہلے کرتا رہا ہے۔ بڑے کام سے پہلے ہی چھوٹے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ان فیکٹ سارے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ان میں شرم نہیں کرنا چاہیے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناما؟“ گھڑی والا سراسر نے ذرا سا موڈ کرا پی ماں کی طرف دیکھا۔

”ہاں! میرے بچے۔ اتنی عظیم باتیں کر رہے ہو کہ مجھے راستہ ہی دکھائی نہیں دے رہا۔“
 ”ہاں!۔۔۔ آنکھیں صاف کر لیں نا۔ بات بات پر رویا مت کریں۔“ وہ ہنسا تو وہ بھی ہنسنے لگیں۔

گھر میں کام شروع ہو گیا۔ دن میں فراز مہمونے لے کر انارکلی، کرشن نگر، باغبان پورہ، گوال منڈی، اچھرہ بازاروں میں، دکانوں پر جا جا کر آرڈرز لیتا۔ دیکھنے میں وہ ذرا انگریز انگریز لگتا تھا۔ انگریزی لب و لہجہ کی اردو بولتا تو بہت ہی پیارا، چھوٹا سا صاحب لگتا، مہمونے دیکھنے والے سوچتے کہ گورا صاحب کام کر رہا ہے، کو الٹی بھی اعلا ہوگی اور باقی میٹرل بھی اور ساتھ ساتھ وہ اپنے گاہکوں سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ”انگریز کی صنعت کے بنے ہیں“ جیسے جاپان کی مشینری، کوریا کی جیولری، ترکی کا فرنیچر اور اب انگریز کے کپڑے۔۔۔

پھر وہ بات بھی بہت اچھے انداز میں کرتا تھا، دکانوں میں جاتا تو اس کی مہمان نوازی کرنے کو ان کا جی چاہتا۔ انہیں آہستہ آہستہ آرڈرز ملنے لگے۔ وہ آرڈرز لیتا بھی اور سلائی بھی کرتا، ایک عدد سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل اس نے لے لی تھی۔ لیکن لاہور کی سڑکوں پر، خاص طور پر اچھرے اور بھائی دروازے کے بازاروں کی چھوٹی بڑی پھنسی ہوئی سڑکوں پر بائیک چلانا امریکا کے سب سے اونچے پل کے موٹے رستے پر بائیک چلانے کے قریب قریب برابر تھا۔ ہر بار واپسی پر آ کر وہ کہتا۔
 ”تیرا اصل زندہ آگیا ماما۔۔۔! جلدی سے امیر ہو جائیں ورنہ میری خیر نہیں۔“ وہ ہنس دیتیں۔



گرمیوں کے دن تھے۔ دونوں ماں بیٹا چھوٹی سی چھت پر کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ قریب قریب کی سب ہی چھتوں سے آوازیں آرہی تھیں۔ گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ پچھلے تین گھنٹے سے بجلی نہیں آرہی تھی۔ رات ایک بجے کا وقت تھا۔ نیند تو اسے بہت آرہی تھی۔ لیکن وہاں بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔
 ”پاکستان میں اب زیادہ ہی گرمی نہیں ہونے لگی؟“
 ”ہاں، اب اتنی گرمی نہیں۔“ وہ ساتھ ساتھ کاپنکھا اسے بھی جھل رہی تھیں۔
 ”لیکن ماما! پہلے مجھے اتنی گرمی نہیں لگتی تھی۔“

وہ ہنسیں۔ ”تب تم ایک کینال کی کھدائی میں رہتے تھے۔ جس کے آگے ایک کھلا لان تھا۔ بہت سے درخت اور پودے تھے گھر میں اور آرکیٹیکٹ نے گھر کو ایسے ڈیزائن کیا تھا کہ وہ گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم ہوتا تھا۔“

”اچھا۔۔۔! ہمارے مالک مکان کو بھی ایسے ہی گھر ڈیزائن کروانا چاہیے تھا۔ دیکھیں، کتنا گرم گھر ہے ان کا۔ اتنی جلدی گرمی آجاتی ہے لاہور میں۔“

”چارمر لے کے گھر کو وہ کیا ڈیزائن کرواتا۔ پھر یہاں زیادہ تر لوگ موسم کو دیکھے بنا ہی گھر بنوا لیتے ہیں اور تم یہ بھی بھول رہے ہو کہ ہمارے گھر میں ایئر کنڈیشنڈ تھا ہر کمرے میں۔ سارا گھر ہی ٹھنڈا تھا۔ جس کا رستے تم اسکول جاتے تھے۔۔۔ وہ بھی۔۔۔ تمہارا اسکول بھی۔ تو بیٹا! ایسے لوگوں کو کیا معلوم کہ پاکستان میں کتنی گرمی اور کتنی سردی ہوتی ہے۔ یہ سب تو کسی اور کو ہی معلوم ہوتا ہے۔“
 ”یعنی غریبوں کو۔۔۔“

”غریب ہونا برا نہیں۔۔۔“

”لیکن مشکل ضرور ہے۔ یہ جو ہمارے پڑوس میں آنی رہتی ہیں نا۔۔۔ بازار سے آرہی تھیں۔ سچ

ماما! گرنے کے قریب تھیں۔ شاید بلڈ پریشر کا مسئلہ تھا انہیں۔ میں نے انہیں بائیک پر بٹھا کر گھر تک چھوڑنے کے لیے کہا تو کہتی ہیں۔ ”بھائی! میرے شوہر نے مجھے چھتر مار کر گھر سے نکال دینا ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”آئی! چھتر کسے کہتے ہیں تو بولیں کہ“ یہ جو تم نے پیروں میں پہن رکھے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو شوز ہیں۔“ تو وہ بولیں۔ ”انہیں چھتر بھی کہتے ہیں۔“

مزگور ہارتا اونچا تھمہ لگا کر نہیں کہہ سکتا کہ آواز ایک دد قریب کی چھتوں تک تو ضرور ہی گئی ہوگی۔

”کیوں اس کا اتنا سر کھایا تم نے۔۔۔ پاگل۔۔۔!“

”میرا پناد ماغ گرمی سے کھو ماہو تھا۔ پانی کی جو بوتل میں پینے کے لیے ساتھ رکھتا ہوں وہ میں نے سر پر ڈال لی۔ ایک چھوٹا لڑکا بازار میں برف دالا پانی بیچ رہا تھا۔ دس روپے میں اس سے بوتل بھر والی اور لڑکے سے کہا کہ تم ضرور بڑے ہو کر کسی بڑے ادارے کی باگ ڈور سنبھالو گے۔“

”کیوں آس دلائی اسے؟ ایسے تو ہمارے ملک میں ہزاروں بچے ہیں۔ کہاں ان کے مستقبل بنتے ہیں۔“

”ارے ماما! اس کا ضرور بنے گا۔ اسکول کے یونیفارم میں تھا۔ تین روپے کا گلاس دے رہا تھا۔ میں نے کہا کہ ”دس کا تو پیو، اتنی گرمی میں بیٹھے ہو۔“ کہنے لگا ”ستر روپے کی برف آئی ہے۔ پانی مفت کا ہے۔ ساتھ گلاس نکل جائیں گے آرام سے، اتنا منافع کافی ہے۔ مجھے ملک میں اور مہنگائی نہیں کرنی۔“

”بہت خوب۔۔۔ کمال کا بچہ تھا۔“

”واپسی پر پیدل جاتا ملا۔۔۔ میں نے اسے گھر چھوڑ دیا۔“

”بہت خوب۔۔۔ تم بھی کمال کے بچے ہو۔“ وہ ہنسیں۔

”اتنی بار اسپرے کیے ہیں میں نے۔ لیکن یہ مجھ پر آخر جاتے کیوں نہیں؟“ وہ بار بار ریکٹ سے مجھ پر مار رہا تھا۔

”اسپرے سارے علاقے میں ہوگا تو ہی مجھ پر ختم ہوں گے وہ بھی شاید۔۔۔“ وہ تیزی سے پنکھا جھلے لگیں تاکہ مجھ پر فزام سے دور رہیں۔

”اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس کہ سارے علاقے میں اسپرے کروادوں۔ لیکن اگر علاقے کے لوگ تعاون کریں تو میں پیسے اکٹھے کر کے کروا سکتا ہوں۔“

”فزام! یہ عام لوگ ہیں۔ ان کی زندگیوں میں اتنے مسائل ہیں کہ یہ لوگ مجھ جیسے مسئلے پر سوچ ہی نہیں سکتے۔ یہ مجھ، بھیاں، گرمی، بجلی کا نہ ہونا، یہ سب ان کے لیے معمول کے اور معمولی مسئلے ہیں۔“

”مسئلے حل کرنے سے حل ہو جاتے ہیں۔ ختم نہیں ہوتے تو کم ضرور ہوتے ہیں۔“

”جن کی زندگیوں میں روٹی کا مسئلہ ہو وہ اور مسئلوں پر کیسے توجہ دیں؟“

”چلیں مان لیا۔۔۔ روٹی، مہنگائی، بے روزگاری۔۔۔ یہ مسئلے ہیں، لیکن ماما! گندگی۔۔۔ یہ تو مسئلہ نہیں ہے نا۔ غریب لوگ غریب ہیں۔ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ گندے کیوں ہیں؟ کیا صفائی سہرائی میں بھی پیسے لگتے ہیں۔ گھروں کے سامنے گندہ ہے۔۔۔ اندر گندہ ہے۔۔۔ بچے گندے ہیں۔۔۔ میں نے گلیوں میں بغیر ٹیکر کے گندے سندے کپڑوں میں بہت بار بچوں کو دیکھا ہے۔۔۔ ماما! عورتوں کو ان

سب کا تو خیال رکھنا چاہیے نا؟ گھروں کے آگے کوڑا پھینکنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ایک جلی کو صاف رکھنے میں کتنے پیسے لگتے ہیں۔۔۔ اور میں جب جب پائپ لگا کر گھر کے آگے دور تک کا حصہ صاف کرتا ہوں تو ساتھ والی آٹنی کے سارے بچے آ کر میرے سر پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک دو چھتوں سے لڑکیاں بھی مجھے دیکھتی ہیں۔ سچ ماما۔۔۔! میں بہت شکر گزار ہوں برطانیہ کا، اس نے میری بہت سے معاملات میں بہت اچھی تربیت کی ہے۔“

اس تربیت کا اس نے ذرا سا استعمال کیا اور گھر گھر جا کر پیسے لیے، وہ ہر ایک کے دروازے پر جاتا، پچھر کے کانٹے پر پچھر دیتا۔ سب دروازوں کی پردوں کی اوٹ میں کھڑی ستنی رہتیں۔ کچھ پیسے پکڑا دیتیں۔ کچھ کہتیں کہ ”ان کے ابو آئیں گے تو ہی جواب دیں گے۔“ ایک آٹنی کو فرزام نے کہہ دیا کہ ”کیا پچھر آپ کو ان کے ابو سے پوچھ کر کاٹتا ہے۔“ وہ تو نہیں ساتھ کے گھروں کی تین اور انیاں بھی دل کھول کر نہیں۔

اسپرے پر آنے والی کل لاگت فرزام نے لگائی تھی۔ گھر بھی گن لیے تھے۔ اب ہر ایک کو ایک جیسی رقم دینا تھی، پیسے اتنے زیادہ بھی نہیں تھے۔ کم از کم وقفہ وقفہ سے تین بار اسپرے ہونا تھا۔ کچھ نے بحث کر کے پیسے دیے کچھ نے بنا بحث کے دے دیے اور کچھ نے سرے سے دیے ہی نہیں۔ جنہوں نے نہیں دیے۔ ان کے فرزام نے اپنے پاس سے ڈال لیے۔ اس کے پاس بھی زیادہ پیسے نہیں تھے۔ لیکن اس نے سوچا بھی تو آہی جائیں گے۔ فی الحال پچھروں کو نہیں آنا چاہیے۔ وقفہ وقفہ سے تینوں اسپرے ہو گئے۔ کشادہ گلی میں سڑک کی طرف ٹکڑ پران کا گھر تھا۔ اندر سے اندر اور گلیاں نکلتی تھیں۔ اسپرے سے انقلاب تو نہیں آیا، لیکن پچھروں کی تعداد بہت گھٹ گئی جنہیں برداشت کیا جاسکتا تھا۔ گلی میں رہنے والی ایک آٹنی اسے ملیں تو بہت پیار سے بولیں۔

”بڑا چنگا ایں تو کا کا!“ (بہت اچھے ہو تم لڑکے)

انہیں آرڈر ز بھی مل رہے تھے اور وہ کام بھی کر رہے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ منافع زیادہ نہیں ہو رہا تھا۔ منافع جزیئر کے پیٹرول میں نکل رہا ہے۔ ہر میٹرل کی قیمت ڈبل سے ٹریبل ہو چکی تھی۔ نیو سیشن میں بھی وہ ایڈمیشن نہیں لے سکا۔ اگر وہ ایڈمیشن لے لیتا تو آرڈر ز اور سپلائی کا کام کون کرے گا۔ کسی اور روکر کو وہ فی الحال انورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ کڈز گارمنٹس کے لکڑی اسٹورز سے بھی انہیں آرڈر ز مل گئے تھے۔ لبرٹی اور مون مارکیٹ کے کچھ اسٹورز سے بھی بات چیت چل رہی تھی۔ لیکن وہ اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ گلبرگ اور ڈیفنس میں کچھ اسٹورز ایسے تھے جن کے ساتھ بات چیت میں کئی گھنٹے گزر جاتے۔ وہ گھنٹوں بٹھا کر یہ سمجھاتے رہے کہ انہیں کس طرح کے فیشن کے کپڑے چاہئیں۔ کن رنگوں کے اور کس کام کے ساتھ۔

فرزام نوٹ کر لیتا تھا۔ آکر ماں کو بتا دیتا تھا۔ لیکن سپلائی کے وقت وہ نقص نکالنے کہ آرڈر دیا نہیں ہے اگر اتنے گھنٹے ماں ضائع کریں گی تو کنگ کا کام کون کرے گا اور اگر اتنے ہی گھنٹے فرزام ان سب کو نوٹ کرنے میں لگائے گا تو باقی کا کام کون کرے گا۔ لیکن وہ ان اسٹورز کو ہاتھ سے جانے بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان سے انہیں بروقت ادائیگی ملتی اور قریب قریب ان کی پسند کی ملتی۔

دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے اخبار میں ایک در کر کے لیے اشتہار دے دیا۔



ایڈ میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہمیں ایک گریجویٹ کی ضرورت ہے جو روانی سے انگلش بول سکے۔

”میں گریجویٹن کر رہی ہوں۔“

”لیکن لیڈی! آپ ہیں تو نہیں نا۔“

”نہیں۔۔۔ لیکن ہو جاؤں گی۔“

”لیکن۔۔۔“ وہ زچ ہو گیا۔ ”دیکھیے! میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں گریجویٹ ہی کیوں چاہیے کیونکہ اس ملک میں ایک گریجویٹ ہی اچھی انگریزی بول سکتا ہے۔“

”میری ایک بھابھی بی اے ہیں۔ وہ تو انگلش نہیں بول سکتیں۔“ اس نے اتنی بے چارگی سے سچ بولا کہ فرزام اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”یہ انٹرویو اسی لیے تھے کہ معلوم کیا جاسکے کہ میرے پاس آنے والا بی اے انگلش بول سکتا ہے کہ نہیں۔“

”ایڈ میں لکھا ہے کہ اسے ڈیزائننگ کی سمجھ بوجھ ہونی چاہیے۔۔۔ تو مجھے سمجھ بوجھ ہے۔ میں کسٹمر کی ڈیمانڈ کو آسانی سے سمجھ سکتی ہوں۔“

”میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن لیڈی! آپ کو کسٹمر سے ڈیل نہیں کرنا۔ آپ کو کچھ گروپس سے ڈیل کرنا ہے جہاں سے آرڈرز لینے ہیں، وہ اسٹورز، گھبرگ اور ڈیفنس میں ہیں۔ کچھ سوسائٹیز میں ہیں۔ عام روٹین میں بھی ان لوگوں کو عادت ہوتی ہے انگلش میں ہی بات کرنے کی۔ ایڈ میں میل فی میل ضرور لکھا ہے، لیکن ہماری ترجیح لڑکا ہے، جو اپنی کنونینس پر آجاسکے۔“

”مجھے کڈز گارمنٹس میں بہت اچھا تجربہ ہے۔ میں جانتی ہوں، میں آپ کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوں گی۔“ اس بار اوڑ بے چارگی سے کہا گیا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کو ایک اچھی جاب کی ضرورت ہے لیکن۔۔۔“ اس کی شکل پر چھائی مایوسی دیکھ کر اسے دکھ ہوا۔

”اچھی جاب کی نہیں، ایک شریف جاب کی۔۔۔“ اسے لگا لڑکی رونے ہی والی ہے بس۔

”یہ جگہ میرے گھر سے قریب ہے۔ میں یہاں پیدل آسکتی ہوں۔“

”میں آپ کے لیے ضرور کچھ کرنا اگر کر سکتا۔۔۔“ اس کی بے چارگی پر اسے ترس آیا۔

وہ چلی گئی۔ وہ وہاں آئی دس لڑکیوں اور پانچ لڑکوں میں سے چھٹی لڑکی تھی، ایک فریش گریجویٹ لڑکے کو فرزام نے اوکے کر دیا۔ انٹرویو ان کے گھر میں ہی ہوئے تھے۔ جہاں ایک کمرے میں انہوں نے ایک میز اور دو کرسیاں رکھ کر اسے بٹالیا تھا۔

رات کو وہ ماں سے اس لڑکی کا ذکر کرنا نہیں بھولا۔

”اس نے کہا کہ اسے ایک شریف جاب کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے بہت برے حالات دیکھے ہیں

اس نے۔۔۔ کہہ رہی تھی کہ لڈز گارمنٹس کی اسے بہت سمجھ بوجھ ہے۔ مام! آپ اسے اپنے ساتھ ملیں
کیوں نہیں رکھ لیتیں۔“

”ہم ایک اور در کر کی تنخواہ کہاں سے نکالیں گے۔۔۔؟“

”ہوسکتا ہے، ابھی وہ کم پیسوں پر مان جائے۔ پھر آنے والے وقت میں ہم اسے زیادہ دے
سکیں۔ میرے انکار پر وہ رونے والی ہوگئی تھی۔ کچھ بچکے مام۔!“

”دیکھ لو۔۔۔ ابھی ہم اتنے منافع میں نہیں جا رہے۔“ نیچے آ کر اس نے وہ فہرست نکالی۔ جس پر
ہر امیدوار کا نمبر لکھا تھا۔ اس نے نمبر کو موبائل میں محفوظ کر لیا تاکہ سچ اسے کسی بھی وقت فون کر سکے۔ پھر
اسے خیال آیا کہ یقیناً آج وہ بہت مایوس ہوگی۔ اگر وہ ابھی فون کر دے تو شاید اس کے لیے اچھا ہی ہو۔
اس نے فون کیا۔ وہ اس لڑکی کی آواز تو بالکل نہیں تھی۔ فرزام نے اپنا تعارف کروایا۔
”مجھے افتخار عبدالقدوس سے بات کرنی ہے۔ آج وہ میرے پاس انٹرویو کے لیے آئی تھیں۔“



اسے نو بجے آنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ سوا آٹھ بجے ہی وہاں تھی۔ مسز گوہر خود فجر کے بعد نہیں
سوتی تھیں۔ اپنا کام کرنے لگتی تھیں۔ اسے وقت سے اتنا پہلے دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی۔ البتہ انہوں نے
اسے کام سمجھا دیا۔ پہلے اسے ہریٹریل کو دیکھ کر فہرست بتانا تھی کہ کون سا میٹرل کتنا ہے۔ بڑے کمرے
میں سب میٹرل رکھا ہوتا تھا۔ اس نے نو بجے یہ کام کر لیا۔ مسز گوہر حیران ہوئیں وہ اچھی خاصی پھر تیلی
تھی۔

”تم نے اس سے پہلے کہاں کام کیا ہے افتخ؟“ اس کی پھرتی دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ وہ کسی بڑے
ادارے میں کام کرتی رہی ہے۔

”میں۔۔۔“ وہ بتاتے ہوئے شرمندہ ہوگئی۔ ”دودن پہلے تک میں ایک ریسٹورنٹ میں کام کرتی
رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ انہیں محسوس ہوا کہ وہ اس بارے میں زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی۔

”چھوٹے سے جس ریسٹورنٹ میں وہ کام کرتی رہی تھی اس میں اس سمیت دو اور لڑکیاں تھیں۔
دو لڑکے تھے، جو آرڈر لیتے تھے۔ وہ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہو کر فاسٹ فوڈ کوٹرے میں رکھ کر آرڈر لانے
والے بوائے کو دیتی تھیں۔ آنے والے کسٹمر خود بھی کاؤنٹر تک آ کر اپنی ٹرے لے سکتے تھے اور تین لڑکیاں
جب کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوں تو وہاں تک آنا کسی کو برا نہیں لگتا تھا۔ افتخ ہر روز کاؤنٹر سے اٹھ کر دس
بارہ وزینگ کارڈز ڈسٹ بن میں بیٹھتی تھی۔ یہی حال دوسری لڑکیوں کا بھی تھا، انہیں ان کی خوب
صورتی کی بنا پر رکھا گیا تھا۔

اس سے پہلے اس نے فڈ انی اسٹڈیم میں نئے نئے بنے ہائپر اسٹار شاپنگ سینٹر میں نوکری کی تھی۔
وہاں بھی اس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اس کا کام ریکس کو چیک کرتے رہنا اور ان میں رکھی گئیں مصنوعات
کی کمی پرا نہیں وہاں لا کر رکھنا تھا، وہ سارا وقت لوگوں کی نظروں میں رہتی۔ آتے جاتے اس کے ہاتھوں
کو، کمر کو کس کیا جاتا۔ بہانے سے اسے کارڈز دیے جاتے۔ یہ سب تو کم تھا۔ اس کے ایک کو لیگ لڑکے

نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کئی ہفتوں سے اس کا نمبر مانگ رہا تھا۔ ریسٹورنٹ کی جانب ملتے ہی اس نے شاپنگ سینٹر کی جانب چھوڑ دی۔

اس جانب میں ایک اور مسئلہ تھا۔ اسے دو بیس بدل کر اتار کھلی سے قدانی اسٹڈیم آنا پڑتا۔ اس کی آدھی تنخواہ کرایہ میں ہی نکل جاتی۔ اماں کی گھر واپسی کے بعد انہوں نے ایک وقت کا کھانا کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ انہیں گرمی نہ لگنے دی جائے۔ انہوں نے سیدھا سیدھا اے سی کے لیے کہا تھا۔ علاج کے سارے اخراجات دانیہ نے اٹھائے تھے تو جو پیسے جمال کے بریس کے مالک اور اسکول کی میڈم نے دیے تھے۔ اس سے انہوں نے ایک سینڈ ہینڈ اسپلٹ اے سی لگوا لیا تھا۔ اماں نے بہت نہ، نہ کی۔ لیکن اس نے بھابھی کے شوہر کو پیسے دے دیے۔ وہ اماں کی زندگی کے لیے زمین آسمان ایک کر سکتی تھی۔

اماں کی بیماری جا چکی تھی۔ لیکن زندگی جیسی بیماری ابھی ساتھ تھی۔ وہ اماں کے اسکول گئی۔ لیکن وہاں اسے تین ہزار میں بچہ رکھا جا رہا تھا۔ ایف اے پاس لڑکی کو اتنے ہی مل سکتے تھے۔ تین ہزار میں تو بجلی، گیس کا بل بھی ادا نہیں ہوتا تھا۔ اماں کے لیے جو مخصوص خوراک آتی تھی، وہ الگ۔۔۔ اس مقام پر ایسا ہوا کہ افق ان سب کی اماں بن گئی۔ اپنی اماں کی بھی اماں۔۔۔ پہلے وہ صرف کام کرتی تھی۔ اب اسے کام کے ساتھ ساتھ سب کچھ سنبھالنا بھی تھا۔ اسے صرف دو وقت کی روٹی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اسے دو وقت کی روٹی جمع بھی کرنا تھی۔ اماں پر جو وقت آیا اور پھر اسے بھیک مانگنی پڑی۔ اس نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ جس بل پر سے وہ گزر کر آتی تھی۔ اس کے اختتام پر ایک عبارت لکھی۔

”خود کو روندے جانے کے لیے تیار مت کرو۔“

افاق کی اب کی بار کسی دکھ، تکلیف یا انسان کے ہاتھوں روندے جانے سے ڈرتی تھی۔ زندگی میں صرف جینا ہی نہیں آنا چاہیے۔ اگر پیچھے سیلابی ریلا آجائے تو بھاگنا آنا چاہیے اور اگر ریلا آجائے تو شیرنا آنا چاہیے۔ زندگی میں صرف کھانا اور سونا ہی نہیں آنا چاہیے۔

انسان کوئی جانور نہیں ہے کہ شیر صرف دھاڑ ہی سکتا ہے اور مچھلی صرف تیر ہی سکتی ہے۔ کوئل گائے گی اور سانپ پھنکارے گا۔ بندر درختوں پر چڑھے گا اور خرگوش صرف زمین کھود کھود کر سرنگ اور گھروندے بنائے گا۔ یہی سب تو انسان کو جانور سے الگ کرتا ہے کہ انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے فطرت نے ایک خاص خوبی تک پابند نہیں کیا۔ پھر بھی لوگ جانوروں کی طرح خود پر بوجھلد والیتے ہیں، چابک کھاتے ہیں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے پیر تک چانتے ہیں۔

افق نے تین ہزار کی وہ اسکول کی نوکری کر لی۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری نوکری کے بارے میں معلومات کرنے لگی۔ اگلی نوکری اسے ساڑھے تین ہزار میں ایک لیڈی ڈاکٹر کے کلینک پر ملی۔ اسے کاؤنٹر پر بیٹھ کر نوکرن دینے ہوتے، فون ریسرو کرنے ہوتے اور باری باری ہر نوکرن نمبر کو اندر بھیجتا ہوتا۔ پھر اسے شاپنگ سینٹر کی جانب کے بارے میں معلوم ہوا۔ وہاں اسے دس ہزار دیے جا رہے تھے۔ جیسے تیسے اس نے وہ جانب کی اور پھر گوال منڈی میں بنے ایک نئے ریسٹورنٹ میں آگئی، یہاں اسے چھ ہزار ملتے تھے، لیکن جمال اسے سائیکل پر یہاں چھوڑ جاتا تھا۔ جمال نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ جمال نے کہا

کہ وہ پرائیویٹ پڑھ لے گا اور پڑھنے کا کیا ہے زندگی میں کبھی بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

رات کو دونوں بھائی پولیس جاتے اور دن میں جمال ایک کپڑے کی دکان پر کام کرتا۔ اماں گھر میں اکیلی ہوتیں۔ بھابھی ہی آ کر پوچھتی رہتیں۔ مسز گوہر کے یہاں بھی وہ انہی کے ساتھ آئی تھیں۔ انہی کے شوہر نے اخبار میں وہ ایڈ دیکھ کر دونوں کو بھیجا تھا۔ ریسٹورنٹ کے ماحول سے وہ عاجز آ چکی تھی۔ اب وہ چند ہزار کے لیے خود کو ہر روز نیلام نہیں کر سکتی تھی۔ مسز گوہر نے اس سے کہا کہ منافع زیادہ ہوتے ہی وہ اس کی تنخواہ بڑھا دیں گی۔ ایک بند گھر میں ایک عورت کے ساتھ اسے کام کرنا تھا اور اسے بہت سکون تھا۔

جب وہ فیکٹری جایا کرتی تھی، تب ہی سے اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی ڈیزائنر بنے۔ اماں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ حالات اچھے ہوتے ہی وہ اسے ایک چھوٹا سا کورس تو ضرور ہی کرا دیں گی۔ ایک دوبار اس نے ایک دو خا کے فیکٹری کی ڈیزائنر کو دکھائے تھے۔ چند تکنیکی تبدیلیاں کر کے ڈیزائنر نے وہ کپڑے ڈیزائن کر دیے تھے۔ اس میں سیکھنے کی زبردست صلاحیت تھی۔

اس نے گھر سے نکلنے سے پہلے بہت سے کام کیے تھے۔ فرما، گوند لگے خا کی لفافے، کاج، بٹن، ریڈی میڈ کپڑوں پر کارل لگانا، ڈیکوریشن پیسز کی تیاری، جیولری، ہنڈ بیگ، ڈیزائنر جوتوں پر اسٹون لگانے کا کام۔ وہ ہر کام تیزی سے کرتی، نفاست سے مکمل کرتی۔ یہی ماضی کا تجربہ تھا کہ مسز گوہر کی مدد کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ مسز گوہر کپڑے کی ہر ساز کی کنگ کرتی تھیں۔ اس پر پھر امیر بیڈی اور اسٹون ورک ہوتا، پھر انہیں سلائی کیا جاتا، آخری کام انہیں اچھی طرح دیکھ کر ٹاکوں کو چپک کر کے، ساز کو پھر سے ٹاپ کر پیک کرنے کا ہوتا، ہر آرڈر کو الگ الگ پیک کرنا ہوتا۔ کس رنگ، میٹر ٹیل، ڈیزائن کے نمونے تھتے بنیں گے۔ یہ بھی الگ الگ فہرست میں درج کرنا ہوتا۔ آرڈر ڈیور کرنے کی تاریخ ذہن میں یاد رکھنی ہوتی، مسز گوہر کا اصول تھا کہ وہ ایک بھی دن آرڈر لیٹ نہیں کرتی تھیں۔ اکثر رات رات بھر بیٹھ کر وہ اور فرزام کام کرتے۔

افق ماضی میں اتنے سارے کام کر چکی تھی۔ اسے یہاں کوئی مسئلہ درپیش نہ ہوا۔ فیکٹری میں جو اس نے تھوڑی بہت کنگ سیکھی تھی۔ وہ یہاں کام آگئی۔ وہ پانچ ماہ کی بچی کی شلوار قمیص آرام سے کاٹ لیتی۔ ماسٹر جی سلائی کرتے۔ وہ اگر فارغ ہو جاتی تو تیسری مشین پر بیٹھ کر سلائی کرنے لگتی۔ قیصوں پر۔۔۔ چھوٹے چھوٹے شراردوں پر تھوڑے بہت اسٹونز لگتے ہوتے تو وہ اٹھتے بیٹھتے آرام سے لگا لیتی۔ مسز گوہر کو شرمندگی ہوتی۔ ٹھیک ہے، وہ ان کی مدد کے لیے ہے۔ لیکن مدد سے ان کا مطلب اوپر کا کام تھا۔ کار گیروں والا کام نہیں۔۔۔ وہ گھر اس وقت نہیں جاتی تھی، جب وقت پورا ہو جاتا تھا۔ وہ اس وقت جاتی تھی، جب کام ختم ہو جاتا تھا۔ پہلے وہ صبح آٹھ بجے آتی تھی۔ پھر وہ سات بجے ہی آ جاتی۔

”میرا بیٹا کہتا ہے کہ میں بہت محنت کرنے والی خاتون ہوں۔ لیکن افق! تم بہت بہت محنت کرنے والی لڑکی ہو۔ تم تو جن ہو۔ تم کھلتی نہیں۔۔۔ کیا کھاتی ہو؟“

”انسانوں کو کام نہیں، صدمات تھکا دیتے ہیں اور اب کام میرے لیے صدمہ نہیں۔ آپ کو نہیں معلوم، مجھے اس کام میں کتنا مزہ آتا ہے۔ ہم روز نیا کام کرتے ہیں۔ نئے ڈیزائن پر، نئے رنگ پر، نئے

کپڑے پر۔ رات بھر یہ رنگ میری آنکھوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ میں صبح تک ان سے ملنے کے لیے بے چین رہتی ہوں۔“

”ایسا ہی میرے ساتھ تھا۔ میرے شوہر گاؤں سے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی محنت سے تعلیم مکمل کی اور جاب کی اور پھر مجھ جیسی عام سی لڑکی سے شادی کی۔ میں صرف بارہ جماعتیں پاس تھی۔ جس آنکس میں وہ کام کرتے تھے۔ میں وہاں آپریٹر تھی۔ لیکن مجھے ڈیزائنر بننے کا بہت شوق تھا۔ جب ہم اپنا گھر بنا چکے تو انہوں نے میرا شوق پورا کر دیا۔ مجھے بتایا کہ کیسے میں گھر پر رہ کر اپنا کام کر سکتی ہوں اور واقعی ایسا ہو گیا۔ میرے بنائے ملبوسات کو پسند کیا جانے لگا۔ میں ایک بڑے نام کی ڈیزائنر نہیں تھی لیکن جو بھی تھا، میں خوش تھی۔ میں اپنی مرضی سے ڈیزائن کرتی اور اسے پسند کیا جاتا۔ اتنے سال برطانیہ میں، میں نے اس شوق کو دبائے رکھا۔ رنگ مجھے بے چین کر دیتے۔ میرے ہاتھوں میں آنے کے لیے مچلتے۔۔۔ اب میں اس چھوٹے گھر میں رہ کر چھوٹے سے پیمانے پر بہت محنت سے کام کر رہی ہوں۔ لیکن میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوں۔ تم اپنے ذہن میں آنے والے کسی بھی ڈیزائن کا خاکہ مجھے دکھا سکتی ہو۔ اچھا ہوا تو ہم اس پر کام کر لیں گے۔ کتنا ہی پڑھ کر ہی سب کام نہیں آتے۔“

افق مسکرانے لگی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اسے یہ پہلی خوش خبری ملی تھی۔ اس نے زندگی بھر کام کیا تھا۔ خواب نہیں دیکھے تھے۔ خواہش نہیں کی تھی۔ وہ اپنی چادر کو جانتی تھی۔ لیکن ایک آدھ خواب ضرور پالنا چاہیے۔ اس خواب کے پیچھے ضرور بھاگنا چاہیے۔ اس خواب کے لیے جان توڑ کوششیں ضرور کرنی چاہیے۔ اگر یہ خواب نہ دیکھے جاتے تو دنیا کبھی مائی ترنی نہ کرتی۔ اب افق نے پیسے، ضرورت سے ہٹ کر ایک خواب دیکھا۔ اپنے کامیاب ہونے کا۔

آدھے سے زیادہ کام وہ گھر لے جاتی تھی۔ کپڑوں کے تھان کے تھان وہ جمال کی سائیکل پر رکھ کر گھر بھجوا دیتی اور رات بھر بیٹھ کر چھوٹے سائز کے کپڑے کاٹ لیتی۔ پیپر پر خا کے بناتی کہ کس پرکس ڈیزائن کا کام چاہیے، کس رنگ کا، کس اسٹون کا۔ یہاں اسے فیکٹری میں کام کا تجربہ مدد دینے لگا۔ وہاں ایک ایک کام کو تفصیل میں اور ترتیب سے کیا جاتا تھا۔ کالر کس رنگ کا ہو، بٹن کس رنگ، سائز کے ہوں گے، کہاں کہاں لگے گے، پاکٹ کہاں ہوگی، زپ کہاں، کس رنگ کے ساتھ، کس رنگ کی میچنگ ہوگی۔

وہ ایک چھوٹے لیول کی لوکل فیکٹری تھی۔ لیکن اس اتنی سی فیکٹری میں کام بہت ترتیب سے ہوتے تھے۔ کوالٹی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ فیورک کو چیک کیا جاتا تھا۔ ایک انچ کی کمی بیشی نہیں کی جاتی تھی۔ ایسے پیسز جن میں کمی بیشی ہو جاتی تھی انہیں ادھیڑ کر نئے سرے سے سلائی کر دیا جاتا تھا۔ اس معاملے میں ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ کا ایک ہی اصول تھا۔ وقت اور قوت کتنی ہی صرف ہو، کوالٹی میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ رات بھر بیٹھ کر وہ کنگ کرتی، خا کے بنا لیتی، خا کے پر بنیادی باتیں لکھ دیتی اور صبح پہلے خود جاتی، پھر جمال سائیکل پر سامان چھوڑ جاتا۔ مزوگو ہر چیک کرتی تھیں۔ کمی بیشی دور کر کے، اوکے کر کے کارمیکروں کے سپرد کر دیتیں۔ آرڈرز کی تیاری میں تھوڑی سی تیزی آگئی۔ مزوگو ہر وقت کی کمی کی وجہ سے زیادہ آرڈرز نہیں لیتی تھیں۔ اب ایک دو آرڈرز اور لینے لگیں۔ فارغ وقت میں وہ گلبرگ اور ڈیفنس کے

اسٹورز میں جا کر ڈسکس کر لیتیں کہ ان کی ڈیمانڈ کیا ہے۔ اس طرح انہیں آسانی رہنے لگی۔ وہ وہی ڈیزائن کر دیتی جو ان کی ڈیمانڈ ہوتی، جو انہیں چاہیے ہوتا۔

ایک دن شام گئے انہیں گلبرگ کے ایک اسٹور سے فون آیا کہ ایک میڈم ہیں انہیں انارکلی فراک تین مختلف سائز ز اور رنگوں میں چاہیے، میڈم کو ان کا نمبر دے دیا گیا، مزگورہ نے ان سے بات کی۔ اگلے دن ان کے کزن کی بارات تھی اور انہیں وہ انارکلی فراکیں اپنی بھانجیوں کے لیے چاہیے تھیں۔ اسٹور پر موجود ایک وہ اپنی بیٹی کے لیے لے چکی تھیں۔ ان کی بھانجی کو بھی وہی پسند آگئی تھی۔ لیکن اس کے سائز کی اور موجود نہیں تھی۔ مزگورہ کو یہ پہلا ذاتی آرڈر مل رہا تھا اور ان کا ماننا تھا کہ کبھی بھی کسٹمر کو ”نہ“ نہیں کہنا چاہیے۔ لیکن ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ کار میگر جانے والے تھے۔ میٹرٹل موجود تھا۔ فراکوں کے دامن اور گلے پر اسٹون درک ہوا تھا۔ صرف اسٹون درک کے لیے ہی انہیں آٹھ گھنٹے چاہیے تھے۔ معذرت کے ساتھ انہوں نے انکار کر دیا۔

”آپ کو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ افتی کو انکار پر اعتراض تھا۔
”کیا کرتی۔۔۔ دو گھنٹے تک سب ہی کار میگر چلے جائیں گے۔“ انہیں کل دن میں بارہ بجے تک چاہیے۔

”آپ ان سے بات کریں اور ان سے کہیں کہ اگر اسٹون درک تھوڑا ہلکا ہو جائے تو۔۔۔ آپ جانتی ہیں کہ بچے ایک چیز پسند کریں تو انہیں وہی چاہیے ہوتا ہے۔“
”تو بھی ہم کیسے کام کریں گے افتی۔۔۔! وقت نہیں ہے۔“
”آپ کار میگر دوں سے بات کریں میڈم! اگر وہ آج رات کام کر لیں گے تو آپ انہیں کل کی چھٹی دے سکتی ہیں۔“

”اگر کل انہیں چھٹی دے دی افتی! تو باقی آرڈر کون تیار کرے گا۔ ہم صرف تین بچوں کے لیے اتنا کچھ کیوں کریں گے؟“
”ہو سکتا ہے، وہی میڈم ہمیں اور آرڈر بھی دے دیں۔ وہ ہماری باقاعدہ کسٹمر بن جائیں۔ ہمیں ان سے آرڈر ملتے رہیں۔“

”لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں کوئی فائدہ نہ ہو۔“
”فائدہ ہو بھی سکتا ہے۔ ہماری فیکٹری میں ایسے آرڈرز کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔“
کافی دیر تک سوچنے کے بعد انہوں نے بیگم کو فون کیا۔ انہیں تفصیل میں بتایا کہ انہیں کتنے کام میں فراکیں مل سکتی ہیں۔ اس نے ہاں کہہ دی۔ اپنی مرضی کے تین مختلف رنگ بتا دیے۔ رنگ سازی مزگورہ خود ہی کر لیتی تھیں۔ رنگ سازانورڈ نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک مقامی ادارے میں دو گھنٹے ہر روز جا کر انہوں نے رنگ سازی سیکھ لی تھی۔ سفید شیفون کو انہوں نے بیگم کے بتائے رنگوں میں رنگا۔ اس دوران افتی نے چوڑی دار پاچا جے کاٹ دیے۔ سلائی ماسٹر پاچا جے سینے لگے۔ سارے کار میگر رات بھر کام کے لیے مان گئے تھے۔ اگلے دن کی چھٹی بھی انہیں مل رہی تھی اور رات کے کام کے الگ پیسے بھی گھر فون کر کے افتی نے اپنے کام کے بارے میں بتا دیا تھا۔ مزگورہ ایک بار اس کے گھر جا کر اماں سے مل آئی تھیں۔

دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہی تھیں۔

رات بھر کام ہوتا رہا۔ دونوں کاریگروں نے مل کر پہلے ایک کو اڑے پر لگایا۔ اس پر کام کیا۔ پھر دوسری کو۔۔۔ اس دوران سلائی ماسٹر ان کی ڈبل سلائی کرتے رہے۔ مسز گوہر اور افاق دونوں پر دوسری مشینوں سے بناری فیتہ لگاتی رہیں۔ مسز گوہر نے ہی انہیں کھانا منگوادیا تھا۔ درمیان میں آدھے گھنٹے کے وقفے سے وہ لوگ باری باری آرام کرتے رہے تھے۔ صبح فجر کے وقت دونوں کاریگر اپنے کام سے فارغ ہو کر چلے گئے۔ اگلے تین گھنٹوں میں ماسٹر صاحبان بھی چلے گئے۔ آخری مراحل میں دونوں نے سلائیاں چیک کیں۔ ساز کو تاپا، انہیں استری کیا اور پیک کر دیا۔

جمال، افاق کو لے کر گھر چلا گیا۔ بارہ بجے بیگم اپنے ڈرائیور کے ساتھ آکر ساز اور کام چیک کر کے لے گئیں۔ بیگم وہی قیمت دے گئی تھیں، جو مسز گوہر نے مانگی تھی۔ انہوں نے ایمر جنسی کام کیا تھا۔ مسز گوہر نے ڈبل قیمت مانگی تھی۔ وہ ڈبل ہی دے گئی تھیں۔

”بس بچے ہیں نا۔ جو چیز دیکھ لیتے ہیں، وہی مانگتے ہیں۔ میں کل ہی اٹلی سے آئی تھی۔ خریداری کرنے لگی تو آپ کی فراک بیٹی کو پسند آگئی اور وہی بھانجی کو۔۔۔ میری سسٹر نے کہا کاب باقی سب بھی ایسی ہی مانگیں گی۔ میرے لیے تو بہت مشکل ہو جاتا۔۔۔ پھر اتنا ردی ہیں یا یہ سب۔۔۔“

یہ ان کا پہلا آرڈر تھا، جسے انہوں نے راتوں رات مکمل کیا تھا۔ مسز گوہر کا خیال تھا کہ شاید انہیں ایسا کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ الٹا کاریگروں کو چھٹی دینی بڑی ادواب اگلے آرڈر لیٹ ہو جائیں گے۔

دودن وہ اسی پچھتاوے میں رہیں افاق سے بھی ذکر کیا۔ وہ شرمندہ ہوئی کہ شاید اسی کے مشورے کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے لیکن ایسا ہوا کہ کچھ اچھا نہیں ہوا بلکہ بہت اچھا ہو گیا۔ وہی بیگم ایک ہفتے بعد اپنی بہن کے ساتھ ان کے پاس موجود تھیں۔ دو ماہ بعد ان کی بہن کے دیور کی شادی تھی برطانیہ میں۔ بہن بھی وہیں کی رہنے والی تھیں۔ بہن نے اپنی دو بیٹیوں، مندی تین، جیٹھ کی ایک بیٹی کا ساز لکھوادیا۔ رنگ اور ڈیزائن نوٹ کروادیے۔ لہنگے، چولی، انارکلی، چوڑی دار، گھیر دار شلوار وغیرہ۔ انہوں نے الگ الگ سب کے لیے تفصیلات بتادیں۔ چار فنکشنوں کے لیے چھ بچیوں کے کپڑوں کا آرڈر مل گیا۔ بجٹ وہ بتا گئیں اور اچھا خاصا ٹھیک ٹھاک بجٹ تھا وہ۔ صرف اپنی ہی بیٹی کے لیے بارات کی انارکلی فراک وہ چالیس ہزار کی بنوا رہی تھیں۔ آرڈر تیار کرنے کے لیے ان کے پاس ایک ماہ تھا۔ وہ آرام سے بنا سکتے تھے۔ کاریگروں کے ساتھ مسز گوہر کا بولس کا وعدہ تھا۔ اس آرڈر پر انہوں نے ہر کاریگر کو بولس دیا۔

چند ڈیزائن جو وہ منتخب کر گئی تھیں۔ ان میں سے ایک شرارے کا ڈیزائن تھا، جو افاق کا تیار کیا گیا تھا۔ شرارہ بہت ہلکا چمکا سا تھا۔ فیروز کی رنگ کا شرارہ تھا اور ہلکے گلابی رنگ کی گرتی تھی۔ گرتی پر سفید اسٹونز کا چھن تھا۔ دو پٹا فیروز کی اور گلابی رنگ کا تھا اور اس پر بھی سفید اسٹونز کا چھن تھا۔

پندرہ دن میں انہوں نے اپنے کام کے دوران ان کا آرڈر بھی تیار کر دیا۔ اپنا پہلا فارن آرڈر۔ سارا سامان برطانیہ بھیجا دیا۔

شب منٹ وصول کرتے ہی انہوں نے تین اور بچیوں کے ساز نوٹ کروائے۔ ایک ہفتے بعد چھ اور بچیوں کے۔۔۔ مسز گوہر تین سال سے بارہ، تیرہ سال کی بچیوں کے کپڑے بناتی تھیں لیکن پرزور

درخواست کے ساتھ انہوں نے چھ ماہ، نو ماہ، ڈیڑھ سال، ڈھائی سال کی بچیوں کے لیے بھی کپڑے بنوائے۔ انہوں نے شاید شادی میں شرکت کرنے والے ہر خاندان میں موجود ہر بچی کا سائز انہیں لکھوا دیا تھا۔ اسی آرڈر سے منسلک ان سے تین، چار مختلف لڑکیاں فون پر گاہے بگاہے بات کرتی اور بتاتی رہتیں کہ انہیں کس طرح کے کپڑے چاہئیں۔ ان کا پہلا فارن آرڈر جس سے انہیں ایک بڑا منافع ملا۔ برطانیہ جیسے ملک میں جہاں شادی بیاہ کے روایتی کپڑوں کی خریداری مشکل کام ہے اور چھوٹی بچیوں کی تو بہت ہی مشکل ہے۔ اس میں ان کے ہاتھ ایک لوکل ڈیزائنرز آگئی جو کہ ان کے نزدیک بہت مناسب قیمت پر اچھے کپڑے بنا کر دے دیتی تھیں۔

اس آرڈر کو تیار کرنے میں انہیں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب آئے دن انہیں وہاں سے فون کا لڑ آنے لگیں اور وہاں سے گاہے بگاہے آرڈرز ملنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کا ریفرنس دے دے کر کہتیں کہ انہیں فلاں نے ان کا نمبر دیا ہے، فلاں نے دیا ہے۔ ایک سے دواور دوسے کئی دوسرے کسٹمرز انہیں آرڈر دینے لگے۔



”ماما۔۔۔! یہ جولا کی آپ کے ساتھ کام کرتی ہے نا، اسے کسی یورپین ملک میں ہونا چاہیے تھا۔“
”وہ کیوں۔۔۔؟“

”ارے ماما۔۔۔! یقین جانیں۔۔۔ میں نے ابھی تک کسی لڑکی کو سائیکل کے پیچھے ایسے بیٹھے نہیں دیکھا۔ سارے لاہور میں ایک بیوی واحد لڑکی ہوگی سائیکل کے پیچھے بیٹھے والی۔“
”تم نے سارا لاہور دیکھ لیا؟“ وہ مسکرائیں۔

”سارا انہیں دیکھا۔ جتنا بھی دیکھا ہے۔ اس میں وہ واحد ہے۔ شاہراہ قائد اعظم جیسی پر رونق سڑک پر وہ سائیکل پر بیٹھ کر سفر کرتی ہے۔ بہت اعتماد ہے اس میں۔“
”اعتماد نہیں فرزام! وہ ان باتوں کو معمولی جانتی ہے۔ اگر وہ پاکستانی معاشرے میں نہ ہوتی تو وہ خود سائیکل چلایا کرتی۔ بس کی کنڈیکٹر بھی بن جاتی۔ اسکول بس چلاتی۔“

”اسی لیے تو کہا کہ اسے یورپ میں ہونا چاہیے تھا اتنی لمبی چادر لپیٹ کر وہ پیچھے بیٹھتی ہے، کسی دن سائیکل میں چادر چھنسی نا تو جس سڑک پر وہ گرے گی، اس پر سے مر کر ہی اٹھے گی۔“
”ایسے نہ ہو پاگل۔۔۔“

”ارے ماما۔۔۔! محنت سے کام کرنے والوں کے لیے پاکستان بہت سخت ملک ہے۔ عورتوں کے لیے خاص طور پر۔ عزت بھی سنبھالو، کپڑے بھی اور انا بھی۔ ان معاملات میں پاکستانی عورت دنیا کی دوسری عورتوں سے زیادہ سختی ہے اور اگر اس عورت کا معاشرہ ذرا سا ساتھ دے تو یہ عورت کہاں سے کہاں جا پہنچے۔“

”تمہیں وہ سائیکل پر بیٹھی اچھی نہیں لگتی؟“

”اچھی بری نہیں ماما بڑا ہونا سمجھتا ہوں میں خود کو اس کے سامنے۔ اس کے سامنے ہی نہیں، اپنے کارگر اسلم کے سامنے۔۔۔ جمال اور اسد کے سامنے۔۔۔ اس دن افق نے دس بار اسے گھر بھیجا

چیزوں کے لیے۔۔۔ اما! وہ دس چکر لگا کر آیا۔ پانچویں چکر میں، میں نے اسے پیسے دیے کہ رکشہ کر لو اور اس میں سب چیزیں لے آؤ تو بولا، ”فرزام بھائی! آپ کو کتنی عادت ہے پیسے ضائع کرنے کی۔ ان پیسوں میں ایک کلویسب آجائیں گے۔ انہیں میں اور کھائیں۔ میرے پاس وقت بھی ہے اور طاقت بھی۔۔۔ مجھے انہیں استعمال کرنے دیں۔“ جیسے اس نے دس چکر لگائے اما! میں اسے دیکھ دیکھ کر تھک گیا۔ لیکن وہ نہیں تھا۔۔۔ کچھ دن پہلے میں ان کے پریس چلا گیا۔ اتنی گندی جگہ پر پریس ہے اما! کہ بتا نہیں سکتا۔ دوٹی گلی ہوگی، جس میں سے گزر کر آگے پریس خانہ تھا اور اتنی بدبو اور گرمی وہاں۔۔۔ اسد اتنا پیارا لڑکا ہے، نیلی آنکھیں ہیں اس کی، اتنا خوب صورت ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ مجھے بہت ترس آیا اسے اتنے کندے چلے میں وہاں دیکھ کر۔ میں نے جمال سے کہا کہ میں اس کے لیے کسی اور نوکری کا پتا کر دوں تو کہتا ہے کہ ہمارے مالک نے ہمیشہ ہمارے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔ آج کل وہ بیمار ہیں۔ ان کا کام ہم سنبھال رہے ہیں۔ ایسے انہیں چھوڑ کر کبھی بھی نہیں جائیں گے۔“ وہ بے حد متاثر نظر آ رہا تھا۔
مسز گوہر مسکرا دیں۔

”اما! میں نے آپ کو کبھی بتایا نہیں۔ لیکن میں اپنی زندگی کے اس طرح بدل جانے پر بہت دکھی تھا۔ برطانیہ سے نکالے جانے پر۔۔۔ اس بنا جلی کے ملک میں رہنے پر۔۔۔ اور اب میں بہت شرمندہ ہوتا ہوں کیونکہ لاکھوں سے کم تر ہو کر کوڑوں سے میں بہتر ہی رہا۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی اصول اور فلسفہ نہیں بنایا۔ جمال کے پاس اصول ہیں۔ اسد کے پاس بھی ہیں۔ ماسٹر جی اور اسلم کے پاس بھی ہیں اور پانی بچنے والے بچے تک کے پاس اصول ہیں۔ لیکن میرے پاس نہیں۔ اما! جب ہم ایک پر اسٹاش زندگی گزارتے ہیں تو ہم صرف چیزوں کے نام اور انہیں استعمال کرنا ہی سیکھتے ہیں۔ لیکن جب ہم جدوجہد میں آتے ہیں مصائب کا شکار ہوتے ہیں تو تو ہی ہمیں اپنے اصل اور فعل کا پتا چلتا ہے۔ تب ہی ہم تانے سے سونا بنتے ہیں۔ یہ ماسٹر جی ہیں۔ مشین خراب ہو جاتی ہے، گھنٹوں ٹھیک کرتے رہتے ہیں جبکہ یہ ان کا کام نہیں۔ پنکھا خراب ہوا، وہ بھی ٹھیک کر دیا۔ خود ہی جا جا کر پیڑول لاتے رہتے ہیں جزیئر کا۔ کبھی نہیں جانتا کہ میں تمہارے اتنے کام کر دیتا ہوں اسلم کو میں نے اپنی کچھ شرس دینا چاہیں تو کہتا ہے، ”بھائی جی! کسی ضرورت مند کو دیں۔ میں تو اچھے خاصے رزق والا ہوں اگر ایک بار لینے والوں میں سے ہو گیا تو دینے والا کبھی بھی نہیں بن سکوں گا۔“ اما! وہ دینے والا بننا چاہتا ہے بتائیے مجھے اما! عظمت کی اور کیا نشانیاں ہوتی ہیں۔“

مسز گوہر کو دس رکھے اس کے سر کو پیار سے سہلاتی رہیں۔

”اس دن آپ اسٹور جانے لگیں۔ آپ اپنے کپڑے اور جو تے نکال کر رکھ گئیں۔ اما! میں نے دیکھا کہ افق نے آپ کی جونی کو کپڑے سے صاف کر دیا اور ویسے ہی واپس رکھ دی کہ آپ کو معلوم نہ ہو سکے کہ اس نے صاف کی۔ میں بچن کی کھڑکی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی آپ کے جوتے تو کبھی میں نے بھی صاف نہیں کیے۔“

”مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ میرا بہت احترام کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں، وہ ایسی ہی ہے۔“
”وہ جیسی بھی ہے۔ ایسے بنے بنائے تو پیدا نہیں ہوتے نا؟ ایسا تو خود کو بنانا پڑتا ہے۔ اب آپ

مجھے بتائیے کہ کیا میں کچھ کچھ ان سب کے قریب کا ہو سکتا ہوں؟“
 ”میرا بیٹا پیارا ہے۔“ انہوں نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔

فرزام نے کانچ میں بی ایس سی کرنے کے لیے ایڈمیشن لے لیا۔ اس کے پاس اب اتنا وقت ہوتا تھا کہ وہ کانچ جاسکے۔ آمدنی بھی اچھی ہوگئی تھی۔ کانچ سے آکر وہ آرڈرز کے لیے چلا جاتا۔ دوسرا لڑکا ان آرڈرز کو سپلائی کر دیتا۔ باقی لوگوں سے مسز کو ہرفون پر رابطہ کر لیتیں یا خود چلی جاتیں۔ اب ان کے پاس چار کارکن اور تین ماسٹر جی ہو گئے تھے۔ بہت سی بڑی دکانوں والے انہیں گھر کے آفس میں آکر مل لیتے تھے۔ وہیں سب حساب کتاب ہو جاتا تھا۔ لڑکیوں کے لیے کپڑے کے بنے پاؤچ کا کام بھابھی کے سپرد تھا۔ یہ ان کے کپڑوں میں مفت کا آئٹم تھا، جو انہوں نے شامل کیا تھا۔ اس آئٹم کے شامل کرنے سے ان کے کپڑوں کی مانگ میں اضافہ ہوا تھا۔ چھوٹی بچیوں کو ہینڈ بگ اور پرس کا بہت شوق ہوتا ہے تو اس سے کپڑے کی فروخت میں واضح فرق آیا۔ کپڑے کے یہ پاؤچ کسی وقت میں افق اور بھابھی نے درجنوں کے حساب سے بنائے تھے۔ یہ پاؤچ دلہنوں کے لیے بنوائے جاتے تھے۔ اس نے مسز کو ہر کو بچیوں کے لیے چھوٹے سائز میں بنانے کا مشورہ دیا، جو انہیں اچھا لگا اور ان کا آئیڈیا مقبول ہو گیا۔ یہ آئیڈیا فارن آرڈرز کے ساتھ زیادہ مقبول ہوا۔ انہیں تھیم بتائی جانی اور ایک سے پاؤچ بنوائے جاتے۔ ان کا یہ آئٹم ریڈی میڈ کپڑوں کے ساتھ مفت تھا۔ لیکن جب انہیں تھیم بتائی جانے لگی تو اس کا معاوضہ بھی دیا جانے لگا۔ ان کی پسند کے عین مطابق۔

”یہ کام بننے کا وقت ہے۔“ مسز کو ہر بہت خوش تھیں۔
 ”کیا مطلب؟“

”انسان پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سب کچھ بگڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ لاکھ کوشش پر بھی۔۔۔ اس وقت کے اثرات ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں۔۔۔ اور ایسے ہی ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سب کچھ سنورتا چلا جاتا ہے۔ ہر بگڑی بات بننے لگتی ہے۔۔۔ تو یہ وقت کام بننے کا ہے۔ ہمیں اور آئیڈیاز پر کام کرنا چاہیے۔“

”مثلاً۔۔۔؟“ اس نے پوچھا۔

”تم بھی سوچو افق! کیا ہونا چاہیے۔“

”میں تو ایک عرصے سے سیل کا سوچ رہی ہوں۔“

”سیل کا۔۔۔“

”جی۔۔۔ ہم ایک ہی قیمت پر کپڑے تیار کرتے ہیں۔ منافع رکھ کر سیل لگا لیتے ہیں۔“

وہ سوچنے لگیں۔۔۔ ”اس کے لیے الگ سے تیاری کرنی ہوگی۔ جگہ بھی ڈھونڈنی ہوگی۔ فرزام سے کہتی ہوں، معلومات کرے۔ اگر کسی بڑے ایونٹ میں اسٹال مل جائیں تو بہت زبردست رہے گا۔ اس سے ہمیں بہت فائدہ ہوگا۔“

”جی ہاں!“

”افق! پھر تم کچھ ڈیزائن ریڈی کرو۔ کچھ پرانے پرنٹ نکالو۔ ان میں تھوڑا بہت ایڈ کرو۔ دیکھتے

ہیں ان کا کیا، کیا بن سکتا ہے۔“

افتی بڑی ڈیزائن بک اٹھالائی۔ اس میں ان کے تیار کردہ ڈیزائن نمونے موجود تھے۔

فرزام کو سیل کے بارے میں بتا کر وہ سب اس کے لیے تیاری کرنے لگے۔ فرزام نے ایک اسٹال صنعتی نمائش میں بک کروالیا۔ نمائش دس روزہ تھی اور اب یہ انہیں پہلے دن کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کس قدر اسٹاک ریڈی رکھنا چاہیے۔ لیکن اس وقت وہ اسٹاک ریڈی کر نہیں سکتے تھے۔ اب وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اتنا کم ہو کہ انہیں منافع ہی نہ ہو اور اتنا زیادہ بھی نہ ہو کہ فروخت نہ ہونے کی صورت میں الٹا انہیں نقصان ہی ہو جائے۔

لیکن شاید مسز گوہر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ وقت کام بننے کا ہے، تو ان کا کام بن گیا۔ دس روز رات دن ان کے اسٹال پر رش رہا۔ ابتدائی چار دنوں میں ہی انہیں میٹرل کی قیمت وصول ہو گئی۔ اگلے دو دنوں کے منافع سے اسٹال کی بئنگ کے لیے ادا کیے گئے پیسے پورے ہو گئے اور باقی کے چار دن کا منافع ان کی جیب میں آیا۔ دس دنوں میں اسٹال کے لیے سب نے کام کیا۔ فرزام، اسلم، جمال سب سامان لائے۔ اسٹال کو ڈیکوریٹ کرتے۔ مسز گوہر بھی وہیں موجود رہیں۔ اسلم اور فرزام نے سیلز مینی کی۔ افتی گھر میں ہوئی اور ترتیب سے ہر دن کا سامان الگ کر کے پیک کرتی۔

سیل کامیاب ترین رہی۔ ساتھ انہوں نے پمفلٹ بھی بانٹ دیے۔ جس میں ان کے فون نمبرز اور ایڈریس تھا۔ ایسے کپڑوں کی خریداری کے لیے ان سے کبھی بھی رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ گاہے بگاہے عورتیں ان کے پاس خریداری کے لیے آ جاتیں۔ کچھ آرڈر دے جاتیں۔ فون پر رابطہ رہتے۔ انہیں مستقل کلائنٹس مل گئے۔

مسز گوہر نے کار میگوں کے بڑے کمرے میں اے سی لگوا دیا۔

یہ پہلا اے سی تھا، جوان کے گھر لگا۔ فرزام کا خیال تھا کہ یہ کار میگوں کے کمرے میں ہی لگنا چاہیے۔ پہلے وہ سب اپنا دوپہر کا کھانا گھر سے لاتے تھے۔ اب مسز گوہر نے ایک کام والی رکھ لی تھی۔ اوپر کی صفائی وہ کرتی تھیں اور کار میگوں کے جانے کے بعد فرزام نیچے کا حصہ صاف کر دیتا تھا۔ اب کام والی نیچے کی صفائی بھی کر دیتی اور ان سب کے لیے دوپہر کا کھانا بھی پکاتی۔

سب کار میگر ماہر ہو چکے تھے۔ ایک بار بتانے سے ہی بات سمجھ جاتے۔ ان کے کام میں غلطیاں کم ہونے لگیں۔ اب ہر وقت ان کے سر پر بیٹھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میٹرل کے لیے بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اسلم سب سمجھ گیا تھا۔ وہ اور فرزام جاتے اور میٹرل لے آتے۔ کبھی کبھی افتی اور مسز گوہر اسلم کو لے کر چلی جاتیں۔ آئے دن مارکیٹ میں نئی نئی چیز موجود ہوتی۔ وہ پھر وہیں طے کر لیتیں کہ کون سی نئی چیز شامل کرنی ہے اور کتنی۔ مسز گوہر کے تیار کیے گئے ملبوسات میں ایک ہی بات تھی۔ جسے خاص پسند کیا جاتا تھا۔ وہ بھی نفاست۔ وہ بچیوں کے ملبوسات کو ان کی عمر کے مطابق ہی نہیں اور نازک سا تیار کرتی تھیں اور بقول ان کے ریگولر کسٹمرز، ان کے کپڑوں میں بچیاں بہت آرام محسوس کرتی ہیں۔ کپڑے سنبھالنے میں انہیں کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہوتا۔



”ایک بات بتائیے۔“

”جی۔۔۔“ وہ ذرا پریشان سی ہو گئی۔

”ماما کو آپ کے کام میں ڈھونڈنے سے بھی خامی نظر نہیں آتی۔ کہتی ہیں بہت خطی ہے پرنکشن

کے لیے افق۔“

”جی۔۔۔“ اس جی سے اس کا مطلب تھا۔ ”تو اب کیا ہو گیا؟“

”لیکن یہاں کیا ہوا؟“ اس نے رجسٹر اس کے سامنے رکھا۔

رجسٹر سرخ گول گول دائروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے ”لیٹر ٹو ایڈیٹر“ لکھ کر دکھایا تھا۔ مسلسل تین

دن سے یہ لیٹر گول گول دائرے لے رہا تھا۔

”میں نے اتنی اچھی طرح سے یاد کیا تھا۔“ سر جھکا ہوا تھا۔ نظریں رجسٹر پر تھیں۔

”بی اے میں آپ انگلش کو یاد کریں گی؟“

”یہ مجھے نہیں آتی۔۔۔ تو پھر یاد ہی کر لیتی ہوں۔“

اس کے انداز پر ایک جان دار قہقہہ اس کے اندر ہی دم توڑ گیا۔

”یہ آپ کو کب آئے گی؟“

”بھابھی کہتی ہیں سب کچھ یاد کر لو۔ بس انگلش میں پاس ہونے تک نمبر لے لو۔۔۔ پھر ان لیٹرز

اور مضمونوں کو کون پوچھے گا۔“

”بھابھی نے تو کمال کا مشورہ دیا ہے۔ لیکن آپ کیا صرف پاس ہونا چاہتی ہیں۔“ افق کے نادر

خیالات اسے اب معلوم ہو رہے تھے۔

”جی۔۔۔“ سر بھی ہلا دیا۔

”صرف پاس۔۔۔؟“

”جی صرف پاس۔“ کہتے وہ تھوڑا الجھ بھی گئی۔

”تو آپ بی اے میں کامیاب ہونا نہیں چاہتیں؟“

”پاس ہونا تو چاہتی ہوں اور کامیابی کسے کہتے ہیں۔“ صرف سوچا، پوچھا نہیں۔

”پاس ہونے میں اور کامیاب ہونے میں بہت فرق ہے۔ پاس ہونا کسی بھی طرح چند نمبرز لینا

اور بس نکل جانا ہے۔۔۔ کامیاب ہونا اس پر مکمل گرفت رکھنا ہے۔ یہ گرفت کبھی دوبارہ نکل ہونے نہیں

دیتی۔ چند نمبرز لے کر پاس ہونا تو بہت شرمندگی والی بات ہے۔ اگر تجھے میری کتاب ٹھیک طرح سے نہ

آتی ہو اور میں فرسٹ آ جاؤں تو میں اپنی ڈگری کو پھاڑ کر پھینک دوں۔ خود کو پاس کروانا اہم نہیں۔ خود کو

سب کچھ سکھانا اہم ہے۔ ماسٹر جی کوئی کپڑا غلط سی دیتے ہیں تو آپ اور ماما اسے بار بار ان سے سلامتی

کر داتی ہیں۔ جب تک آپ کو اس میں مطلوبہ پرنکشن نظر نہیں آ جاتی۔ مطلوبہ پرنکشن ہر انسان کو اپنے

اندر رکھنی چاہیے۔ ہر کام میں آپ کی اتنی پرنکشن اور علم میں اتنی لا پرواہی۔۔۔“

”جی۔۔۔“ وہ بات کو کچھ گئی اور اب شرمندہ ہو رہی تھی۔

دراصل اب وہ صرف بی اے پاس کرنا چاہتی تھی۔ اسے ایک ڈگری چاہیے تھی۔ پہلے کبھی وہ

کتا بول کو جاٹ لیا کرتی تھی۔ اب اس کی ساری دلچسپی صرف اور صرف اپنے کام کے ساتھ تھی۔ وہ کام سے نہیں بھٹکتی تھی۔ پندرہ منٹ بیٹھ کر پڑھنے سے تھک جاتی تھی۔ اس کے ہاتھوں، پیروں کو دل و دماغ کو کام سے عشق ہو گیا تھا کیونکہ یہ ہی وہ واحد کام تھا، جس میں وہ کامیاب ہو رہی تھی۔ وہ ایک انج کی غلطی بھی نہیں کرتی تھی۔ کر لیتی تو اسے ٹھیک کرنے میں بخت جاتی تھی اور یہ قدرتی بات ہے کہ جو کام پھل دے، تعریف دے، اطمینان دے، اسے ہی کرتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اب اس کا کام صرف کام نہیں رہا تھا۔ لیکن پڑھنا اس کے لیے کام جیسا بن گیا تھا۔ ایک بوجھ، وہ ڈگری لینا چاہتی تھی، تاکہ برے وقت میں کام آ سکے۔ اس نے اتنے برے وقت دیکھے تھے کہ وہ اب بہت سے کام اکٹھے کر لینا چاہتی تھی۔ جو اس کے برے وقت میں کام آجائیں۔ رات کو وہ تین گھنٹے آرام سے پڑھ سکتی تھی۔ لیکن وہ کپڑوں اور میٹرل کے بارے میں سوچتی رہتی۔ ذہن میں نت نئے خاکے بناتی رہتی۔ اماں کی طبیعت اور صحت کا کافی بہتر رہتی تھی۔ وہ گھر کو دیکھ لیتی تھیں۔ جو قرضہ تھا، وہ بھی انہوں نے ادا کر دیا تھا۔ گھر کے حالات کچھ بہتر ہو گئے تھے۔ وہ شام کو گھر آ کر کتابیں لے کر ضرور بیٹھ جاتی تھی۔ لیکن پڑھ نہیں پاتی تھی۔

مسز گوہر نے فرزام سے کہا کہ وہ افق کی مدد کر دیا کرے۔ اس نے اسے کچھ اچھی گرامر کی کتابیں لادیں۔ وہ ایک باب اسے پڑھا دیتا۔ بتا دیتا کہ اس میں اسے کیا، کیا کیسے، کیسے کرنا ہے۔ ٹائپ دے دیتا جس پر اسے مضمون لکھنا ہوتا اور وہ یاد کر کے مضمون اسے لکھ کر دکھا دیتی۔ وہ ریفرنس تک یاد کرتی تھی۔ ایک بڑا اپنے الفاظ میں نہیں لکھ سکتی تھی۔

”ہم کورس کی کتابوں کو چھوڑ کر صرف گرامر کر لیں ابھی۔۔۔؟ پاس ہونے کے لیے نہیں۔۔۔ انگلش پر گرفت کے لیے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلادیا اور وہ کیا کرتی۔ نہیں کرنا بھی چاہتی تھی تو بھی ہاں کہنا پڑا۔ اس کی گرامر شروع ہو گئی۔ ہر لائن پر کراس لگنے لگے۔

”آپ نے پریکٹس نہیں کی نا؟“
 ”کی تھی۔۔۔ دو گھنٹے کی تھی۔“

اس نے پریکٹس ضرور کی تھی۔ لیکن دو گھنٹے نہیں۔ اس کے پوچھنے پر وہ ڈر گئی تھی۔ اس کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ ”یو“ کے ساتھ ”از“ کا استعمال کر لیں۔ ”آئی“ کے ساتھ ”آر“ کا۔ ”وائی“ کے ساتھ ”ایم“ کا۔ لیکن پیپر چیک کرنے والے پر بہت برا اثر پڑے گا اور اگر یہ استعمال آپ نے پبلک میں کیے تو سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔“

شرمندگی ہے وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکی۔ ایف اے میں بھی اس نے انگلش کے ساتھ یہی کیا تھا یاد کر کے بھتی رہی تھی۔ تھوڑی بہت گرامر کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ پھر بھا بھی نے کہا۔ ”کیوں اتنا ہلکان ہوتی ہو، یاد کرتی جاؤ سب۔“ جو یاد کیا تھا۔ اس میں یہ نہیں معلوم تھا کہ ”آئی“ کے ساتھ کس کا استعمال کرتے ہیں۔ ماضی کیا ہے، ماضی بعید کسے کہتے ہیں۔ فعل حال کا استعمال کہاں کرنا ہے۔

فرزام نے اسے ”یو“ اور ”آئی“ کا سمجھا کر دوسو فقرے لکھنے کے لیے دے دیے۔ گرامر کی کتاب اس کے ہاتھ میں دی اور اگلے دن کام کر کے لانے کے لیے کہا۔ اپنی چھٹی کے وقت سے پندرہ منٹ پہلے آفس میں ہی اس سے پڑھ لیا کرتی تھی۔ باقاعدگی سے نہیں، کبھی کبھار۔ رات گئے تک وہ دوسو فقرے لکھتی رہی۔ اگلے دن میں سے صرف چالیس ہی ٹھیک نکلے۔ لیکن اس سے یہ ہوا کہ وہ ”آئی، ایم اور یو، آر“ کے استعمال کو اچھی طرح سیکھ گئی۔

سیکھنے اور محنت کرنے سے سب کچھ آ جاتا ہے۔ اسے گرامر کرنے میں مزا آنے لگا۔ روز رات کو وہ دوڑھائی سو فقرات لکھ کر ہی سوتی۔ غلطیاں ہوتی رہیں۔ ان کی درستی بھی ہوتی رہی۔ وہ ایک آدھ لائن اپنے الفاظ میں لکھنے لگی۔ نیندا سے ویسے ہی نہیں آتی تھی۔ دن بھر کے کام سے تھک جاتی تھی لیکن آرام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی تعمیر کو مکمل اور مضبوط کرنا چاہتی تھی تاکہ دوبارہ اسے سڑکوں پر بھاگنا اور کسی کوٹنے میں بیٹھ کر روانہ پڑے۔



”ماما! سچ بولیں گی؟“

مسز گوہرنے فریش جوس کا گھونٹ لے کر اسے دیکھا۔ ”چاہو تو جھوٹ بھی بول سکتی ہوں۔“ دونوں آمنے سامنے ذرخشیل پرایک اچھے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ فرزام انہیں اپنی بانیک پر بٹھا کر لایا تھا۔ وہ کبھی بانیک نام کی چیز پر نہیں چبھی تھیں۔ آگے پیچھے سے دو لوگ بھی انہیں پکڑ کر بیٹھے رہتے تو بھی انہیں یہی خوف رہتا کہ وہ گر جائیں گی۔ فرزام انہیں زبردستی بٹھا لایا۔ سائیکل چلانے والے بھی ان سے آگے نکل گئے اور مسز گوہر کا خیال تھا کہ وہ بہت تیز چلا رہا ہے۔ صرف فرزام کی خوشی کے لیے وہ بیٹھ گئی تھیں۔

”اگر میں کہیں جانا چاہوں تو آپ کیا کہیں گی؟“

مسز گوہر ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہو گئیں۔ ”تمہیں آزادی ہے جانے کی۔ جہاں چاہے جاؤ اور پنا کیر بناؤ۔“

”میں نے آپ سے پہلے ہی سچ کا پوچھا تھا۔ آپ کو اس سوال کا جواب ہر حال میں سچ ہی دینا ہوگا۔ آپ میرے جذبات کو ایک طرف رکھ دیں۔ میں اور آپ دو لوگ بن جاتے ہیں۔ ماں، بیٹا نہیں، اب یہ دو لوگ صرف سچ بولیں گے۔۔۔ صرف سچ۔“

انہوں نے ایک لمبی سانس لی۔ ”میں اکیلے نہیں رہنا چاہتی فرزام! پہلے تمہارے بابا گئے۔ پھر احمر چلا گیا۔ پھر احمر کو ہمیں چھوڑنا پڑا۔ میں اپنی زندگی کو کتنا بھی فعال کر لوں۔ لیکن ان دو لوگوں کے نہ ہونے سے اندر بہت سے حصے جامد ہیں اگر تم اسٹڈی کے لیے کہیں جانا چاہتے ہو تو ہم پلاننگ کر سکتے ہیں۔“

”کیسی پلاننگ؟“

”کوئی بھی۔۔۔ یہ کہتے ان کی آواز دھیمی پڑ گئی۔“

”میرے ساتھ چلی جائیں گی، پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر؟“

”تم سے زیادہ کچھ بھی جیتی نہیں۔ میں اکیلے نہیں رہنا چاہتی۔“

”میں آپ کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔“

”تم کہاں جانا چاہ رہے تھے؟“

”امریکا ایلانی کر دیا ہے۔ آن لائن کچھ ٹیسٹ بھی دیے ہیں۔ امید ہے ہاف اسکالر شپ مل جائے گا۔“

”بہت برائے چانس ہے۔ تمہیں مس نہیں کرنا چاہیے۔“

”آپ استھما کی مریض ہیں۔“

”میں خود کو سنبھال سکتی ہوں۔“

”ہر بار میں آپ کو ان ہیلر ڈھونڈ کر دیتا ہوں۔“

”اب میں یاد رکھنا شروع کر دوں گی۔“

اس بات کے بعد دونوں کافی دیر تک خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

”میں افق سے شادی کر لوں؟“

مسز گوہرنے اچھی سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کو ٹھیک نہیں لگی میری بات؟“ ان کے ایسے دیکھنے پر وہ گھبرا گیا۔ ”ارے نہیں ماما! میرا کوئی

چکر دکر نہیں ہے اس کے ساتھ۔“

”محبت کرتے ہو اس سے یا تمہیں بھی بہت خوب صورت لگتی ہے؟“

”محبت کیسے کروں؟ محبت سے تو بہت نفرت ہے مجھے۔ وہ آپ کے ساتھ رہے گی۔ آپ کا خیال

رکھے گی۔ آپ کا بہت احترام کرتی ہے وہ۔ اچھی لڑکی ہے۔ کم از کم بھابھی کی طرح کسی تکلیف کا باعث نہیں بنے گی۔“

”استعمال کر رہے ہو اسے؟“ مسز گوہر کو بیٹے کی یہ بات بری لگی۔

”آپ تو مجھے غلط ہی سمجھے جا رہی ہیں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ چیزوں کے ساتھ ساتھ انسانوں

میں بھی خوبیاں دیکھو۔ پھر انہیں اپنے قریب آنے دو اور یہ کہ خود کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ جڑے لوگوں

کا ٹھیک ہونا بھی ضروری ہے۔ ماما! میں ایک ہی لڑکی کو جانتا ہوں۔۔۔ افق کو۔ وہ ڈھائی سال سے

ہمارے پاس کام کر رہی ہے۔ سارا دن یہیں رہتی ہے۔ جن لڑکیوں کا میں اکیڈمی میں استاد ہوں۔ وہ

تک مجھے چنگی بھرنے سے باز نہیں آتیں۔ آتے جاتے کہنی مار دیتی ہیں۔ کالج کی جوتیاں میری

دوست ہیں۔ وہ صرف دوست رہنا نہیں چاہتیں۔ رات رات مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ ان سب

حالات کو دیکھ کر مجھے تو لگتا تھا کہ میں تو آل ٹائم ہٹ بوائے ہوں۔ بہت خاص، بہت اہم ہوں۔ لیکن

افق کے لیے میں میڈم کا بیٹا ہوں اور جب اسے پڑھانا ہوں تو صرف استاد ہوں۔۔۔ تو یہ خوبی، شرافت

بہت بڑی چیز ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

سر ہلا کر صرف اسے دیکھا یعنی اس کی بات سے اتفاق ہے۔

”میرا خیال ہے زیادہ خوبیوں اور کم نقائص والے لوگ اچھے سے دوست بن کر اچھی زندگی گزار

سکتے ہیں۔ میرے کمرے کے ایک کونے میں روی کی دی چیزیں ترتیب سے رکھی تو آپ نے دیکھی ہی

ہوں گی۔ یہ چیزیں مجھے ہر روز بتاتی ہیں کہ کوئی محبت کرنے والا نہ ملے۔ لیکن قدر کرنے والا ضرور ڈھونڈ لینا چاہیے۔ محبت کرے، نہ کرے ساتھ ضرور دے۔ ماما! میں زندگی میں بڑی تباہی سے بہت ڈرتا ہوں۔ اب میں فٹ پاتھ پر آجانے سے نہیں ڈرتا۔ اپنی زندگی میں موجود کسی شخص کے غلط نکل آنے سے ڈرتا ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو یہی میرے لیے بڑی تباہی ہوگی۔ رومی کو میں چار باتیں ضرور سنا آیا تھا۔ لیکن بہت عرصے تک اسی کے لیے چھپ چھپ کر روتا رہا ہوں۔ اس نے محبت نہیں کی۔ لیکن میں نے کی تھی۔ اگر وہ ایک بار مجھے فون کر لے تو میں بھاگا جاؤں اس کے پاس۔ میں اسے معاف کر دوں گا۔ اگر محبت میں بھی معاف نہ کیا جائے تو کس جذبے میں کیا جائے؟ لیکن میں جانتا ہوں، اگر میں نے ہاتھ جوڑ کر اس کی منت بھی کی تو کبھی وہ نہیں مانے گی۔ اسے اس نقشے سے بہت محبت ہے، جو اس نے خود اپنی زندگی کے لیے بنایا ہے۔ وہ اس نقشے میں تبدیلی نہیں کرے گی۔ ایک بار میں اس تباہی کا شکار ہو گیا، دوبارہ نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے اپنی زندگی میں غلط لوگ نہیں چاہئیں۔ اگر یہ لالچ ہے تو ہاں، مجھے اچھے لوگ چاہیے ہیں، صرف اچھے۔“

مرزگو ہر اپنے بیٹے کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھیں اور یہ جان کر انہیں بہت دکھ ہوا کہ ان کے بیٹے کے اندر ایک اور ہی سفر جاری ہے۔ وہ بہت گہرا ہو گیا ہے۔
 ”افق۔۔۔“ وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئیں کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ پھر توقف سے بولیں۔
 ”بہت مختلف لڑکی ہے فرزام! میں اس میں نقص نہیں نکال رہی۔ لیکن وہ مجھے بہت زیادہ مشین اور تھوڑی سی انسان لگتی ہے۔ کبھی تم نے اسے ہنستے دیکھا؟ میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ اس میں لڑکیوں والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اس کی مدر جو اس کے کپڑے لاتی ہیں، وہ انہیں استعمال ہی نہیں کرتی۔ میں نے پوچھا تو اس نے کہا، اسے نئی چیزیں اچھی ہی نہیں لگتیں۔ اس کی مدر نے مجھ سے شکایت کی وہ صرف ایک وقت کا کھانا کھاتی ہے۔ رات میں بمشکل دو گھنٹے سوئی ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتا دیا کہ نہ اسے بھوک لگتی ہے، نہ ہی نیند آتی ہے۔ میں نے وجہ پوچھی، لیکن وہ خاموش رہی۔ کبھی بھی منہ چھپا کر اپنی آنکھیں صاف کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی اداسی تو اسے پہلی بار ملنے والا ہی جانچ لیتا ہے۔ وہ ہنستی نہیں، بولتی نہیں۔ کسی خواہش، کسی خواب کا ذکر نہیں کرتی۔ بس تم اس کے آگے کام کا ڈھیر لگا دو۔ وہ سر جھکائے کرتی رہے گی۔ جیسے کاموں میں خود کو چھپا رہی ہو، دفن رہی ہو۔ مجھے وہ بہت پیاری ہے۔ لیکن فرزام! تم ایسی روباوٹی لڑکی سے شادی کر لو گے؟ ٹھیک ہے۔ تم محبت کا ذکر نہیں کر رہے۔ تباہی کا کر رہے ہو۔ ایسی خاموشیاں بھی تباہی بن جایا کرتی ہیں۔ جب میں اس کی عمر میں تھی تو میرے اس سے زیادہ مسائل تھے۔ میرا گھر اس کے گھر سے زیادہ چھوٹا تھا۔ میں اس سے زیادہ غریب تھی۔ لیکن زندگی سے میرا ناتا ٹوٹا نہیں تھا۔ زندگی سے ناتے اسی وقت ٹوٹتے ہیں، جب اندر کوئی تباہی برپا ہو۔ کوئی بھرم، کوئی خواب ٹوٹ چکا ہو۔ یہ سب اس کی مدر کی بیماری کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ حالات کے بدترین ہو جانے کی وجہ سے بھی۔ شاید وہ اپنے آپ سے باہر نکل سکے۔ اگر وہ تمہاری اچھی دوست بن کر زندگی گزار سکتی ہے تو مجھے اس کی ساس بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

یہ سب باتیں جو فرزام کی ماں اسے کہہ رہی تھیں۔ ان باتوں پر اس نے غور نہیں کیا تھا اور یہ کوئی

ایسی بری باتیں بھی نہیں تھیں۔ حساسیت تھی ان میں اور یہ حساسیت افق میں پائی جاتی تھی۔ ان سب پر سوچا جاسکتا تھا۔ بات کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس بنا پر اسے مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ ایک بار افق سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بات کیسے کرتا، جہاں وہ کام کرتی تھی، وہاں اتنے لوگ تھے۔ باہر اس کے ساتھ وہ جائے گی نہیں۔ بلکہ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوگی کہ اس سے باہر جانے کا کہہ سکے۔ بہانے سے وہ اسے لے کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ ماں اسے یہ کہتی اچھی نہیں لگتی تھیں کہ ”افق! جاؤ، ذرا فرزام کے ساتھ چائے پی آؤ“ یا ”وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔“

اسی عالم میں چند دن گزر گئے۔ اتفاق سے اتوار کو شام کے وقت ایک فٹ ہاتھ پر اسے وہ کھڑی نظر آگئی۔ وہ جھک کر کچھ میگزینز دیکھ رہی تھی۔ اتوار کو اکثر فرزام پرانی انارکلی جا کر پرانی کتابوں کی چھانٹی بہت دل لگا کر کرتا تھا اور بہت اعلیٰ درجے کی کتابیں چھانٹ کر لے آتا تھا۔ وہ کافی دیر سے ایک ایک اسٹال پر کتیبوں کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ذرا دور اسے وہ بھی نظر آگئی۔ وہ جلدی جلدی سب ہی میگزینز دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے خاص چیز کی تلاش ہو۔ وہ اس کے قریب آگیا اور سلام کیا۔

”کچھ خاص ڈھونڈ رہی ہیں؟“ اس کے ہاتھ میں فیشن میگزینز تھیں۔ افق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں مدد کروں؟“

”مجھے مل گیا ہے میگزین۔“ وہ جو میگزین دیکھ رہی تھی اسی کی طرف اشارہ کیا اور کتب فروش کی طرف بڑھادیا۔ اس نے شاپر میں ڈال دیا۔

فرزام نے پیسے دے دیے۔

”آپ نے کیوں دیے؟“ وہ اس سے زیادہ الفاظ میں احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ اس کی شکل بتا رہی تھی، لیکن اتنا ہی کہا۔

”آپ ماما کی ہی کام کے لیے لے رہی ہیں نا۔۔۔ تو ماما کے بیٹے نے ادائی کر دی۔“

وہ خاموش رہی۔ احتجاج ابھی تک آنکھوں میں رقم تھا۔ خدا حافظ کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔

”ذرا میری بات سنئے پلیز۔“ جتنی تیزی سے وہ آگے نکلی۔ اتنی ہی تیزی سے وہ پیچھے آیا۔ وہ رک کر دیکھنے لگی، پوچھا نہیں کہ کیا بات ہے۔

”یہ اس طرف۔۔۔“ اس نے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کیا۔ ”ریگل کے پاس ایک بہت اچھائی کارز ہے۔ آپ چلیں گی میرے ساتھ وہاں؟“ اتنا کہہ کر وہ ڈر بھی رہا تھا کہ وہ میڈم کے بیٹے کے یہ پوچھنے پر اسے لفٹکا سمجھ کر پھڑپھڑی نہ مار دے۔

وہ گھٹا ہوا سے دیکھ کر رہ گئی۔ غصہ بھی جھلکنے لگا آنکھوں سے۔

”نہیں؟“ خود ہی کہہ دیا۔ ”پہلیے، وہاں نہیں تو یہ چند قدم پر سڑک پار کر کے بہت سے لوگوں کی پسندیدہ جگہ عجائب گھر ہے۔ میں ابھی آتے آتے دیکھ رہا تھا کہ اس کا باغ بہت اچھا ہے۔ صاف تھرا، ہرا بھرا۔۔۔“

اس کے ردِ عمل کا سوچ کر وہ گھبرا رہا تھا۔ چادر کا کونا دائیں کان سے دانتوں میں لیے، میگزین کو

اسٹڈی فائل کی طرح ہاتھ میں پکڑے وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے جیسے شرارے نکل رہے تھے۔ ان شراروں میں اسے دکھ بھی نظر آیا۔ جیسے اسے اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ بھی دوسروں کی طرح اس کے ساتھ یہی کرے گا۔ لحوں میں ہی ماحول بدل گیا تھا۔ وہ اسے بہت نفرت سے گھور رہی تھی اور ایسے کھڑی تھی جیسے اور انتظار میں ہو کہ دکھاؤ اپنی اوقات۔ کہاں تک جاتے ہو تم؟ نکلے تا تم بھی وہی؟

”میرا یہ مطلب نہیں ہے، جو آپ سمجھ رہی ہیں۔“ اس کے تاثرات پڑھ کر اس نے بے چارگی سے کہا۔ ”میں آپ کا استاد بھی ہوں۔ آپ کو پڑھایا ہے میں نے۔“ اس کا یہ کہنے سے مقصد احسان جتنا نہیں تھا اس سے اس کا مطلب اپنی شرافت بنانا تھا۔

”تو اب آپ معاوضہ لینے آئے ہیں؟“ اس کے انداز نے بتا دیا کہ وہ کتنے غصے میں ہے۔ لحوں میں ہی سالوں کا تاثر بدل چکا تھا۔ اس کی شرافت برعکس کیا جا رہا تھا۔ بات بگڑ چکی تھی۔ ہو سکتا ہے، وہ غصے میں کل آئے ہی نا۔۔۔ اور یہ بھی کہ وہ اس کی کوئی وضاحت نہ سنے۔ انکار ہی سہی، وہ کر دے۔ لیکن وہ اسے بد معاش، لافنگانہ سمجھے۔ فرزام کے مسام بھیگ گئے۔ چند ہی لحوں میں وہ کیا سے کیا بن گیا اس کے لیے۔

اسے گھور کر وہ پلٹی اور دو قدم اپنے راستے کی سمت اور اس سے مخالفت سمت میں بڑھی۔ اس نے صرف تھپڑ ہی نہیں مارا تھا میڈم کے بیٹے کو باقی نظروں سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

دو سے چار اور چار سے آٹھ قدم چلتے اس کا وجود گواہی دے رہا تھا کہ بیچ راہ میں اس کی بے عزتی کی گئی ہے۔ پھر سے اسے صرف لڑکی سمجھا گیا ہے۔ پھر سے اس کی خوب صورتی پر نظریں لگی ہیں اور مردوں کا کام ہی کیا ہے۔ موقع ملے ہی موقعے کا فائدہ اٹھانا۔

فرزام کی نظریں، جو دور جاتی اتنی پرچی تھیں۔ وہ صاف صاف دیکھ رہی تھیں کہ وہ دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھیں گی۔ اس نے اس کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں کیا۔ جو اتنی کو بھناتا تھا وہ سمجھ لیا۔ لیکن اس نے اسے پورا سنا نہیں۔ بھیڑ میں تیزی سے جگہ بناتی وہ جا رہی تھی۔ فرزام کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب ایسے ہو جائے گا۔ لیکن اگر اب یہ ایسے ہی تھا تو وہ ایسے ہی نہیں چھوڑے گا۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔ آواز دے کر اسے روک نہیں سکتا تھا۔ جگہ بناتا تیزی سے اس کے پیچھے جانے لگا اور تقریباً بھاگتے ہوئے، ایک سائیکل والے کی ٹکر سے بچتے ہوئے وہ اس کے پیچھے سے عین اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”میں تو تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اتنی!“ اس نے فوراً کہہ دیا۔ بے حد سنجیدگی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر۔ مطلب تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔ میں فلرٹ نہیں کر رہا۔ تمہارا استعمال نہیں کر رہا۔ وقت گزری نہیں چاہیے۔ ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔ اس نظر والا بھی نہیں ہوں۔ مجھے ویسا تو نہ سمجھو۔

قریب سے ایک موٹر سائیکل پوپ پوپ کرتی گزری۔ پرانی انارکلی کی اتور بازار کی بھیڑ بھاڑ میں۔۔۔ اسٹالوں پر ”باجی، آپا، خالہ“ کی آوازوں میں۔۔۔ ٹریفک کے شور میں۔۔۔ جھوم کی جھنساہٹ میں اتنی کو یہ آواز بہت بری لگی۔ ”شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

افق نے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے دراصل وہ اسے بتا رہا ہو کہ ”تمہارے پیروں کے نیچے کی زمین پھٹ رہی ہے۔ دیکھو، دیکھو، تم نیچے دھنستی جا رہی ہو۔ یہ زمین تمہیں نگل لے گی۔“
 ”ماما نے کہا کہ میں پہلے تم سے بات کر لوں۔“
 اس نے لفظ ”ماما“ کو سہارا لیا تاکہ وہ یقین کر لے کہ اس سب کا ماں کو بھی معلوم ہے اور وہ اسے الو نہیں بتا رہا۔

”میں تو صرف بات کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصد غلط نہیں تھا۔“
 وہ جلدی جلدی بتانے لگا کہ سداوہ پھر بھاگ ہی نہ جائے۔ ایک آدمی فرزام سے ٹکرایا اور فرزام ذرا سا لڑھک کر سیدھا ہو کر کھڑا ہوا۔ لیکن افق نامی بت دیے ہی کھڑا رہا۔ جیسے کچھ سن نہیں رہی اور اس کے سامنے کوئی اپنے بولنے کا شوق پورا کر رہا ہے۔ جیسے وہ دکان کے باہر زنانہ ریڈی میڈ کپڑے پہنے پلاسٹک کی عورت کھڑی ہے۔ جس کا تعلق بازار سے تو ہے، لیکن زندگی سے نہیں۔
 ”افق۔۔۔!“ فرزام کو اسے آواز دینی پڑی۔ وہ دونوں آمنے سامنے رش میں اور کتنی دیر کھڑے رہ سکتے تھے۔

وہ چونگی۔۔۔ اور فرزام کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے ذیلی سڑک کی طرف مڑ گئی۔ نیلے گنبد کی طرف جانے والی سڑک پر واقعی اس کے پیروں تلے کی زمین پھٹ رہی تھی اور وہ دھنستی ہی جا رہی تھی۔ آخر وہ دھنست کیوں رہی ہے؟ پاتال میں کیوں جا رہی ہے؟ اسے کون نیچے ہی نیچے بھیج رہا ہے؟ امان سے تو وہ نفرت کرتی تھی۔۔۔ ہے نا؟ پھر فرزام جیسے لڑکے کے منہ سے شادی کا سن کر وہ پاتال کی طرف کیوں جا رہی ہے؟

چال میں تیزی آگئی۔ نیلے گنبد کی طرف تھوڑا اور فاصلہ طے ہوا۔ ذرا اور آگے۔۔۔ ایک اور سڑک تک۔

امان نامی دلدل نے ایک بار نگل تو لیا تھا اسے۔۔۔ اس کے ہاتھوں اپنی عزت تار تار کر دیا تو پکی تھی۔ اب وہ کیوں اسی شخص کے نام پر اندر دھنستی جا رہی ہے؟ شادی کے نام پر اسے کیا یاد آگیا ہے؟ اب وہ کیا کچھ اور برباد کرے گا۔۔۔ وہ پسینے میں بھیگ گئی اسے لگا، امان کا باب اس کے پیچھے آ رہا ہے۔۔۔ آگے بھی وہی ہے۔ دائیں بھی وہی ہے۔۔۔ اس نے اپنے اندر کی چیخ کو بمشکل روکا۔

اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر چلتے ہوئے اس نے امان نامی دھڑکن کو اپنے دل کے اندر نئے سرے سے دھڑکتے سنا اور وہ ڈر گئی۔ اگر پھر اس دل نے اسی کے نام پر دھڑکننا شروع کر دیا تو۔۔۔ تو امان پھر سے جیت جائے گا۔۔۔ وہ اسے دھوکا دینے اس کے اندر پھر سے آگیا تھا۔ اس بار وہ یہ دھوکا نہیں کھائے گی۔۔۔ اپنے گھر کی گلی کے سرے پر وہ رک گئی۔

واپس پلٹی تو دس قدم کے فاصلے پر فرزام کھڑا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔۔۔ جس حالت میں وہ تیزی سے اس کے پاس سے نکلی تھی۔ اس کا سوچ کر فرزام اس کے پیچھے گھر تک آ رہا تھا۔

وہ چلتی اس کے قریب آئی اور آگے ہو کر چلنے لگی۔ وہ پیچھے آنے لگا۔ سڑک پار کر کے وہ عجائب گھر

کے ہرے بھرے باغ میں آکر کھڑی ہو گئی۔ دوبارہ اس نے فرزام کی طرف نہیں دیکھا۔ دراصل وہ کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ جو سُر تال اس کے اندر سالوں پہلے شادی کے نام پر بجے تھے۔۔۔ اب وہی سُر تال یا تم کر رہے تھے۔ افق اس ماتم کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ اس شخص کے لیے یہ ماتم اور کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اگر وہ یہ ماتم کرے گی تو وہ نئے سرے سے اس پر جان دینے لگے گی۔



امان عدن نامی لڑکے کے بارے میں افق، فرزام کو بتانے لگی۔ اس کے باپ کا اس کی عزت پر حملے کو چھوڑ کر اس نے ان سے ملاقات کے متعلق بھی بتا دیا۔

جب اس نے بات ختم کر لی تو اس نے خاموشی سادھ لی کہ کیا اب بھی یہ فرزام نامی لڑکا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ بہت دیر تک فرزام بھی خاموش رہا۔

”ماما نے ٹھیک کہا تھا کہ افق کے اندر بہت کچھ ٹوٹ چکا ہے۔“

اس نے اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔ افق کو جیسے جواب مل گیا کہ وہ اسے انکار کر رہا ہے۔ جس طرح اسے اس کے پرد پوز کرنے پر خوشی نہیں تھی، ایسے ہی انکار پر بھی دکھ نہیں تھا۔ اسے عدن کا خوف تھا کہ وہ پھر نہ اس کے اندر آن بے۔ اس کا خیال پھر نہ اسے آئے۔۔۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اتنی بڑی بات سن کر وہ اس سے شادی کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک ہی دے گا۔

”تم جیسی لڑکی کو کوئی بھی آسانی سے بے وقوف بنا سکتا ہے۔“

اس کی اگلی بات سن کر وہ زمین میں گر گئی۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے اسے یہ سب بتا کر۔ اس کے بعد وہ دوسرا شخص ہے جسے اس نے اس بارے میں معلوم ہونے دیا۔ یہ بات اس نے اپنے اندر راز کی طرح نہیں، ایک گناہ کی طرح چھپا کر رکھی تھی۔ اس نے اپنے گناہ کا خود ہی پردہ چاک کر دیا۔ اب یہ اس کا مذاق اڑائے گا۔ وہ جو اسے سمجھ رہا تھا اس کے الٹ سمجھے گا۔ وہ اٹھنے لگی۔

”جو چھوڑ جاتے ہیں، وہ اپنا نقصان کرتے ہیں۔ اٹھنے کے لیے پر تو لیتی افق نے اس کی طرف دیکھا۔“ اس نقصان پر انہیں افسردہ ہونا چاہیے، ہمیں نہیں افق!“ وہ مسکرایا۔ افق بیٹھ گئی۔

فرزام نے اسے رومی کے بارے میں بتا دیا۔ دو لوگوں نے وہاں بیٹھے بیٹھے خود کو بیان کر دیا۔ افق کو اب زندگی میں کسی مرد کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے تو خود کو امان سے بچانا تھا، وہ اس جیسے شخص کے لیے جوگ لینا نہیں چاہتی تھی۔

فرزام اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو شامل کرنے سے ڈرتا تھا، جو آئیں اور پھر اسے چھوڑ جائیں اور وہ ٹوٹ جائے۔ وہ دونوں فی الحال اپنے اپنے اندرونی ادوار کے خاتمے کے لیے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ان دونوں میں ”محبت“ نامی احساس کہیں بھی نہیں تھا۔



مسز گوہر افق کے گھر جا کر اس کا ہاتھ مانگ آئیں جسے فوراً قبول کر لیا گیا۔ جمال اور اسد کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ انہیں اتنا پیارا ”بھائی جان“ مل رہا تھا۔ طے یہ پایا کہ فرزام کے جانے سے پہلے نکاح کر

دیا جائے گا۔

فرزام کے کاغذات میں تھوڑی سی ہی کمی بیشی رہ گئی تھی۔ جن کے لیے وہ بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ برطانیہ کی طرف سے جو اس کا ویزا منسوخ کیا گیا تھا اس وجہ سے اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بہر حال اب تو وہ ہر طرح کی اور ہر مقام پر اچانک سے مل جانے والی مشکلات کا عادی ہو چکا تھا۔ کبھی کبھار ہی مسز گوہر کی احمر سے بات ہو جاتی تھی۔ انہوں نے اسے فرزام کے نکاح میں شرکت کی دعوت دی۔ اتنے پیسے لگا کر وہ صرف نکاح میں شرکت نہیں کر سکتا تھا اور پھر اسے ڈر تھا کہ پیسوں کا تقاضا پھر سے نہ کر لیا جائے۔ اس نے بہانے سے انکار کر دیا۔

مسز گوہر نے بھی اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کا کاروبار کتنا اچھا چلنے لگا ہے اور اس کا روبار کے لیے دونوں ماں بیٹے اور ان کی ہونے والی بہو نے کتنی محبت کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ان کا بیٹا ان کے برے وقت میں حصے دار نہیں بنا تھا تو اچھے میں بننا بھی پسند نہیں کرے گا۔

احمر اپنی ماما سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ وہ وہاں کیسے اور کہاں رہ رہی ہیں۔ پوچھنے کا مطلب تھا، پھر امداد بھی کرنا اور ابھی ابھی انہوں نے بلڈنگ کا گھر چھوڑ کر ایک ڈیل اسٹوری گھر لیا تھا۔ اب وہ لیڈز میں کسی کو جواب دہ بھی نہیں تھا کہ تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے اتنا بڑا گھر لینے کے لیے اور نئے ماڈل کی کار تم نے کیسے لے لی؟ نئے سال کی چھٹیوں میں تم یورپ کیسے گھوم آئے؟ اب وہ وہاں کھل کر پر آسائش زندگی گزار رہا تھا۔

اس کا انگریز نما بھائی سینکڈ ہینڈ بائیک چلاتا رہا تھا۔ ماں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کھڑی ہو کر کنگ کرتی رہی تھی۔ لیکن جو بھی تھا وہ مسز گوہر اور فرزام کے لیے بہت اچھا تھا۔ وہ ایک پر آسائش زندگی نہیں گزار رہے تھے۔ لیکن وہ کینے اور غاصب نہیں بنے تھے۔ تو ایسی آسائشوں سے محنت اور خواری بھلی۔۔۔ چیزوں کی تعداد میں کمی ہو جانی چاہیے۔۔۔ خوبیوں کی نہیں۔۔۔ نیکی کی توفیق ملے نہ ملے۔ گناہ سے دوری کی ضرورت ملنی چاہیے۔

مسز گوہر کو اتنا شوق ضرور تھا کہ احمر اپنے بھائی کی شادی میں آجائے۔ کم سے کم کوئی ایک تو دوسرے کی شادی میں شرکت کر لے۔ لیکن تانیہ کے ہوتے وہ نہیں آئے گا۔

جمعے کے دن دوپہر کے وقت بندگی کے ہرے رنگ کے دروازے کے گھر میں فرزام اپنی چھوٹی سی بارات لے کر اترا۔ اس نے ڈیزائنر سفید شلوار سوٹ پہنا تھا۔ ہلکے سرخ دوپٹے کو جو دولہا کے لیے ہوتے ہیں گلے میں ایک بل دے کر ایک سراپچھے اور ایک آگے رکھا تھا۔ اتنی سی ہی تیاری میں وہ شہزادہ لگ رہا تھا، جو کشمیر کی کلی کو لینے کے لیے آیا تھا۔ باراتیوں میں سب ہی کار میگر اور استقبال والوں میں افق کے چچا، ماموں، بھائی اور چند اور لوگ شامل تھے۔ جہیز کے نام پر دعائیں تھیں اور بری کے نام پر فرزام سامر د۔

افق رخصت ہو کر فرزام کے گھر آگئی۔ فرزام نے ماں کو افق کے بارے میں اس کی بتائی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اب بس ان دونوں کا آپس کا مسئلہ ہے کہ وہ کیسے ایک دوسرے کو ماضی کی تکلیفوں سے نکال لے ہیں۔

افق نے مسز گوہر کا لایا سرخ رنگ کا شرارہ پہنا تھا اور وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی خوب صورتی ایک طرف اور اس کا دھواں دھواں ہوتا روپ ایک طرف۔ خود کو نارمل رکھنے کے باوجود وہ وحشت زدہ سی نظر آ رہی تھی۔ جیسے ابھی سب چھوڑ چھاڑ بھاگ جائے گی۔

مسز گوہر دونوں کی تصویریں بنا رہی تھیں۔ فرزام کی دہن کے لیے انہوں نے تھوڑے سے زیورات بنا لیے تھے۔ وہ انہوں نے پہلے ہی افق کو دے دیے تھے۔ افق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ کافی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہیں۔

نکاح دوپہر کے وقت ہوا تھا اور شام تک افق گھر آ گئی۔ رات کو ان تین لوگوں نے فائو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کیا۔ ماں کو گھر ڈراپ کر کے وہ ایسے ہی تھوڑی سی ڈرائیو کے لیے کار ادرھر ادرھر گھماتا رہا۔ اب ایسا تھا کہ انسان بہت سے فیصلے بہت مضبوطی سے کر تو لیتا ہے لیکن جب ان فیصلوں کے راستوں پر سے گزرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے۔

فرزام ایک اچھا اور انصاف پسند لڑکا تھا، لیکن اس کے کانوں میں ماضی میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر، قطار در قطار درختوں کے سایوں میں چہل قدمی کرتے اور کسی جھیل کے کنارے بیٹھے بنے گئے خواب آبشار کے جھرنے کی طرح رواں تھے۔

وہ ذہن کو جھٹک رہا تھا۔ پھر بھی کانوں میں سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک خفیف سی کپکپاہٹ اس کے اندر تھی۔ اب اسے معلوم ہوا کہ کسی کو دھکا دے کر، گھر سے باہر نکال کر دروازہ مقفل کر دینے سے کوئی زندگی سے نہیں چلا جاتا۔ دل جو دھکے لگاتا ہے، دل والوں کو نکالنے کے لیے وقت آنے پر ان دھکوں کا بھاٹڑا پھوٹ ہی جاتا ہے۔

اس نے افق کو دیکھا دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھے وہ تازہ تازہ پینٹ سے بنائی گئی دیوی لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اسی دیوی جیسا لگ رہا تھا، جسے حوطہ کر کے تابوت میں بند کر دیا گیا ہو، تازہ تازہ وجود پر صدیوں پرانا چہرہ۔۔۔ چند گھنٹوں کی دہن کا صدیوں سے ناتا۔۔۔

”آئس کریم کھاؤ گی؟“

”جی، کھالوں گی۔“ آواز اتنی دھیمی تھی کہ بمشکل فرزام نے سنا۔

”میرا خیال تھا کہ تم کہو گی میرا کھانے سے ہی پیٹ بھر گیا۔“ وہ ہنستا کہہ رہی تھی۔

”پھر میں نہیں کھاتی۔“ وہ ہنسی نہیں۔ سنجیدہ ہی رہی۔ وہ اس کے مذاق کو سمجھی ہی نہیں۔

”جب تک تم میں حس مزاح آئے گی میری حس مزاح مر چکی ہوگی۔ میں تو تمہیں ایک دو لطیفے

سنانے جا رہا تھا۔ لیکن مجھے تو تمہیں لطیفے سمجھانے بھی پڑیں گے۔“

وہ چپ رہی۔ ہولے سے بھی سمجھی گود میں رکھے ہاتھوں کو جنبش دے دیتی۔ ایسے سٹ کر بیٹھی تھی

جیسے بہت خوف زدہ ہو۔ بہت برے وقت پر اسے یاد آ رہا تھا وہ۔ دوسری بار کسی کے ساتھ کار کی فرنٹ

سیٹ پر بیٹھی تھی۔ پہلی بار کا بیٹھنا یاد آ رہا تھا۔

دونوں میں خاموشی رہی۔ بنا کہے دونوں ہی سمجھ گئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رشتے کو

سمجھنے، اس رشتے کو نبھانے، دوست بن کر ہی سہی، ساتھ ساتھ، خوشی خوشی زندگی گزارنے میں انہیں

وقت لگے گا۔



فرزام کے پاس چند ہفتے ہی تھے۔ اس کا دیز آچکا تھا۔ وہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ افق نے اچھے نمبروں سے بی اے پاس کر لیا تھا۔ اسے ساتھ لے جا کر اس نے اس کا پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیہمپس میں ایڈمیشن کروا دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ریگولر اسٹڈی کرے۔ افق کا کہنا تھا کہ وہ کام کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح یونیورسٹی جا کر اس کا بہت وقت صرف ہوگا۔ لیکن فرزام کا کہنا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کام سے نکل کر اپنے لیے بھی کچھ کرے۔

کلاسز شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔ فرزام کے جانے سے پہلے ایک اور پیش رفت ہوئی۔ جس نے ان کی زندگی میں تھوڑی اور تبدیلی کر دی۔ افق کی اماں کا گھر ایک بندگلی میں تھا۔ اس گلی کے دونوں گھر ایک پارٹی مارکیٹ بنانے کے لیے خریدنا چاہتی تھی۔ اس گلی کے سرے پر سڑک تھی اور اس سڑک پر بہت سی دکانیں تھیں جو پارٹی وہ جگہ لیتی چاہتی تھی، اسے راتوں رات ہی جگہ چاہیے تھی۔ اسی لیے انہیں اچھی خاصی قیمت کی پیش کش کی جا رہی تھی۔ رقم اتنی اچھی تھی کہ انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ باہمی مشاورت سے یہ طے پایا کہ افق کا خاندان فی الحال مسز گوہر کے گھر میں رہے گا۔ آئندہ کے لیے کچھ بھی پلان کیا جاسکتا تھا۔

دونوں گھر بک گئے۔ بھابھی مرکزی شہر سے دور چارمرلے کے گھر میں چلی گئیں۔ افق کا گھر انہ مسز گوہر کے گھر میں آ گیا۔ جس ہال نما کمرے میں سامان بیک کر کے رکھا جاتا تھا۔ وہاں لکڑی سے پارٹیشن کروالیا گیا۔ ان کے پچھلے گھر سے بڑا اور کھلا کمرہ بن گیا۔ فرزام نے ایک بیڈلا کر وہاں سیٹ کر دیا۔ آرڈر لینے اور سپلائی کرنے کی ذمہ داری جمال نے سنبھال لی۔ فرزام کی موٹر بائیک اسے دے دی گئی۔

گھر بکنے سے جو رقم وصول ہوئی تھی، اسے افق نے مسز گوہر کے حوالے کیا۔ وہ اسے بزنس میں لگانا چاہتی تھی۔ دونوں پارٹنرز کی طرز پر برابر آ گئے۔ اب وہ ایک خاندان بن گئے تھے۔ انہیں مل کر محنت کرنی تھی۔ مسائل کا حل مل کر نکالنا تھا۔ وسائل اور کامیابی کے لیے مل کر جدوجہد کرنی تھی۔ وہ سب جدا جدا تھے۔ لیکن ان میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ لفظ ”محنت“ کو سیکھ چکے تھے۔ کامیابی کے راستے اللہ کے ہاتھ میں۔ لیکن ان سب نے اپنی اپنی سیڑھیاں بنالی تھیں۔



رات گئے وہ اس کی پینکنگ کر رہی تھی۔ اس گھر کی ایک ہی رونق تھی، فرزام۔۔۔ اور وہ جارہا تھا۔ جانے سے پہلے وہ سب کو کرائے کی کار میں خوب گھماتا رہا۔ جمال اور اسد نے زندگی میں تفریق نام کی چیز نہیں دیکھی تھی۔ اب وہ ہر وقت فرزام کے ساتھ چپکے رہتے۔

جمال تو اب گھر میں ہوتا تھا۔ رات کو ہی پریس جاتا تھا، لیکن اسد اسکول سے آنے کے بعد فرزام کے ساتھ ساتھ رہتا۔ جتنی بار بھی وہ خریداری کرنے کے لیے گیا، اسد اس کے ساتھ ہی رہا۔ اکثر تینوں مال پر چہل قدمی کرتے۔ جھنے ہوئے چنے کھاتے۔ آکس کریم، گولے، گول گپے۔۔۔ اور نہیں تو، فرزام

ان کے ساتھ شرط باندھ کر دوڑ لگانے لگتا۔

اس کا معمول تھا، مسز گوہر کے ساتھ چھٹی والے دن باغ جناح جانا، چہل قدمی کرنا، کبھی کبھی بیڈمنٹن کھیل لیتے۔ اب وہ سب ساتھ جانے لگے تھے۔ اسد اور جمال اس کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ اماں سب کو ایسے ہنستے کھیلتے دیکھ دیکھ گلابی ہوتی جا رہی تھیں۔ صحت اچھی ہو ہی گئی تھی۔ لیکن اس اطمینان و سکون نے اور اچھی کر دی تھی۔

بیڈمنٹن کھیلتے وہ ریکٹ افن کے ہاتھ میں بھی دیتا تو وہ سرنفی میں ہلا دیتی۔ وہ پکڑ کر دور سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا۔ جب وہ ہر شل کو مس کر دیتی تو وہ ایسے شرمندہ ہوتی، جیسے بہت بڑا گناہ کر لیا ہے اور باغ جناح کے سب ہی لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو کر ”شیم شیم“ کہہ رہے ہیں۔

”افن! آخر ریکٹ کو ایسے۔۔۔ ایسے پکڑنے میں تمہارا کیا جاتا ہے۔“ وہ قریب آ کر پھر سے بتاتا کہ ریکٹ کو کیسے پکڑنا ہے۔ اس کے دور جاتے ہی وہ پھر سے بھول جاتی۔

”اس شل سے تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو؟ یہ دیکھو اس میں کوئی بم فٹ نہیں ہے۔“

وہ ریکٹ اسدا یا جمال کو پکڑا دیتی۔ فرزام دور سے چلاتا۔ ”واپس کرو اسدا سے۔۔۔“ وہ واپس اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتے۔

”کھیلتی کیوں نہیں ہوا فنی باجی۔۔۔ ایسے کھیلو۔۔۔ ایسے۔“ اسد بھی اس کے پاس آ کر بیٹتا۔

فرزام نے اس کی طرف ہٹ کی اور وہی پہلی ہٹ اس نے ریورس کی تو وہ ریکٹ چھوڑ چھاڑ، دل پر ہاتھ رکھ کر قہقہے لگانے لگا۔ اس اور جمال نے تالیاں بجائیں۔ وہ چلتا ہوا قریب آیا۔

”اسد! میں جا رہا ہوں۔ لیکن تم یاد سے یہاں آ کر یادگاری پودا لگا جانا۔ ٹھیک یہاں۔۔۔“ جہاں افن کھڑی تھی، وہاں کھڑے ہو کر اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے فرزام بھائی اور کچھ۔۔۔؟“

”میرا خیال ہے، اتنا ہی کافی ہے۔“ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ریکٹ ہاتھ میں لیے کھڑی تھی کہ جاؤں یا یہیں رہوں۔

پھر وہ اس کے ساتھ لمبی لمبی سڑکوں پر چہل قدمی کرتا، ہلکی پھلکی باتیں کرتا، ایک بار اسے خریداری کے لیے لے گیا۔ اسے اپنی پسند کے لمبے کھڑی اور سوتی کے کرتے اور جینز کے کپڑے نمائنگ پاجامے

لے کر دیے۔ پمپ شووز لے کر دیے۔ بڑے بڑے کلاسک ہلکے رنگوں کے ہینڈ بیگز لے کر دیے۔

”تمہاری یونیورسٹی وارڈ روبر تیار ہے۔“ اس کا کہنا تھا کہ کپڑے کم ہی ہوں، لیکن صاف سترے ہوں۔ وہ ایک ہی کیوں نہ ہو۔ نفیس ہو، اچھے رنگ اور اچھے کپڑے میں ہو۔

اسے اپنے یونیورسٹی بیک میں کیا کیا رکھنا ہے، اس نے اسے یہ بھی بتایا۔

”کسی سے ڈرنا نہیں اور سب سے ہائے ہیلور کھنی ہے۔“ اس نے سمجھایا کہ ”لوگوں کے ڈر کو اپنے اندر سے نکال دو۔۔۔ ان سے فاصلے پر رہو۔ لیکن انہیں جانچتی رہو۔ جب ہم زیادہ لوگوں کو جانچ لیتے ہیں تو کم بے وقف بننے ہیں۔ جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنے لگتے ہیں، بہادر بننے لگتے ہیں۔“

اس کی پیکنگ مکمل ہو گئی۔ اسے صبح کی فلائٹ سے جانا تھا۔ سب لوگ کھلی چھت پر موجود باتیں کر

رہے تھے۔ اسد نے ابھی سے رونا شروع کر دیا تھا اور فرزام اسے بہلا رہا تھا۔ جب وہ کمرے میں آیا تو وہ اس کے پڑے استری کر رہی تھی۔ وہ بیک کی زپ کھول کر سرسری نظر سامان پر ڈالنے لگا۔
 ”افق۔۔۔!“ آواز دی۔ اس نے سوچ بچ بند کر دیا کہ کوئی کام ہوگا۔

”ارے نہیں۔ تم کام کرتی رہو۔۔۔ میں یہاں کرسی پر بیٹھاتا کر رہا ہوں۔“
 اس نے سوچ آن کر دیا اور پھر سے استری کرنے لگی۔

”مجھے چند سال تو لگ ہی جائیں گے امریکا میں۔۔۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور خاموش ہی رہا۔ اگلی بات کے انتظار میں افق نے ہی مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسے دیکھتے پا کر وہ جھٹ سیدھی ہو گئی۔

”تم مجھے یاد کرو گی؟ ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔۔۔ بس ایسے ہی۔۔۔ روز فون کیا کروں گا۔۔۔ ایسے میں یاد کیا کرنا؟“ وہ سوال پوچھ کر خود ہی ڈر گیا کہ اگر اس نے ”نہ“ کہہ دیا یا کوئی بھی جواب نہ دیا تو۔۔۔ تو اس نے جواب کی محجاش ہی ختم کر دی۔

افق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ایک اور بات پوچھ لوں۔۔۔؟“ انداز بچکانہ تھا۔ لیکن دراصل اسے بچکانہ بتایا گیا تھا۔
 ”جی! میں سن رہی ہوں۔“ یہ نہیں کہا، ضرور ضرور۔۔۔ اس سوال پر وہ خود بھک سے اڑ گئی کہ نہ جانے کیا پوچھ لے۔

اس نے دیکھا کہ وہ استری شدہ شرٹ کے کالر کو پھر سے استری کر رہی ہے، بار بار اسے استری کر رہی ہے سوال پوچھنے کی نوبت ہی ختم ہو گئی۔ جب اس نے افق کو وقت دے ہی دیا تھا اور بتا کہ اس سے مانگ بھی لیا تھا۔ پھر اسے ایسے اس سے دل لگی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

افق نے اسے جاتے دیکھا اور چاہا کہ اسے روک کر پوچھے کہ کیا پوچھنا تھا۔ لیکن وہ ایسا کرنے نہیں سکی۔ ابھی اس میں اتنی ہیمت نہیں آئی تھی اور ابھی وہ اس سے پوچھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ابھی وہ ہر سوال پوچھ جانے سے ڈرتی تھی۔ ہر جواب کے لیے تیار نہیں تھی۔ ابھی تو وہ صرف فرزام کا احترام کرتی تھی۔۔۔ صرف احترام۔۔۔ باقی سب جذبوں کے لیے نہ جانے کتنا وقت درکار تھا۔

ہفتہ کی رات ان سب نے اسے اللہ حافظ کہا۔۔۔ ٹرائی کو گھسیٹے اس نے ایک اور بار مڑ کر خاص طور پر افق کو دیکھا۔۔۔ وہ جلد ہی اسے بھی بوسٹن بلا لے گا۔



افق کے پیسوں اور کچھ اپنی بچت کو مسز گوہر نے استعمال کیا اور قدانی اسٹڈیم میں ایک دکان کرائے پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ برطانیہ جانے سے پہلے ان کا خواب رہا تھا یہاں ایک دکان حاصل کرنا۔ لیکن اس وقت کیے بعد دیگرے ان کے حالات بدلتے ہی چلے گئے اور وہ خواب پورا نہیں ہو سکا۔ اب دکان انہیں حاصل ہو گئی تھی۔ کچھ ترین و آرائش کروا کر انہوں نے اس کا افتتاح کر دیا۔ افتتاح کچھ ایسے تھا کہ پانچ سوا در ہزار میں سیل لگا دی گئی تھی اور تین کی خریداری پر ایک جوڑا مفت تھا۔ یہ پیش کش اگلے پندرہ دنوں تک کے لیے تھی۔ اس افتتاح کے لیے انہوں نے نئے کپڑے بنائے

تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اسٹاک میں رکھے اچھی حالت کے پرانے کپڑے بھی ڈسپلے کر دیے تھے۔ اسد اور جمال دکان کے سیلز مین بن گئے۔ بیس دن کے اندر اندر سارا اسٹاک ختم ہو گیا۔

مسز گوہر کو اسی دن کا انتظار تھا۔ اب انہیں من چاہا منافع ہو رہا تھا۔ چند بڑے اسٹورز کے آرڈرز کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے براٹھ ”چنز“ کے لیے کام شروع کر دیا۔ یہ اس علاقے میں کھٹنے والی پہلی مکمل بچیوں کے لمبوسات کی دکان تھی۔ جس میں ہر رنگ، کپڑے، ڈیزائن، کام اور ہر طرح کے ایونٹ کے لیے لباس ملتے۔۔۔ انہیں آرڈر بھی دیا جاسکتا تھا، تھیم بھی۔ آرڈر اور تھیم ورک کے لیے وہ تھوڑے سے زیادہ پیسے چارج کرتے تھے۔ مسز گوہر کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی میچنگ پاؤچ اور زیورات کا کام بھی شروع کر دیں گے۔

کام بڑھ جانے کی صورت میں انہیں کارمیکر زیادہ رکھنے پڑے اور اوپر نیچے اس گھر کو انہوں نے چھوٹا سا کارخانہ بھی بنادیا۔

خود ایک اچھی کالونی میں پندرہ مرلے کی کوٹھی میں کرائے دار بن کر آ گئے۔ کارخانے میں میٹرل کی سپلائی کے لیے بینک سے ایک سوڑ کی قسطوں پر کٹوا لی۔ اس سوڑ کی کاڈرائیور جمال تھا۔ وہی کارخانے کے سب ہی اندر باہر کے کام دیکھتا تھا۔ کارمیکروں کے مسئلے حل کرتا تھا۔ حساب کتاب دیکھتا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ پرائیویٹ میٹرک کے امتحان کی تیاری بھی کر رہا تھا۔

اسد نے ایف ایف ایس سی میں کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ قذافی اسٹیڈیم میں دکانیں دوپہر کے بعد ہی کھلتی ہیں۔ اس لیے اب ان دونوں کے پاس کافی وقت ہوتا تھا۔

اتنی اور مسز گوہر کی ساری توجہ اب ڈیزائننگ پر آ گئی تھی۔ اب انہیں کسی کا پابند نہیں ہونا پڑتا تھا کہ فلاں آرڈر نے فلاں طرز کا سہل ہی بنانے کے لیے کہا ہے یا فلاں کپڑ اور ڈیزائن ہی مانگا ہے۔ اب انہیں مکمل آزادی تھی۔ وہ اپنی مرضی کا ڈیزائن کریں گی اور ”چنز“ میں ڈسپلے کریں گی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے ہر ڈیزائن کو پسند کیا جائے گا اور فخر سے پہنا جائے گا۔ اب انہیں ریگولر کسٹمر مل گئے تھے جو سیدھا ”چنز“ ہی آتے۔ ویسے بھی انسانی خطہ ہے کہ وہ ایک بڑی سپر مارکیٹ سے کھینچا چیز بھی بہت اطمینان کے ساتھ لے لے گا اور فخر سے سب کو بتائے گا۔ اونچی جگہ اور اونچے نام بہت سے تقاضے پر پردوں کا کام کرتے ہیں۔

لاہور کے اتنے شان دار علاقے میں ایک شان دار دکان نے انہیں دنوں میں خاطر خواہ سے زیادہ منافع دینا شروع کر دیا۔ منافع سے زیادہ وہ لمبوسات کی پسندیدگی سے خوش تھیں۔ ان کی محنت رنگ لار ہی تھی۔ وقت دو طرح سے بدل جاتا ہے۔ ایک قسمت سے، ایک ہاتھ سے۔ قسمت سے نہ بدلے تو ہاتھ سے بدلنے کی کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ قسمت ہار جاتی ہے ہاتھ نہیں ہارتے۔ دنیا میں جتنی بھی انسانی ترقی ہوئی ہے اسے ہاتھ سے ہی ممکن کہا گیا ہے۔ ورنہ ہاتھ باندھ کر بیٹھے رہنے والے لوگوں کے زمین میں دبے ڈھانچے بھی نہیں ملتے اور مل جائیں تو کارآمد نہیں ہوتے۔

”اتنی کا۔۔۔ مسز گوہر کا۔۔۔ اسد اور جمال کا۔۔۔ ان کا وقت بدل چکا تھا اور یہ وقت ہاتھ باندھے بیٹھے رہنے سے نہیں بدلتا تھا۔

اپنی سوز و کی میں جمال، افق کو ڈراپ کر دیتا۔ وقت ہوتا تو لے بھی آتا ورنہ وہ خود ہی آ جاتی۔ اماں نے گھر کے معاملات سنبھال رکھے تھے۔ وہ کام والی کی نگرانی کر لیتیں۔ بچن کو دیکھ لیتیں۔ ان سب کے لیے دو پہر کا کھانا بنوا کر کارخانے بھجوا دیتیں۔

رات کو فرزام آن لائن آ جاتا۔ باری باری سب سے بات کرتا۔ افق کو اپنی یونیورسٹی کے بارے میں بتاتا۔۔۔ کیا کھایا، کیا پیا، کب سو یا، کب جا گا۔۔۔ وہ اس کو دیر تک بتاتا اور اس سے بھی ڈھیروں سوال کرتا۔ آہستہ آہستہ دونوں میں اچھی گپ شپ ہونے لگی۔ وہ لیپ ٹاپ کے سامنے لالا کر دکھاتا۔ یہ شرٹ لی، یہ پینٹ لی۔۔۔ یہ مگ لیا۔۔۔ پن لیا۔۔۔ یہ کی ماؤس والا کلاک۔۔۔ ایک منٹ تک ہر صورت بچنے والا الارم۔۔۔ یہ نیا سیٹ، نیا لوٹن، نئے جوتے، نئی گھڑی اور جرابیں بھی۔ اگر وہ یہیں اس کے پاس ہوتا تو شاید ایسے کبھی نہ کرتا لیکن سات سمندروں کے درمیان میں آ جانے سے اتنا دور ہو جانے سے اسے احساس ہوا کہ وہ کسے اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہے۔



وہ اپنے ڈپارٹمنٹ، اپنی یونیورسٹی کی خوب صورت ترین لڑکی قرار دی جانے لگی۔ اسے رک رک کر، مڑ مڑ کر دیکھا جاتا۔ پہلے وہ بے چاری تھی۔ بسوں میں، رکشوں میں دھکے کھانے والی، کاؤنٹر کے پیچھے سے فاسٹ فوڈ کی ٹرے دینے والی۔ دیکھنے والے اس پر حق سمجھ کر دیکھتے تھے۔ اب وہ لمبے کروتوں اور تنگ پاجاموں میں، بیک کو کندھے پر لٹکائے، فائل کو ہاتھ میں پکڑے دیکھنے والوں کی پہنچ سے دور نظر آتی۔ اس کے ڈپارٹمنٹ کے لڑکے اس سے بہانے بہانے سے بات کرنا چاہتے تھے۔ اس کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ چند ایک لڑکیوں سے اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی اور ان سے بات چیت ہوتے ہی وہ انہیں بتا چکی تھی کہ وہ مس نہیں، مسز ہے۔ اس سے مسز کا سنتے ہی لڑکیاں اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتیں۔۔۔ انہیں بہت بے چینی ہوئی تھی، یہ جاننے کے لیے کہ اگر یہ ایسی دکھتی ہے تو وہ کیسا ہوگا۔

لڑکوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انہیں جھوٹ لگا۔ کئی ایک نے اسے سفید جھوٹ کہا۔ وہ جانتے تھے کہ کچھ لڑکیاں لڑکوں سے دور رہنے کے لیے یہ مشہور کر دیتی ہیں کہ ان کا نکاح ہو چکا ہے یا منگنی۔ اب اگر یہ سفید جھوٹ بھی تھا تو افق کا انداز ایسا تھا کہ کوئی لڑکا اس کے قریب جانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ فرزام سے شادی ہونے کے باوجود وہ لڑکوں سے سخت نفرت کرتی تھی۔ جہاں لڑکے اسے موبائل ہاتھ میں پکڑے یا باتیں کرتے نظر آ جاتے، اس کا خون کھول جاتا۔ لڑکوں کے گروپ میں ہنسی کے فوارے پھوٹ رہے ہوتے تو اس کے پسینے نکلنے لگتے۔ اسے یقین ہو جاتا کہ کسی لڑکی کا مذاق اڑایا جا رہا ہوگا۔ وہ لڑکوں سے نفرت کرتی تھی یا ان سے خوف زدہ تھی اس کا تاثر اس نے اپنے چہرے پر کبھی نہیں آنے دیا تھا۔ ہاں اس کی ذات میں ایک واضح نشان ضرور بن کر ابھر آیا تھا۔

”دور رہو۔“

جب وہ اور مسز گوہر کسی ہوٹل میں منعقد کسی نمائش میں جاتیں تو لوگ اسے کوئی بڑی ڈیزائنر سمجھتے۔ وہ دونوں دوسروں کے کام کا بغور مشاہدہ کرتی تھیں۔ اس سے انہیں اپنے کام میں جدت لانے کے نئے نئے آئیڈیاز ملتے تھے۔ فیشن سے متعلق ہونے والے ایونٹ میں وہ دونوں اکثر جایا کرتی تھیں۔ ان کا اپنا

ارادہ بھی ایک ایونٹ کروانے کا تھا لیکن ابھی نہیں۔

آج کل وہ کرائے پر ایک کارنیزادکان حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اب وہ ایک اور دکان کا کرایہ افورڈ کر سکتے تھے۔ ایڈوانس بھی ان کے پاس تھا۔ دوسری طرف مسز گوہر کا خیال تھا کہ اگر کوئی مناسب دکان نہیں ملتی تو کسی اچھی سوسائٹی یا ٹاؤن میں وہ لوگ ماہوار قسط پر ایک اچھا گھر لے لیں۔

افق اس کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ فی الحال بزنس کو ہی ترقی دینی جائے۔ فرزام کا دوٹ مسز گوہر کے حق میں گیا اور اس نے گھر لینے کے لیے کہہ دیا۔ اس کا مشورہ یہ تھا کہ جو ادائیگی گھر کے کرائے کے سلسلے میں کی جاتی ہے، وہی گھر کی قسط کی مد میں ادا کر دی جائے گی اور دکان کے ایڈوانس کے لیے ہو کچھ اور انتظار کر سکتے تھے۔

لاہور کے مرکز سے ذرا سادہ اور ایک اچھے ٹاؤن میں انہوں نے ایک بنگلے کی ایڈوانس پے منٹ کر دی۔ باقی رقم انہیں دو سال کے اندر اندر ادا کرنی تھی۔ مسز گوہر کی خوشی دیکھنے لائق تھی جیسے انہیں ان کا بیٹا ہوا گھر واپس مل گیا ہو۔ وہ بے حد خوش تھیں۔ جمال اور اسد کو الگ الگ کمرے مل گئے۔ افق کو اپنے شوہر کا اپنا کمر مل گیا۔



سیاہ لنگ کوٹ پہنے وہ ڈرائی گھسٹی شیشے کے دروازے کے پار دیکھ رہی تھی۔ اس کی فلائٹ وقت پر آئی تھی۔ لیکن اس کا سامان کم ہو گیا تھا۔ اسے اپنے سامان کے بھونڈنے میں دانی وقت لگا۔ وہ لوگوں انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر موجود تھی۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ فرزام اس کا انتظار کر کے چلا گیا ہو۔ اس نے کل ہی کہا تھا کہ اگر فلائٹ کے ساتھ کچھ ہوا تو وہ ایئر پورٹ پر سو جائے گا۔ وہاں سے جائے گا نہیں اور وہ ہنسنے لگی تھی۔

”اتنے شور میں نیند آ جائے گی؟“

وہ علامہ اقبال ایئر پورٹ نہیں ہے، جہاں آدھے سے زیادہ لوگ پکنک منانے آ جاتے ہیں۔ امریکیوں کا ہوائی اڈہ ہے۔ ہزار کیا، لاکھ بھی ہوں تو شور نہیں ہوتا۔

”کتنے اچھے ہیں امریکی۔۔۔ پاکستانیوں کو تو کچھ آتا ہی نہیں۔“

”ظن مت کرو۔ سامان باندھ لو۔“

”وہ تو ماں نے کب سے باندھ دیا۔“

”میرے لیے کیا لار ہی ہو؟“

”شلوار سوٹ۔“

”ہیں۔۔۔ اور۔۔۔؟“

”اور بس۔۔۔“

”جہاز میں بس لانے دیں گے کیا؟“ دیر تک تہقہ گو بچتا رہا۔

امریکا میں پاکستانی کمیونٹی نے ایک نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ فرزام نے ان کے لیے بھی ایک اسٹال بک کروا دیا تھا۔ ان دنوں افق کے ایم اے پارٹ ون کے امتحان چل رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ

دونوں ہی آجائیں، لیکن صرف مسز گوہر کو ہی جانا پڑا۔ دو ماہ امریکا فرزام کے پاس رہ کر اور کامیاب نمائش بننا کر وہ واپس آ گئیں۔ کارخانے میں ان میں سے کسی ایک کا ہونا بھی ضروری تھا۔

امتحانات کے باوجود افق نے کارخانہ سنبھالے رکھا۔ اس بار ویسی ہی ایک اور نمائش کے لیے افق جاری تھی۔ اس کا ایم اے ہو چکا تھا۔ زلٹ آنے والا تھا۔ فرزام بھی ایم ایس سی کر چکا تھا۔ جب وہ پہلے ہی کر رہا تھا۔ آج کل ایک، دو کورسز کر رہا تھا۔ امریکا میں اس نے چند جگہ اپلائی کیا ہوا تھا اور اسے امید تھی کہ اسے ایک آدھ کال تو ضرور آئے گی۔

افق کا ذہن وہ پہلے سے ہی بنا چکا تھا کہ ایم اے کے بعد وہ ڈریس ڈیزائننگ کا کورس امریکا سے کرے گی۔ مسز گوہر اس کی ایسی باتیں سن لیتیں تو بہت ہنستیں۔

”ہاں، ہاں، بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ، سب بھاگ جاؤ، پہلے تم بھاگے، اب افق کو تیار کر رہے ہو۔“

”یہ میری ماں نے کہا یا افق کی ساس نے؟“

”دونوں نے۔“ وہ کھلکھلائیں۔

افق کافی دیر سے کھڑی تھی۔ فرزام نظر آ کر نہیں دے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نکلتے ہی اسے سامنے کھڑا ملے گا۔ لیکن اب۔۔۔ ہاں، ذرا دور سے آتا، وہ اسے نظر آ گیا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ ڈھائی سال دونوں نے ایک دوسرے کو آن لائن دیکھا تھا۔ ڈھائی سال لیپ ٹاپ سے آنے سامنے رہے تھے۔ اس نے اس کی ہر ہر بات سنی تھی۔ بہت سے لطیفوں پر ہنسی تھی۔ اس کی خریدی گئی بہت سی چیزوں کو ناپسند کیا تھا۔ بخارا اور زکام میں اس کی سرخ ناک کا مذاق اڑایا تھا۔۔۔ اور اب۔۔۔ وہاں کھڑے، بھاگتے ہوئے ایک شخص کو اپنے قریب آتے دیکھتے افق کو عجیب لگ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس پر اس کی پہلی نظر پڑی اور اس کے دل نے چاہا کہ چلا ننگ لگا کر باہر آ جائے۔ اس پر اس کی نظر پڑی تو جی نہیں چاہا کہ وہ نظر واپس لوٹ آئے۔

دونوں کی نظریں ملیں۔ فرزام خوش دلی سے مسکرایا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھول تھے۔ اس کے قریب آ کر وہ بریک لگانے کے سے انداز میں رکا۔

”او میری افق!“ پھول اس کے ہاتھ میں دیے۔ ”ایک ایکسڈنٹ ہو گیا تھا۔ ایک گھنٹے سے سڑک جام تھی۔“

اس نے پھول پکڑ لیے۔ فرزام نے ٹرائی سنبھال لی۔

”کسی نے تمہیں جہاز سے اتر جانے کے لیے تو نہیں کہا؟“

”ایک نے مشورہ دیا تھا کہ اتر جاؤ۔ کیوں پاگلوں کے ملک میں جا رہی ہو۔“

فرزام کا قہقہہ ایئر پورٹ کی عمارت میں بکھر گیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ بہت دل لگا کر تیار ہوا ہے۔ اس کے بالوں کا اسٹائل، اس کا نیا نیا لیا کوٹ، نیا منظر، نئی گھڑی، خاص پر فیوم۔

اس نے ان میں سے ایک بھی چیز اسے آن لائن نہیں دکھائی تھی۔ وہ سب کا حال چال پوچھتا، اس

کاسامان کار میں رکھنے لگا۔

”سفر میں بورسی ہوئی ہوگی۔۔۔ ہے نا؟“

”نہیں۔۔۔ میں یہ کتاب پڑھتی رہی۔“ اس نے پھولے ہوئے بیک کی طرف اشارہ کیا۔ فرزام کا خیال تھا وہ کہے گی کہ وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ ان گزرے سالوں میں دونوں میں بہت اچھی دوستی ہو چکی تھی۔ فرزام جیسے لڑکے پر افق کو بہت ناز تھا۔ افق جیسی بیوی فرزام کو بہت پیاری ہو گئی تھی۔

فرزام کا چھوٹا سافلیٹ بہت پیارا تھا۔ شروع میں وہ ہاسٹل میں رہتا تھا۔ پھر چار لڑکوں کے ساتھ اپارٹمنٹ شیر کیا۔ جب اسے اچھی جاب مل گئی تو اس نے اپنا الگ فلیٹ لے لیا۔ اس فلیٹ میں سامان کم ہی تھا۔ افق کے لیے اس نے ذرا اچھی طرح سے اسے ڈیکوریٹ کر لیا تھا۔ وقت نکال نکال کر ماریکٹوں میں دھکے کھاتا رہا تھا۔ پردے، صوفے، ٹیبل، برتن آہستہ آہستہ اس نے بہت کچھ لے لیا تھا۔ فلیٹ دو بیڈروم، لاؤنج، کچن اور ڈائننگ ایریا پر مشتمل تھا۔

”یہ ماں کے گھر جتنا بڑا نہیں ہے۔ لان بھی نہیں ہے۔ الگ ڈرائنگ روم بھی نہیں ہے۔ یہ بڑے بڑے ہاتھ روم بھی نہیں ہیں، لیکن یہ جتنا بھی ہے، سارے کا سارا تمہارا ہے۔“

افق فریش ہو گئی تو وہ اسے ڈنر کے لیے لے گیا۔

”کیسا لگ رہا ہے یہاں آکر؟“

”اچھا ہے۔“ افق نے فرزام سے نظر بچا کر ہال پر ایک نظر دوڑائی۔

”اور میں۔۔۔؟“

اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ مسکراہٹ چھپا گئی۔

”اور میں۔۔۔؟“ اس بار چلا کر پوچھا۔

”ٹھیک ہی ہیں۔“ دانتوں میں ہونٹ کا دائیں طرف کا کونادبا کر کہا۔ ہنسی کا فوارہ نکلنے کو تھا۔

”پورے سو ڈالر دینے کے بعد میں ٹھیک ہی ہوں بس۔۔۔۔۔“

افق نے سو ڈالر پر سوالیہ دیکھا۔

”جی ہاں۔۔۔ Men's spa سے آرہا ہوں۔۔۔ سو ڈالر میں تیار ہو کر۔۔۔“

انداز میں خفگی تھی۔ سو ڈالر ضائع جانے پر یا تعریف نہ کیے جانے پر۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی تو دیر تک ہنستی ہی رہی۔ وہ کوئی لیڈی ڈانسا بھی، جس کے آنے پر وہ اس طرح سے بن ٹھن رہا تھا۔ افق نے آتے ہوئے لپ گلوڑ لگایا تھا، جواتی لمبی فلائٹ میں کب کا گم ہو چکا تھا۔ یہاں آتے ہوئے بھی اس نے صرف کپڑے ہی تبدیل کیے تھے۔ بلیک شیفون کا سوٹ جس کے تنگ بازوؤں پر سفید موتیوں کی تین لائن تھیں اور ایسی ہی تین لائیں دوپٹے کے چاروں طرف تھیں۔ سامنے سے بال اٹھا کر انہیں چند بل دے کر پیچھے پن لگالی تھی اور بالوں کی ڈھیلی چوٹی بنا کر انہیں پیچھے سے لاکر بائیں کندھے پر رکھا تھا۔ دائیں کندھے پر دو پٹا سلیقے سے جمایا ہوا تھا۔

”اب تمہیں بہت ہنسی آیا کرے گی۔“

”کیوں؟“

”میں اب بہت الٹا پلٹا سا بچہ بن گیا ہوں۔“

اس انداز پر وہ اور ہنسی۔

”دیکھا۔۔۔ مجھے معلوم تھا۔ تمہیں بھی بتا دیا ہے۔“ ساتھ ساتھ وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے۔

”تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے گھومنے پھرنے کے لیے۔“

”پھر؟“ وہ سچی کہ شاید ایک ہفتے بعد وہ کہیں چلا جائے گا۔

”پھر تمہیں نہیں معلوم؟ ایونٹ پر نہیں جانا تمہیں نمائندگی کرنے؟“

”جی ہاں!“ اسے یاد آیا کہ یہاں وہ چیز کی آؤٹ لیٹ (Out let) لے کر آئی ہے اور کچھ

پاکستانی بوتیک مالکان تھے، جن سے ان کی بات چیت چل رہی تھی۔ اسے فرزام کے ساتھ مل کر یہاں مستقل ایک کارنر ڈھونڈنا تھا۔ ان کے جو مستقل کسٹمر بوسٹن میں رہتے تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا ہر طرح کی مدد کرنے کا۔ ایونٹ دس روزہ تھا اور اس کے بعد ہی کچھ ہو سکتا تھا۔ ابھی تو فی الحال فرزام کو شپ منٹ لانا تھی۔

پاکستانی اور اٹارن کیونٹی نے مل کر اس ایونٹ کا اہتمام کیا تھا۔ ان کے ایک کلائنٹ نے ہی انہیں اس کے بارے میں بتایا تھا۔ باقی معلومات فرزام نے حاصل کر لی تھی۔ بنگ انہیں آسانی سے مل گئی تھی۔

دس روزہ ایونٹ ٹھیک ٹھاک رہا۔ جاب کے ساتھ ساتھ فرزام نے اس کی مدد بھی کی۔ اسی ایونٹ کے دوران ان سے ایک بڑی اور فعال این جی او کا نمائندہ ملا وہ انہیں این جی او کی طرف سے کروائے جانے والے دوسرے ایونٹ میں شامل ہونے کے لیے راضی کر رہے تھے۔ جس کا مقصد فنڈز اکٹھا کرنا تھا۔ این جی او تھروڈورلڈ میں بچوں کی عام بیماریوں کی ویکسین مفت سپلائی کرنے کا کام کرتی تھی اور اس کے لیے وہ کمیونٹیز کو اکٹھا کر رہی تھی۔ این جی او کے ساتھ کام کرنے والے مجموعی منافع کا پچیس فیصد رکھ سکتے تھے۔ باقی کا منافع انہیں این جی او کو فنڈ دینا تھا۔

افق نے پاکستان میں مسز گوہر سے بات کی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ مطلوبہ آرڈر تیار کروا کے امریکا بھیجا سکتی تھیں۔ افق نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ معاہدے کی رو سے اگر وہ ایک خاص شرح سے زیادہ فنڈز اکٹھا کر کے دیں گی تو اسے این جی او کو اپنی آراء اور مشوروں سے نواز سکتی ہے۔ ایونٹ کے باقاعدہ شروع ہونے میں ایک مہینہ تھا۔ ہفتہ اور اتوار، دو دن انہیں شہر کے مختلف کمیونٹی سینٹرز میں نمائش منعقد کرنی تھی۔ ہر ہفتے نئی جگہ ہوگی۔

این جی او نے اسے دور رضا کار بھی دے دیے۔ کام کرنے اور کسی بھی مسئلے سے بچنے کے لیے۔ مقامی اور غیر ملکی پچاس سے زیادہ گروپس شرکت کر رہے تھے۔ پمفلٹ پر ”چیز“ کو بھی نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ اخبارات میں اشتہارات دیے گئے۔ ٹی وی میں فنڈ ریزنگ کے لیے تشہیر کی گئی۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ امریکا وہ پاکستان سے بھی زیادہ مصروف ہو جائے گی۔ کارخانے میں ان کی ایک اسٹنٹ تھی، مس سندس۔ افق سارا وقت اس سے آن لائن رابطے میں رہتی۔ دونوں آپس میں

ڈسکس کرتی رہتیں کہ کس ڈیزائن اور کس میٹرل کو لے کر کام کرنا ہے، رنگ کون سے اچھے رہیں گے اور کس پڑے کو بوسٹن کے لوگ پسند کریں گے۔ وہ پاکستانی مخصوص روایتی لباس ہی بتا رہے تھے۔ لیکن کیونکہ اس ایونٹ میں ہر ملک کے لوگ آنے والے تھے تو انہوں نے جینز پر پہننے کے لیے مختلف ڈیزائن کے کروتوں پر بھی کام کیا تھا اور چھوٹے کراس بیک پرنٹیں ایچ لڑکیوں کے اسٹائلز پر بھی۔

یہ ایونٹ تین مہینے تک جاری رہنا تھا۔ ان کے پاس کام کے لیے وقت تھا۔ پہلا اسٹاک جلد ہی مل جاتا تھا۔ این جی او کی طرف سے انہیں بریفنگ دی جا رہی تھی اور ریڈ کیا جا رہا تھا۔ انہیں بتایا جاتا کہ انہیں کیسے اپنی مصنوعات کو ڈسپلے کرنا ہے۔ کم سے کم پرائز ٹیک کیا ہونے چاہئیں اور زیادہ سے زیادہ کیا۔ انہیں پہلے جمع کیے گئے فنڈز کے بارے میں بتایا گیا۔ انہیں اچھی طرح بریف کیا گیا کہ کس طرح وہ پہلے سے زیادہ فنڈز اکٹھا کر سکتے ہیں۔ این جی او کے ریکارڈ کو توڑ سکتے ہیں۔ ان سے سوالات کیے جاتے۔ مشورے مانگے جاتے۔ انہیں ٹھورڈورلڈ کے بیمار بچوں کی مختصر ڈاکومنٹریز دکھائی جاتیں۔ یوں انہیں فنڈز ریزنگ کے لیے اچھی طرح تیار کر دیا گیا۔



”ایک بار مانا نے کہا تھا کہ افق ”خیر“ ہے۔ تم تو زیادہ ہی ”باعثِ خیر“ بن گئی ہو۔“ بات اچھی تھی، لیکن انداز ذرا افسردہ سا تھا۔

وہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھی اپنا کام کر رہی تھی۔ قریب ہی پاکستان سے بھیجا گیا پہلا اسٹاک بکھر پڑا تھا۔ وہ انہیں جانچ رہی تھی اور الگ الگ کر رہی تھی، ساتھ ساتھ پیڈ پر نوٹس لکھتی جا رہی تھی۔ ایونٹ کے پہلے ہفتہ کے لیے وہ خاص الخاص کلیکشن کا انتخاب کر رہی تھی۔

”کیا مطلب۔۔۔؟“ بین کو تیزی سے چلاتے اس نے پوچھا۔ فرزام نے آگے بڑھ کر اس کا بین اچک لیا۔

”کہو تو میں نہ جاؤں۔“ قریب ہی کی کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔

بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ”کہاں؟“

”کینیڈا۔“ دونوں ہاتھوں کو اداسی سے ٹھوڑی کے نیچے رکھا۔

”آپ کے آفس والے بھیج رہے ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ آٹھ ماہ پہلے میں نے وہاں کی ایک کمپنی کو درخواست دی تھی۔ ساتھ ہی اپنے کام کی تفصیل اور سی ڈی بھی بھیجی تھی۔ کمپیوٹر سے متعلق کچھ نئی اصلاحات پر کام کیا ہے میں نے۔ چند سوفٹ ویئرز بھی میں سمجھتا ہوں کہ میں کامیابی سے بنا سکتا ہوں۔ وہ مجھے انٹرویو کے لیے بلارہے ہیں۔“ باتیں وہ اچھی کر رہا تھا لیکن مزہ بگڑتا ہی جا رہا تھا۔

”تو جا لیں نا۔“ دراصل وہ سمجھ ہی نہیں پاتی تھی وہ اداس کیوں ہو رہا ہے۔

”ہاں تو جا ہی رہا ہوں۔“ وہ لالی پاپ نہ ملنے کا انداز۔ افق کو حیرانی تھی کہ وہ خوش کیوں نہیں

ہے۔

”تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟“ اس نے اچانک پوچھا جیسے دراصل یہی پوچھنا چاہ رہا ہو۔ افق نے

الچہ کر اس کی طرف دیکھا کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا اور یہ کیوں سمجھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی۔
 ”یہ کیسا سوال ہے۔۔۔؟“ وہ واقعی حیران تھی۔

”تم مجھے روک ہی نہیں رہیں۔ تمہیں کہنا چاہیے تھا کہ نہ جائیں نا۔۔۔ تم نے کہہ دیا کہ جائیں نا۔“

”اوہ۔۔۔!“ افتخ کی سمجھ میں اب بات آئی تھی۔ اس کی نگاہیں جھک گئیں اور اس نے سامنے رکھے پیڈ پر انہیں گاڑ دیا۔

وہ جو دونوں کے تعلق کے درمیان ایک فاصلہ بنیاد سے ہی چلا آ رہا تھا، وہ اب بھی وہیں تھا۔ وہ کم ضرور ہو رہا تھا لیکن ابھی تک موجود تھا۔ فرزام اس کے ساتھ چہل قدمی کرتا تھا لیکن اس کی کمر میں اپنے بازو محال نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی اس کا بازو تھا تھا تھا۔ جب افتخ کچن میں کام کر رہی ہوتی تو وہ اس کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا تو کچھ نہ کچھ ضرور افتخ کے ہاتھ سے گر جاتا اور وہ مسکراہٹ دیا تا کچن سے چلا جاتا۔ اگر انہیں ایک ہی صوفے پر بیٹھنا ہوتا تو وہ ذرا فاصلہ رکھ کر بیٹھتے۔ ورنہ الگ الگ صوفوں پر ہی بیٹھتے۔ وہ رومانس کے دور میں داخل ہو رہے تھے لیکن رومانس کرتے نہیں تھے۔

افتخ جب اکیلی ہوتی، بس میں بیٹھتے، ٹیوب میں، این جی او کی بریفنگ لیتے، سبزی اور گوشت کی خریداری کرتے، ڈھیر سارے بیگز کو ہاتھ میں پکڑے، فٹ پاتھ پر چلتے، سڑک کو پار کرتے، ٹکٹ لیتے، گھر کا لاک کھولتے وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوتی۔ وہ دن رات اسے سوچتی۔ کام کے دوران بھی اسے کھوجتی۔ پاکستان میں وہ اس کے آن لائن آنے کا انتظار کرتی تھی۔ یہاں وہ اسے بار بار دیکھنے کا انتظار کرتی تھی۔ پاکستان میں وہ انتظار کم تھا یہاں بہت بڑھ گیا تھا۔ فرزام اس کا شوہر تھا۔ جس کے کھوجانے کا اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ جس کے چلے جانے کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ وہ اسے بہت بہت پسند کرتی تھی۔ بہت یاد کرتی رہی تھی۔

”نہ جائیں۔۔۔“ اس نے اعتماد سے کہہ دیا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ سمجھے کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی اور وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ جس کام کے لیے اس نے اتنی محنت کی ہے، وہ صرف اس کی وجہ سے اس محنت کا ثمر نہ کھائے۔ اگر وہ امریکا نہ آئی ہوتی تو وہ چلا ہی جاتا۔ اس طرح اس کے کہنے پر وہ بہت خوش نظر آنے لگا۔ جیسے جانا تو اسے بھی ہے۔ لیکن روکے جانے کی اسے بہت خواہش ہے۔

”میں تمہیں یہاں بلا کر خود یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں۔ انٹرویو تو بہانا ہے۔ میرا کام انہیں پسند آ گیا ہے۔ وہ میرے آگے کنٹریکٹ رکھ دیں گے۔“ ٹیبل پر رکھے اس کے ہاتھ پر اس نے ہاتھ رکھ دیا۔

افتخ کا دل جا ہا کہ وہ ہاتھ اٹھا لے اور یہ بھی کہ وہ اس کے ہاتھ پر ہی رہے۔ وہ سمجھ گئی کہ جانا بھی چاہ رہا ہے اور رکنا بھی۔

”ایسے سنہری موقعے بار بار نہیں ملتے۔“

اس بات پر وہ خاموشی میں سمٹ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ فیصلہ وہ خود کرے۔ اگر وہ اسے جانے کے لیے کہے تو شاید وہ برا مان جائے اور اگر روک لے تو اس کا خواب توڑ دے۔

دودن وہ ایسے ہی الجھار ہا۔

”اس پروجیکٹ پر کام کرنے سے مجھے اچھے خاصے پیسے ملیں گے۔ میں کافی امیر ہو جاؤں گا۔

بہت زیادہ اپنے پیسوں والا۔ پھر تم میرے ساتھ پیرس چلو گی؟“

یہ صرف ایک سوال تھا۔ لیکن سر ہلانے سے پہلے جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو جانا کہ یہ صرف ایک عام سا سوال نہیں ہے یہ ان دونوں میں چھپی ہوئی ”محبت“ ہے۔ مدھم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں اور آنکھوں میں چمکی۔ فرزام کی نظریں اسی چمک دمک پر ٹکی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ طے ہوا۔۔۔ ابھی تو ایسا ہے کہ زندگی افراتفری کا شکار ہے۔ تم فنڈ ریزنگ کے لیے کام کر رہی ہو۔ بوشن میں تمہیں ایک کارز بھی چاہیے۔ ماں مجھے بار بار فون کر کر کے کہہ رہی ہیں کہ ان کے کارز کا کیا کیا۔ ایک دو لوگوں سے بات چل رہی ہے۔ ساتھ چلنا۔ تم بھی مل لینا اور میرے آنے سے پہلے ہر کام سے فارغ ہو جانا۔ ٹھیک ہے۔“ ساتھ سر بھی ہلایا۔

”پروجیکٹ پر ہی کام کروں گا۔ کمپنی مجھے جاب بھی دے گی۔ لیکن مجھے کینیڈا میں نہیں رہنا۔ وہاں کا موسم نہیں پسند مجھے۔ اگر وہ مجھے برطانیہ میں اپنی کمپنی کی برانچ میں سیٹ کر دیں تو ٹھیک ہے۔ میرے بھی کچھ خواب ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ میں برطانوی حکومت کو یہ بتا سکوں کہ انہوں نے کس قدر لائق فائق لڑکے کو نکال باہر کیا۔ ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ اس بار انہیں مجھے اعزاز سے ویزا دینا ہوگا۔“

اما کہتی تھیں کہ وہ پریشانی اور خوشی میں بولتا بہت ہے۔ اب افق کی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوشی میں بول رہا ہے یا پریشانی میں۔ افق نے سوچا کہ اسے ایک بار پھر فرزام کو روکنا چاہیے۔ شاید وہ یہی چاہتا ہے۔

”اگر دل نہیں چاہ رہا تو نہ جائیں۔“

بولتے بولتے رک کر وہ اسے دیکھنے لگا۔ ”مذاق کر رہی ہو؟“

سرفی میں ہلایا۔ ”روک رہی ہوں۔“

”اب میں تمہیں پیرس گھوما کر ہی رہوں گا۔ چند دنوں کی بات ہے، میں سیٹ ہو جاؤں گا۔“

آخری بات کہتے کہتے منہ کو زیادہ لٹکایا۔

جفتے کے اندر اندر وہ چلا گیا۔ وہ اپنے کام میں بے حد مصروف تھی۔ لیکن اس بار یہ مصروفیت اسے اچھی نہیں لگی۔ بوشن آنے کے بعد دو ہفتہ وہ گھومتے رہے تھے۔ وہی ٹھیک تھا۔ وہ کام سے نہیں ٹھکتی تھی لیکن اب اسے اپنے آس پاس فرزام چاہیے تھا جیسے وہ ٹیبل پر بیٹھی کام کر رہی ہوئی تو وہ اچانک سے اس کا پین آ کر اچک لیتا۔ سندس کو ”بائے بائے“ کہتا۔ چاکلیٹ دودھ کا گلاس اس کے سامنے لا کر رکھتا اور ایم پی تھری کے ایرفون اس کے دونوں کانوں میں لگاتا۔

”پہلے گلاس ختم کرو۔ پھر کم سے کم تین گانے سنو۔ پھر کام شروع کرنا۔“ وہ گلاس لی جاتی۔ تین گانے سن لیتی اور پھر سے پین پکڑ لیتی۔ رات گئے سندس کے ساتھ ویڈیو چیٹ پر جب وہ ڈسکشن کر رہی ہوتی تو قریب ہی صوفے پر آڑا تر چھالیٹے وہ اپنی جمائیاں روک رہا ہوتا۔ بظاہر وہ وی دیکھ رہا ہوتا لیکن دراصل اسے الارم دے رہا ہوتا کہ اب بس کرو کام۔۔۔ اور دوسری تیسری بار جب وہ اس پر نظر

ڈالتی تو وہ صوفے سے لڑھک کر نیچے کارپٹ پر سو رہا ہوتا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ الٹا پلٹا سا بچہ بن گیا ہے۔

اور افاق جیسے اقوام متحدہ کی سفیر بن گئی تھی۔ کام اس کی طرف کھینچے چلے آتے۔ گھر کے کام اور کھانا وہ پہلی فرصت میں ہی بناتی تھی۔ بانی کے اپنے کام سارا وقت کرتی۔

”کیا تم روز کھانا بناتی ہو یا؟“ ایک دن وہ آفس سے آکر بولنے لگا۔

”نہ بنایا کروں؟“

”کبھی کبھار ہی دیا کرو کہ“ فرزام جی! مجھ سے نہیں ہوتے اتنے کام۔ یہ کھانا دانا میں نہیں بنا سکتی اب۔۔۔ چلیں! کہیں باہر چل کر کھاتے ہیں۔“ وہ اس کی آواز اور انداز کی بھرپور نقل اتار رہا تھا۔

”فرزام جی!“ اسی کی طرح ”فرزام جی“ کو تان میں کھینچا۔ ”ہم یہ کھانا باہر چل کر کھا لیں؟“

”یہ کھانا۔۔۔ باہر کہاں؟“

”اس بلڈنگ کے گارڈن میں۔۔۔“ ہاتھ سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہارا خیال ہے کہ باہر کھانا کھانے سے میرا یہ مطلب ہے۔ گھر میں پکاؤ اور باہر جا کر کھا لو۔ ہو گیا باہر جا کر کھانا؟ ایسا کرتے ہیں کسی ہوٹل کی پارکنگ میں اپنے پیچ پلٹیں اور گلاس لے کر چلتے ہیں اور وہاں کھاتے ہیں کھانا۔ ایسے ہو جائے گا، ہوٹل میں کھانا کھانا۔“

وہ خوب ہنسی اور منٹوں میں تیار ہو کر آگئی۔ ”چلیں؟“

”کہاں؟“ فرزام کو معلوم تو تھا۔ لیکن اسے چڑا رہا تھا۔

”ہوٹل کی پارکنگ میں کھانا کھانے۔“

دونوں جی جان لگا کر بنے۔



فنڈ ریزنگ کا پہلا ایونٹ ٹھیک ٹھاک رہا۔ لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔ افاق کا اسکور بھی اچھا رہا تھا۔ آئندہ کے لیے وہ اور پرامید ہو گئی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی مصنوعات میں وہاں کے لوگوں کی دلچسپی کا خاص مرکز کیا تھا اور کتنا زیادہ پسند کیا گیا اور کیا لیا گیا۔ یہ کھد کے موٹے کرتے تھے۔ جن پر کام تو مشینی ہوا تھا، لیکن ان کے ڈیزائن ایسے تھے کہ لگتا تھا کہ ہاتھ سے بنائے گئے ہیں۔ مشینی کڑھائی میں یورپین ممالک ہر ملک سے آگے ہیں۔ اس لیے وہاں کے لوگ ان چیزوں میں خاص دلچسپی لیتے ہیں، جو کسی دوسری ثقافت کی نمائندہ ہو۔ ان کرتوں پر روایتی ٹانگوں کو مشین سے بنایا گیا تھا۔ کیونکہ ہر شخص وہ چیز لیتا چاہتا ہے جو کسی دوسرے کے پاس نہ ہو تو ایسے میں دوسرے ملکوں کی روایتی چیزیں دھڑا دھڑا فروخت ہوتی ہیں۔ ہندوستانی اسٹالوں پر بھی کم و بیش ایسی ہی چیزیں تھیں۔ لیکن رنگوں اور ڈیزائن میں فرق ایک چیز کو دوسری سے الگ کر رہا تھا۔ وہاں ان کا مقصد منافع نہیں، فنڈز تھے اور سب ہی چاہتے تھے کہ وہ اچھے فنڈز اکٹھے کر لیں۔ افاق کو اچھا لگ رہا تھا این جی او کے لیے کام کرنا۔ مختلف طبقہ ہائے زندگی اور شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے بے شمار امریکی، مشہور و معروف قانون دان، کھلاڑی، صحافی، اساتذہ، ڈاکٹر، وکیل، سینیٹرز اور بے شمار دوسرے لوگ رضا کار بنے ہوئے، اپنے اپنے طور پر کام

کر رہے تھے۔ سامان کو اٹھانے اور صفائی کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے تھے جو وہ دروڑا کا راس کے ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک ساٹھ سالہ سرجن ڈاکٹر تھے۔ دوسرا رضا کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ جو ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ ایسی صورت حال میں افق کا جذبہ اور بلند ہو گیا۔

واپسی پر وہ فرزام کو ایک ایک بات بتاتی۔ پیر تک وہ مصروف رہی۔ اگلے دو دن اس کے پاس بہت وقت تھا۔ اس نے گھر کے لیے ضروری خریداری لی۔ فرزام کے دوست کی بیوی نعل اس کے ساتھ ہی تھی۔ اس نے زندگی میں کسی لڑکی کو لب اسٹک کے لیے اتنا جنونی نہیں دیکھا تھا، جتنی وہ تھی۔ وہ شاپنگ مال میں، ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے، ریسٹورنٹ میں آکس کریم کھاتے ہوئے، آس پاس موجود خواتین پر نظر گاڑے رکھتی۔۔۔ ان کے ہونٹوں پر۔۔۔ اگر خاتون دور ہوتی تو آنکھیں سکیڑ لیتی۔ ورنہ ذرا سا قریب چلی جاتی۔ وہ اس حساب کتاب میں رہتی کہ چھٹی آنکھوں والی، سنہرے بالوں والی، گلگالی رنگت والی لڑکی نے جو پر پل سی، ذرا سی ہلکی اور بے بی پینک سے ذرا سی گہری لب اسٹک یا لب گلوڑ لگایا ہے وہ اس کے پاس ہے نا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے وہ بتاتی جاتی۔

”یہ جو نیلے اسکرٹ میں لڑکی گزری ہے نا، ہاں۔۔۔ وہ، وہ۔۔۔ اس نے جو لب اسٹک لگائی ہے، وہ میرے پاس ہے۔۔۔ اور وہ جو موٹی عورت نے لگائی تھی، وہ نہیں ہے۔“ اکثر وہ ان کے پاس چلی جاتی۔ پین سے ہاتھ پر براؤن اور لب اسٹک کا نمبر لھتی اور ”تھینک یو“ کہہ کر پلٹ آتی۔

اس کے وارڈ روب میں اتنے کپڑے اور جوڑے نہیں تھے، جتنے لب اسٹک اور لب گلوڑ کے بکس تھے۔ افق میک اپ نام کی چیز سے واقف نہیں تھی۔ نہ ہی اسے شوق تھا۔ لیکن نعل کے کہنے پر اس نے میک اپ کی کچھ چیزیں لے لیں۔ اس نے سوچا کہ وہ میک اپ کر کے فرزام کو حیران کر دے گی۔ اسے بھی معلوم ہو کہ وہ اس کے لیے کیا کچھ کر سکتی ہے۔

اسی دن شام کو وہ کاؤچ پر دراز ایک پرانی فلم دیکھ رہی تھی۔ قریب ہی جائے کا پڑا لگا رکھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک وہ نعل کے ساتھ خریدا ہوا میک اپ کا سامان لگا لگا کر دیکھ رہی تھی۔ اسے سب اچھا ہی لگا۔ ابھی اسے میک اپ کرنا نہیں آتا تھا۔ لیکن اگر وہ روز ہلکا سا کر لیا کرے تو فرزام کے آنے تک سلیقے سے کرنا آ ہی جائے گا۔

جائے بیٹے، فلم دیکھتے اس نے آج خرید کر لائے میگزینز میں سے ایک کو میز پر سے اٹھالیا۔ یہ مقامی سطح پر شائع ہونے والا اردو میگزین تھا۔ نہ اسے فلم میں دلچسپی تھی، نہ ہی فی الحال میگزین میں۔ اسے فرزام کے فون کا انتظار تھا۔ اس نے فون کیا تو اس نے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ ”ابھی کرتا ہوں“ اور پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اس کا ابھی چل رہا تھا۔

میگزین کی ورق گردانی کرتے اس کا ہاتھ ایک صفحے پر آ کر ساکت ہو گیا۔ ٹی وی اسکرین پر ہیر وڈن رو رہی تھی، چلا رہی تھی۔ لیکن اسے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اندھیرے کا ایک گہرا سیلاب اس کی آنکھوں میں سے ہو کر گزر رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک بل کے لیے تڑپ کر مر گئی۔ مثلی اور سانس اکھڑنے کا شدید احساس ہوا۔ وہ واش روم کی طرف بھاگی اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ منہ صاف کرتی وہ دوبارہ لاؤنج کی طرف آئی تو اس میگزین کو گھورنے لگی جو اس کے اس طرح اٹھ کر جانے

پر کاؤچ سے نیچے گر گیا تھا۔

اس میگزین میں عدن تھا۔ اس شخص پر نظر پڑتے ہی نفرت سے ہی سہی، اس کی سانس اکھڑنے لگیں۔ وہ پلٹ کر وہی افق بن گئی، جو ڈی ایچ اے سے غلام علی غلام کے ہاتھوں سے اپنی عزت بچا کر نکلی تھی۔ جس کے گلے میں چادر جھول گئی تھی اور جو سڑک پر جائے پناہ کے لیے بھاگی پھر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس شخص سے آئندہ اگر کبھی ملی تو وہ اس پر تھوک دے گی۔ لیکن اب وہ کانپ رہی تھی۔ یہ اس کا وہ ماضی تھا جس پر وہ بہت پشیمان تھی۔ تھوڑی دیر وہ ایسے ہی کھڑی کارپٹ پر گرے عدن کو دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر میگزین کو اٹھا لیا۔

”ایم بی بی ایس ڈائریکٹر عدن غلام علی (پاکستان)“ اس تعارفی سطر کے نیچے مختصر اس کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ درج تھا۔ یہ ایک آرٹیکل تھا جسے ایک مقامی مسلمان صحافی نے شائع کیا تھا۔ یہ ان لوگوں کے بارے میں تھا جنہیں بے گناہ یا بے حد معمولی الزامات لگا کر سالوں سے جیلوں میں قید کر رکھا تھا۔ ان بردہشت گردی کا شبہ کیا گیا تھا اور سالوں سے وہ شیعہ تو تصدیق میں بدل رہا تھا اور نہ ہی مخالفت میں۔ آرٹیکل میں کل بیس اے لوگوں کا ذکر مکمل تعارف اور تفصیل کے ساتھ کیا گیا تھا۔ باقی اعداد و شمار الگ سے تھے۔ افق نے آرٹیکل کو ایک بار پڑھا اور عدن کے ساتھ ہوئے واقعے کو تین بار۔

جب وہ بار بار اس کے ساتھ پیش آئے واقعے کو پڑھ رہی تھی تو شاید انجانے میں وہ اس کے باپ کے ہاتھوں ہوئی اپنی بے عزتی کا بدلہ لے رہی تھی۔ لیکن صرف ایسا بھی نہیں تھا۔ حیرت اور افسوس کی ایک تیز دھار اس کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ ایک دم ایک ایسی کوری تختی بن گئی جس پر ”عدن“ ہی ڈوب ابھر رہا تھا۔

ڈورنیل بہت زور و شور سے بجنے لگی۔ اس بار وہ آواز پر چوکی۔
”تم ٹھیک تو ہوا فقی؟“ نمل نے چھوٹے ہی پوچھا تو وہ اور گھبرا گئی کہ اس نے یہی کیوں پوچھا۔
”فرزام کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا تم دونوں میں سے کوئی بھی فون نہیں اٹھا رہیں۔ وہ کب سے فون کر رہا ہے۔“

”میں واش روم میں تھی۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ لاؤنج کی طرف واپس آتے وہ اور پریشان ہو گئی۔ اسے قریب ہی رکھے موبائل کے چھ بار بجنے پر بھی پتا ہی نہ چلا۔ آخر کیوں؟ کس کے لیے؟
فرزام کو فون کیا۔ واش روم کا بتایا۔ وہ بات اس سے کر رہی تھی۔ دیکھ میگزین کو رہی تھی۔
”تھک گئی ہوا فقی؟“

”نہیں تو۔“ جواب کے درمیان ذرا سا وقفہ آیا۔
”تم آرام کرو۔۔۔ پھر بات ہوگی۔“ وہ ناراض نہیں ہوا تھا۔ اس کی غائب دماغی پر خود ہی یقین کر لیا کہ وہ تھک گئی ہوگی۔

وہ انٹری اور لیپ ٹاپ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ عدن کی تفصیل میں اس کے وکیل کا ذکر بھی تھا اور بیان بھی۔ سرچ انجن سے اس نے بوٹن کے وکیل عبدالعزیز کو ڈھونڈ لیا۔
افق کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے عدن سے متعلق اس آرٹیکل کو کیوں پڑھا۔ فرزام کی کالز کو کیسے مس

کر دیا اور اب اس کے وکیل کو کیوں ڈھونڈا۔ افسوس کی لہر جو اس کے اندر سے اٹھی تھی سب سی کے زیر اثر کیا۔ ایسا تو تھا ہی نہیں کہ وہ عدن کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسلام آبادی۔ ایم۔ ایچ کے باغ میں بیٹھ کر اس نے دعا کی تھی کہ زندگی میں یہ شخص ایک بار تو ضرور اسے ملے۔ بے شک افق کے ہاتھ میں کشتول ہو اور عدن کے ہاتھ میں خیرات۔

وہ اس شخص سے ضرور پوچھے گی کہ عزت سے چھوڑ دینے کے لیے تو اس نے خود کہہ دیا تھا۔ اسے دھوکا دے کر بھاگنے کی ضرورت کیا تھی؟
وکیل عبدالعزیز کا نمبر ملا یا۔

”محبت ماریہ سے کرتا تھا۔ شادی بھی اسی سے کی۔ دھوکے کے لیے افق ہی کیوں؟“ بیل جاری تھی۔

”اگر وہ کبھی افق کی زندگی میں نہ آتا تو وہ اس کے گدھے باپ کے سامنے نہ جاتی۔“

”لایئیر عبدالعزیز اسپیکنگ۔۔۔ واٹ کین آئی ہیلپ یو؟“

”ڈاکٹر عدن غلام علی کے وکیل آپ ہیں؟“

”لیس!“

”کیا وہ واقعی بے گناہ ہے؟“

”پہلے اپنا تعارف کروائیں لیڈی!“

”کیا وہ دہشت گرد ہے؟“

”آپ کا نام لیڈی۔۔۔؟“

”کتنی سزا ہوگی۔۔۔؟ رہا ہوگا بھی کہ نہیں۔۔۔؟ کیا وہ سچ دہشت گرد ہے؟“

”آر یو مس افق۔۔۔؟“

”مس افق۔۔۔ مس افق۔۔۔ مس افق۔۔۔!“

فرزام کے فلیٹ میں اس فقرے کی بازگشت کو غنچے لگی۔ فون افق کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ وہ اسے کیسے جانتا تھا۔۔۔ سات سمندر پار۔۔۔ ایک انجانا شخص۔ جس سے آج اس کی پہلی بار بات ہو رہی تھی۔ وہ اس کا نام لے رہا تھا۔

”آر یو دیر مس افق۔۔۔؟“ وہ یقین ہی کر بیٹھا تھا کہ وہ افق ہی ہے۔

خاموشی کا وقفہ جاری رہا۔

”آر یو اوکے۔۔۔؟“

آخر کار اس نے مری مری آواز میں ”لیس“ کہا۔ ”آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“

”تو آپ مس افق ہی ہیں۔۔۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ پچھلے چار سالوں سے میں نے ایک ہی نام لاکھوں بار سنا ہے۔ افق۔۔۔ افق۔۔۔ افق۔۔۔ اسے کہو، میرے لیے دعا کرے۔۔۔ مجھے آزاد کروالے۔۔۔ افق ملی؟ کہاں ہے وہ۔۔۔؟“

فون اس کے ہاتھ سے گر گیا اور اس کی بیئری الگ ہو گئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنی چیخ کو

روکنا چاہا۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ عدن تو دھوکے باز ہے۔ اسے تو اس پر تھوکتا ہے۔۔۔ اس کا گریبان پکڑنا ہے۔۔۔ پھر۔۔۔ یہ سب۔۔۔ اتنے سال وہ اسے یاد کرتا رہا ہے۔ اس کا نام لیتا رہا ہے۔

منہ پر ہاتھ رکھے وہ بیٹھی رہی۔۔۔ ذرا دیر بعد اس پاس ایسے دیکھنے لگی جیسے پینا ٹوٹ گیا ہو۔۔۔ یا اپنے میں ہوا در بلک بلک کر التجا کر رہی ہو کہ یہ خواب ہی ہوا اور بس۔۔۔

”اوخدایا!“ اس نے سر کو تھام لیا۔ آنسو آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ اب یہ آنسو کس احساس کے تحت تھے۔ افق اس کا فیصلہ ابھی نہیں کر سکتی تھی۔ بہت دیر تک وہ ایسے ہی بیٹھی رہی۔ فون کی بیٹری اس میں واپس ڈال کر فون آن کیا۔ عبدالعزیز کا ایک میسج موجود تھا۔

”میرے آفس میں آکر ملیں۔“ ساتھ ہی آفس کا پتا بھی لکھا تھا۔ اس نے افق کو آفس میں آنے کے لیے کیوں کہا اور وہ کیوں جائے؟ کس لیے؟ وہ نہیں جائے گی۔۔۔ اسے نہیں جانا چاہیے۔۔۔ وہ کیوں نہ جائے؟ اسے کیوں نہیں جانا چاہیے؟

سوالات آگے پیچھے اس کے اندر باہر بن رہے تھے۔

نبلا کر تاجیخ اور جو گرز پہن کر بیک کو کندھے پر لٹکا کر وہ دروازے کو لاگ کر نیچے آ گئی۔

افق نے عدن کا اعتبار کیا تھا۔ اس کی مدد لینے ڈی ایچ اے اس کے باپ کے پاس پہنچی تھی۔ یہ دو بڑی غلطیاں تھیں۔ لیکن اس بار وہ ایک فاش غلطی کرنے جا رہی تھی۔



”مجھے صرف تجسس تھا۔ میں اس لیے یہاں آئی ہوں۔“ وہ آتو گئی تھی۔ مگر اب پچھتا رہی تھی۔ وہ ایک اچھی بھلی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی بلا سے عدن دہشت گرد رہی سی۔

”آپ صرف تجسس مٹانے کے لیے آئی ہیں؟“ ایک کہنہ مشق وکیل نے اس کی بودی دلیل کو مزے سے ایک طرف کر دیا۔

”یہ سچ ہے۔“ وہ اس کا طنز سمجھ گئی۔

”سچ کے بارے میں آپ بھی جانتی ہیں۔۔۔ لیکن کیا آپ عدن کی مدد نہیں کریں گی؟“

”میں۔۔۔؟“ اس لفظ مدد کا تو اسے گمان بھی نہیں تھا کہ اسے کہا جائے گا اور اس سے یہ سوال پوچھا جائے گا۔

”آپ پہلی خاتون ہیں۔ دراصل کوئی پہلا انسان ہے، جو اس کیس کے سلسلے میں میرے پاس آیا ہے۔“

”ان کی دانف۔۔۔؟“

”ان دونوں کی علیحدگی ہو چکی ہے۔“

”عدن کا خاندان؟“ وہ لفظ فادر استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”وہ یہاں نہیں آ سکتے۔ اس کے فادر نے کوشش کی تھی۔ انہیں ویزا ہی نہیں دیا گیا۔“

فادر کے نام پر ایک آسانی بجلی اس میں سے ہو کر گزری۔

”میری جب بھی اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔ ”کیا افق ملی۔۔۔؟“ کہاں چلی گی وہ؟“ مس افق! اسے آپ پر بہت یقین ہے کہ آپ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ آپ دوست ہیں اس کی۔“

افق نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ خاموش سا ہو گیا۔

”میں نے بہت سی این۔ جی۔ اوز اور قانونی اداروں کو خطوط لکھے ہیں۔ لیکن کسی کی طرف سے کوئی تعاون نہیں ملا۔ اس کا کیس اتنی سست روی کا شکار ہے کہ اگر فیصلہ اس کے حق میں ہو بھی گیا تو سالوں لگ جائیں گے۔ آپ عدل کی مدد کریں گی مس افق؟“

پھر وہی سوال۔ افق بڑی طرح سے چڑھ گئی۔ ”میں کیوں۔۔۔؟“

”آپ اس کی مدد نہیں کرنا چاہتیں۔۔۔؟“ اس نے آرنیکل پڑھتے ہی وکیل کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس کے پرنسٹن نمبر پروفن کیا تھا۔ اس کے آفس آگئی تھی اور اب مدد کے نام پر اتنا چڑھی تھی ”ہاں، نہ“ نہیں کر رہی تھی۔

”جس نفسیاتی کیفیت سے وہ گزر رہا ہے اسے یقین ہے کہ صرف آپ ہی اسے آزاد کروا سکتی ہیں۔ آپ اس کی امید ہیں۔ اس کا یقین ہیں۔ اس کا ماننا ہے کہ آپ سب کچھ کر سکتی ہیں۔“

”غلط ماننا ہے۔“ افق کی آواز تیز ہوئی۔

”اس نے کہا۔ آپ اس کے لیے دعا کریں گی۔“

”اللہ ہر بے گناہ پر رحم کرے۔“

”اس سے چھوٹی سی غلطی ضرور ہوئی ہے۔ لیکن وہ دہشت گرد نہیں ہے۔“

”اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“

”جو جانتا ہے، اسے بتانے کے لیے وہ خود زمین پر نہیں آتا۔ بندوں کو ہی سچ اور جھوٹ ثابت کرنے کی کوششیں کرنی ہوتی ہیں۔“

”تو پھر یہ آپ کا کام ہے۔“ مطلب افق نے انکار کر دیا۔

”آپ کس کام سے میرے پاس آئی ہیں؟“ بہت غل سے پوچھا گیا۔

وہ دونوں اس کے آفس میں ایک طرف رکھے صوفوں پر آنے سے سامنے بیٹھے تھے۔

”ایسے ہی۔“ وہ آکر دوہاں بیٹھ کر، یہ سوال سن کر پھر پشیمان ہوئی۔

”ایسے ہی۔؟“ اصرار سے پوچھا گیا کہ ثبوت دو کہ یہ ایسے ہی ہے۔

اس سوال اور انداز پر افق نے کوئی اور رد عمل نہیں دکھایا۔ وہ اٹھ کر جانے ہی والی تھی۔

”آپ دونوں پاکستانی ہیں، مسلم ہیں۔ وہ آپ کو جانتا ہے تو آپ بھی اسے جانتی ہوں گی۔ پاکستانی کیونٹی میں سے کوئی اس کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا۔ آپ لوگوں میں مدد کرنے کا جذبہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ میرے پاس ایسے تین اور کیسز تھے۔ وقفے وقفے سے تینوں ختم ہو گئے۔ کیونٹی نے، این جی اوز نے اس کی بہت مدد کی۔ کچھ اور بڑے نام سامنے آئے۔ دو کا تعلق تھائی لینڈ سے تھا، ایک کا سریبا سے۔ کیا سب پاکستانی سوریہ ہیں؟ کیا سب مسلم سوریہ ہیں؟ کیا آپ دونوں میں اتنا سا تعلق بھی

نہیں ہے کہ آپ۔۔۔“

”میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ درمیان میں ہی بولی۔

”انسان تو ہیں آپ دونوں۔۔۔ تعلق نہیں ہے۔ انسانیت کا رشتہ تو ہے۔ پانچ سال سے وہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ دو بار خودکشی کی کوشش کی ہے۔ نفسیاتی دورے پڑتے ہیں اسے خودکودستی کر لیتا ہے۔ دیواروں سے سرگراتا ہے۔ چلاتا ہے۔ چند ہفتوں بعد زخمی ہو کر وہ اسپتال ضرور جاتا ہے اور اس پر بھی وہ جب مجھے ملتا ہے تو کیس کا نہیں، آپ کا پوچھتا ہے۔ وہ اس امان کے بارے میں بات کرتا ہے، جسے افق جانتی ہے۔ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں تو کریں۔ شاید تھوڑا ہی بہت ہو۔ اگر پاکستانی کمیونٹی کو اس بارے میں بتا سکتی ہیں تو بتائے۔ انہیں جگائیں۔ اس سانحے کو سب کی نظروں میں لائیں۔ انسانیت کے ناتے۔ رحم کے ناتے۔ چیریٹی ہی سمجھ کر۔ خدا کے لیے۔“

افق یہ سب ایسے سن رہی تھی۔ جیسے اپنی کسی بیماری کے بارے میں ہدایات سن رہی ہو۔ ایسی بیماری جس کا اسے علاج کروانا ہی نہیں۔ رات بھر وہ خواب میں ڈرتی رہی تھی۔ سالوں پہلے اس کی یہ حالت تب ہوئی تھی جب وہ عدن کے باپ کے ہاتھوں سے بچ نکلے تھی۔ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چیخیں ماریں اور دور سے سی کیفیت میں آگئی تھی۔ اماں، جمال، اسد، ہم کراٹھ بیٹھے۔ اماں اس کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگیں۔ جمال پانی کے لیے بھاگا۔ اسد ڈر کے مارے رونے لگا۔

وہ دورہ دھوکے اور بے عزتی کے نام پر پڑا تھا۔ اس کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے گھر میں ہاتھ روم میں جا کر اس نے اپنی چیخیں دہرائیں۔ رات گئے اس کی آنکھ لگی تو خواب میں وہ دھاڑیں مارتی رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اماں پسینے میں نہا گئیں۔ انکی انکی سانسیں لینے لگیں۔ افق نے باقی ماندہ چیخوں کا دم گھوٹ دیا۔ اس نے اپنی ماں کی حالت کو دیکھا اور لب ہی لیے ورنہ جس طرح اس کے باپ کے مرنے پر اس کی پھوپھی نے بین ڈالے تھے۔ ٹھیک اسی طرح وہ بھی بین ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کی اٹلی جسکی اس کی اماں کی جان لے لے لگی۔ اس دن کے بعد سے افق اپنے وجود میں قید ہو گئی۔ کیا اسے قید کی سزا نہیں ہوئی تھی تب۔۔۔؟

اس کا جرم محبت تھا اور سزا کے نام پر اسے بہت کچھ بھگتنا پڑا تھا۔۔۔ محبت کے نام پر اس نے بھیا ناک سزا کائی۔

”کیا آپ ہماری مدد کریں گی؟“ اس سے پھر پوچھا جا رہا تھا۔

وہ خود سے پوچھنے لگی کہ اسے اس کی مدد کیوں کرنی چاہیے۔ وہ اسے چھوڑ گیا۔ اسے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس کی مدد اس پر فرض نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی لاکھوں انسان اس کی طرح ہیں۔ ہر شخص اپنے نصیب کے مطابق ہی دکھ اٹھاتا ہے۔ جیسے وہ اپنے نصیب کے ٹھٹھے پھل اکیلے اکیلے کھاتا ہے۔ عدن نام کا باب اس نے اپنی زندگی سے پھاڑ پھینکا ہے۔ اب وہ اس شخص کا نام بھی کہیں شامل کرنا نہیں چاہتی۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ مجھے کوئی جواب نہیں دے رہیں۔ جس شخص نے سالوں آپ کا انتظار کیا۔ اسے یہ جان کر بہت مایوسی ہوگی۔“

”آپ اسے میرے بارے میں نہیں بتائیں گے۔“

”ظاہر ہے۔۔۔ میں ایک مایوس شخص کو اور مایوس کیوں کروں گا؟“
 افق وہاں سے اٹھ آئی اور بے مقصد سڑکوں پر چھل قدمی کرتی رہی۔ دوپہر کے کھانے کے لیے گئی
 اور آرڈر دے کر اٹھ گئی۔ وہ بیٹھنا چاہ رہی تھی، کھڑے ہونا چاہتا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ کام
 بیک وقت کر رہی تھی۔ بے مقصد ٹھومتے پھرتے وہ گھر آ گئی۔ صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ دن میں صرف
 جوس لے کر پیا تھا اور اب بھی کھانے کے بجائے وہ کاؤچ پر ڈھیر ہو گئی۔
 دماغ میں آٹھ سالوں کے خاکے پرزے پرزے ہو کر اڑ رہے تھے۔ جھپک جھپک سب آ جا رہا
 تھا۔ گھر کا لینڈ لائن فون بجنے لگا۔ دو گھنٹے سے وہ کاؤچ پر لیٹی تھی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ گھر کے اندر
 اندھیرا ہو رہا تھا۔ کوئی لائٹ بھی اس نے روشن نہیں کی تھی۔

”تمہارا فون کیوں بند ہے؟“

”اوہ! چارج نہیں کیا تھا۔“

”تم ٹھیک ہو؟“

”بالکل۔“

”کہاں تھیں تم؟“

”میں سو رہی تھی۔“

”سارا دن سوئی رہی ہو؟ اس سے پہلے کہاں تھیں؟“

”میں شاپنگ کرنے گئی تھی۔“

”کیوں گئیں؟“ فرزام کو غصہ آیا۔

”کیوں نہ جاتی؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تمہیں میسج بھی کیا تھا افق! تم کیوں گئیں؟“ اس کی جھنجھلائی آواز بلند ہوئی اور پھر وہ خاموش
 ہو گیا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ اب تو تم گھر میں ہی ہو۔ مکمل بھابھی کے پاس چلی جانا۔ فارغ ہو کر ان ہی کے
 پاس چلی جایا کرو۔ بور نہیں ہوگی۔“

”میں تیار ہو کر چلی جاتی ہوں۔“ اس نے پوچھا ہی نہیں کہ وہ اسے باہر جانے سے کیوں روک رہا

تھا۔

افق نے موبائل آن کیا۔ وکیل کے آفس میں جانے سے پہلے اس نے خود ہی اسے بند کر دیا تھا
 تاکہ پاکستان سے یا فرزام کی کال نہ آ جائے اور اس کے منہ سے نقل جائے کہ وہ کہاں آئی ہے اور کس
 کے پاس۔۔۔ اور کیوں ہے۔

”رات میں نیند نہیں ڈر گیا۔ خواب تھا شاید۔ خواب مجھے یاد نہیں۔ لیکن اس خواب اور ڈر کا تعلق تم
 سے تھا۔ میں نے خود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے والا ہو۔ میری تسلی کے لیے تم ذرا
 احتیاط سے رہنا۔ گھر سے تو باہر جانا ہی نہ۔ مکمل بھابھی کے چلی جانا بس۔“

فرزام کا میسج پڑھ کر کل سے اب تک اسے پہلی بار سکون کا سانس آئی۔ اپنے شوہر کے اتنے فکر مند
 ہونے پر اس کا دل بھر آیا۔ وہ اس میسج پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ دلوں میں سب سے پیارا دل فرزام کا تھا اور

اس دل کی مالک وہ تھی۔ اس نے عدن کے خوف سے بچنے کے لیے، اس کے لیے جوگ لے لینے کے ڈر سے فرزام سے شادی کی تھی۔۔۔ اور کون تھا جو فرزام کو پسند نہیں کرتا تھا اور وہ اسے سب سے زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس نے اس کا نفسیاتی علاج کیا تھا۔ اسے پراعتماد بنایا تھا۔ اسی نے اسے سکھایا تھا کہ لوگوں سے ڈرنا چھوڑ دے اور یونیورسٹی میں اس نے کسی بھی لڑکے سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اس سے باتیں کرنے آتے تھے اور وہ بڑے طریقے سے انہیں سیدھا راستہ دکھا دیتی تھی۔

فرزام اس کی ذہنی تعمیر میں حصہ دار تھا۔ وہ اس کے غریب ہونے، چھوٹے گھر کی ہونے پر اسے کچھ جتنا نہیں تھا۔ اس نے بھی بھول کر بھی عدن کا نام اس کے سامنے نہیں لیا تھا۔ دونوں کا بہت خاص قریبی رشتہ تھا اور دونوں ہی اس خاص رشتے کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے بہت خاص تھے۔

تیار ہو کر وہ نمل کے پاس آگئی، ڈنر اسی کے ساتھ کیا اور رات میں تین عدد نیند کی گولیاں کھا کر سو گئی۔

اگلی صبح عبدالعزیز کا میسج موجود تھا۔ وہ اسے دوبارہ ملنے کے لیے بلارہا تھا۔ افق نے میسج ڈیلیٹ کر دیا۔ آج اسے بہت سے کام تھے۔ اسے این جی او جانا تھا۔ انہیں اگلے ایونٹ کے لیے بریفنگ دی جانا تھی۔

دوسرے ہفتہ کا ایونٹ بھی شاندار رہا۔ اور مجموعی طور پر کافی منافع ہوا۔ اس کا اسکو اس بار بھی اچھا ہی تھا۔ سب کے لیے مشترکہ تالیاں بجوائی گئیں۔ فردا فردا ان کی تعریف کی گئی۔ مسٹر جین اس کے پاس بھی آئے۔ وہ پچاس پچپن سالہ چھٹ کے سفید فام امریکن تھے۔ سب سے ایسے باتیں کرتے جیسے وہ ان کے شاگرد اور سامنے والا ان کا استاد محترم ہے۔ اتنی عاجز کی گئی کہ سارا وجود ہی جھکا ہوا تھا۔ ہاتھوں پیروں کی انگلیاں بھی۔

”کیا آپ کو امریکی جیلوں کے بارے میں معلوم ہے کہ وہاں کتنے بے گناہ لوگ قید ہیں؟“
وہ اس کی تعریف کر رہے تھے اور وہ اچانک سے ہی ان سے یہ سوال کر بیٹھی۔ مسٹر جین کی آنکھوں کا رنگ بدلا جیسے وہ جانتے تھے کہ یہ صرف ایک سوال نہیں ہوتا۔ مختلف ملکوں کے دوروں کے دوران ان سے ایسے سوال پوچھ ہی لیے جاتے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ خود ایک امریکی ہیں اور کسی بھی گورے کو دیکھ کر انہیں لگتا ہے کہ یہ بھی گوانتانامو بے کے خالموں میں سے ایک ہے۔ اگر نہیں ہے تو اس ڈھانچے کا حصہ تو ضرور ہی ہے اور اگر یہ بھی نہیں تو چلو، وہ امریکی تو ہے نا جو اپنے علاوہ ہر مذہب اور قوم سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن وہ ایک ایسی این جی او کے فعال کارکن تھے، جو تھر ڈورلڈ کے لیے کام کرتی ہے۔ وہ صرف انسانیت کے لیے کام کرتے تھے اور اس میں ان کا کوئی ذاتی فائدہ شامل نہیں تھا۔

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ وہ گڑبڑا گئے اور مزید بحث سے بچنا چاہا۔

”آپ کی این جی او کو اس کے لیے بھی کام کرنا چاہیے۔“

”بہت سے امریکن بھی ان حالات کا شکار ہیں اور ایسے ہی جیلوں میں قید ہیں۔“ وہ دراصل یہ ایک نکتہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ صرف مسلمان ہی اس سب کا عتاب نہیں بنتے۔

”پھر آپ کو ان سب کے لیے کام کرنا چاہیے۔“

”بہت سے دوسرے ادارے اس پر کام کر رہے ہیں۔ ہم ان مسائل پر کام نہیں کرتے۔ ہماری این جی او کا یہ منشور نہیں ہے۔“

”میں آپ کے لیے اتنی محنت کر رہی ہوں مسٹر جین! آپ کو بھی ہمارے لیے کچھ کرنا چاہیے۔“
افق نے سنا یہ نہیں کہ مسٹر جین نے کیا وضاحت دی۔ دوسرے لوگوں کی طرح اس کا بھی یہی ماننا تھا کہ امریکی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ بتائی بھی اور آباد کاری بھی۔
”آپ کے لیے کیا؟“ اس بات پر وہ اور الجھ گئے۔

افق کا مسٹر جین کو روک کر یہ سب کہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن جب وہ اس کے پاس آئے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تھوڑا سا غصہ آ گیا۔ اسے آرٹیکل میں موجود باقی لوگوں اور دوسرے اعداد و شمار کا خیال بھی آیا اسے ایک دم سے یہ لگا کہ اپنے کام کے لیے تو یہ امریکی اس سے کام لے رہے ہیں تو اس کے کام کے لیے کیا یہ آگے آئیں گے؟ یہ سب سوچتے وہ یہ بھول رہی تھی کہ تھروڈورلڈ میں پاکستان بھی شامل ہے اور پاکستان کی دیہی علاقوں میں اسی این جی او کے کارکن ویکسین کی سپلائی کے لیے پہنچتے ہیں۔ مختلف انجیشن اور ڈراپس ان ہی کی طرف سے جاتے ہیں۔

اس نے انہیں ڈاکٹر عدن کے بارے میں بتایا۔ وہ خاموشی سے سب سنتے رہے۔ دو دن بعد انہوں نے افق کو این جی او کے لیے اپنے رضا کار صحافی سے ملوایا۔ صحافی کا تعلق ایک بڑے میڈیا گروپ سے تھا اور وہ اس گروپ کے اخبار، میگزین اور ٹی وی کے لیے کام کرتا تھا۔ صحافی کی ملاقات اس نے عبدالعزیز سے کروادی۔ وہ اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی اور اگر وہ اس معاملے میں تھوڑا بہت شامل ہوئی مگر کئی تھی تو آگے نہیں آنا چاہتی تھی۔ اس نے عبدالعزیز سے وعدہ لیا تھا کہ اس کا نام اور شناخت سامنے نہیں آئے گی۔ خاص طور پر عدن کو اس بارے میں بالکل خبر نہیں ہوئی چاہیے۔ عبدالعزیز کو خیال تھا کہ صحافی ان کی بہت مدد کر سکتا تھا اور وہ اس صحافی سے مل کر حقیقتاً بہت خوش ہوا تھا۔ چند ہی ہفتوں بعد مسٹر جین نے افق کو چند دوسری این جی او کی طرف بھیج دیا شاید انہیں افق کا کیا گیا طرز بہت برا لگتا تھا۔ وہ بار بار بہت عجز کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ وہ جو کچھ کر سکتے ہیں، ضرور کریں گے۔ افق نے نہ چاہتے ہوئے بھی این جی او کی طرف سے نمائندوں سے پھر بات چیت کی۔

مسٹر جین کے ساتھ کی گئی حادثاتی بات چیت کافی کارگر ثابت ہو رہی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے، نہ نہ کرتے بھی افق اس سب میں اتنی شامل ہو گئی۔ این جی او کے نمائندوں نے وکیل سے ملاقات کی۔ اس سے کیس ہسٹری لی۔

”آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے۔“ عبدالعزیز کا اسے مسیج آیا۔ اس کا منہ بن گیا پڑھ کر۔ اسے یہ تعریف اچھی نہیں لگی۔ کاش! وہ کبھی آفس گئی ہی نہ ہوئی اور نہیں تو اس نے وہ رسالہ ہی نہ خریدا ہوتا۔

عبدالعزیز کی براہ راست بات چیت این جی او سے ہونے لگی۔ اس نے عبدالعزیز سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس نے جتنے ریفرنس دینے تھے، وہ دے چکی۔ اب اسے پریشان نہ کیا جائے۔

آئندہ آنے والے چند اور ہفتوں میں ایک اور کام ہوا۔ صحافی اسکاٹ جو اس سارے معاملے کے لیے مواد اکٹھا کر رہا تھا۔ اس نے دو سینئرز اور ایک قانون دان کے سامنے ایک لائیو ٹاک شو کے دوران

اس مسئلے کو اٹھایا۔ عبدالعزیز کی طرح ایسے ہی کیمز کو ہینڈل کرنے والے دوسرے وکلا اور متاثرین کے خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔ چند ڈاکو منٹریز چلائی گئیں۔ صرف شبہ پر قید مجرموں کی بابت طرح طرح کے سوالات کیے گئے۔ ایسے شوز وہاں آئے دن ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی نظروں سے ایسے واقعات چھپے ہوئے ہیں، کم از کم اس طرح ان کے کانوں تک یہ خبر ضرور پہنچ جاتی ہے۔ اسکاٹ نے اسی مسئلے پر ایک فچر لکھا اور اس نے براہ راست حکومتی اداروں پر تنقید کی۔ چند اخبارات نے نئے سرے سے عدن اور اس جیسے کیمز کے بارے میں خبروں کو نمایاں جگہ دی۔ سالوں سے قیدان مظلوموں پر لوگوں کو بہت ترس آیا۔ یہ ان جیلوں میں بند کسی اور کے لیے وسیلہ بن رہا تھا یا صرف عدن کے لیے، یہ قدرت ہی بہتر جانتی تھی۔ لیکن اس تھوڑی سی حرکت سے شاید کسی کو بہت فائدہ ہونے والا تھا۔

این جی اڈا کا ایک نمائندہ جا کر عدن سے جیل میں ملا۔ اسی این جی اڈے نے مختلف کمیونٹیز کے لوگوں کو اکٹھا کرواک کا اہتمام کیا۔ افق کو بھی بلایا گیا۔ لیکن افق نہیں گئی۔ اب تو اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اگر ایسے کیمز جل ہو جائیں تو منظر عام پر اسے لایا جائے کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔۔۔ اور نہیں تو کوئی صحافی اسی کے پاس نہ آجائے، انٹرویو لینے، سڑک پر چلنے آکر کوئی اسے ایسے ہی دیکھ لیتا تو اسے یقین ہوتا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ ”اچھا! وہ تم ہو جو عدن کے لیے اتنا سب کر رہی ہو؟ کون ہے عدن تمہارا؟“

”نہیں! میں نے کچھ نہیں کیا۔ اگر کیا تو ترس کھا کر انسانیت کے ناتے۔“

پھر اسے جانے کیوں کھوکھلے قہقہے بلند ہوتے سنائی دیے۔ بہت دن گزرے اسے عبدالعزیز کا فون آیا۔

”عدن ٹھیک ہی کہتا تھا کہ افق ہی اسے آزاد کروا سکتی ہے۔“ وہ شاید اس کے تعاون کا اپنے الفاظ میں شکریہ ادا کر رہا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ تقریباً جلا اٹھی۔

”آئی ایم سوری۔ آپ ناراض مت ہوں۔“ عبدالعزیز گھبرا گیا۔ افق شرمندہ ہوئی۔

”میں ناراض نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔ میں نے صرف آپ کے کہنے پر چند

این جی اڈا کو اس مسئلے کے بارے میں بتایا تھا۔ جو کچھ کیا ہے وہ آپ نے اور ان لوگوں نے کیا ہے۔ آپ پلیز! مجھے کریڈٹ نہ دیں۔ نہ ہی آپ میرا نام سامنے لائیں گے۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ میرا نام ظاہر نہیں کریں گے۔“

”میں اپنے وعدے پر قائم ہوں مس افق! آپ مجھے وعدہ خلاف نہیں پائیں گی۔ چند اخبارات میرا انٹرویو لے چکے ہیں۔ عدن کے فادر سے میں نے فنڈز منگوائے ہیں۔ یہی صحیح موقع ہے کہ ان این جی اڈا کو فنڈز دیے جائیں۔ اس سے خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ چند پاکستانیوں نے رابطے کیے ہیں مجھ سے۔ وہ ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔“

”آپ مجھے دوبارہ فون نہیں کریں گے۔“ اس نے ساری تمیز تہذیب ایک طرف رکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

عبدالعزیز نے اپنا وعدہ پورا کیا اور دوبارہ فون نہیں کیا۔ ویک اپ کال دی جا چکی تھی۔ عدن جیسے چندرہ اور لوگوں کے کیمرز نکل آئے تھے۔ سوشل میڈیا ان کیمرز کے لیے زیادہ فعال تھا۔ باقاعدہ احتجاج کیے جا رہے تھے۔ آئے دن نئی نئی خبریں سامنے آتی تھیں۔ ان کے خاندان کے لوگوں کے بیانات سامنے آتے تھے۔ ستر ففاری سے عدالت میں چلنے والے ان کیمرز نے کچھ رفتار پکڑ لی۔



این جی او سے کیا گیا فنڈ ریزنگ کا معاہدہ مکمل ہوا اور اسے بہترین کارکردگی اور این جی او کارکن بننے پر سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ جسے اس نے فریم کر دیا اور ایک پر سجایا۔

فرزام نے ہفتہ بھر پہلے کالج میں اس کا آن لائن ایڈمیشن کر دیا تھا۔ اس نے چھ ماہ کے ڈیزائننگ کورس کے لیے کالج جوائن کر لیا تھا۔ فرزام کے آنے تک اسے فارغ نہیں رہتا تھا۔ صبح سے دوپہر تک وہ کالج ہی میں ہوتی۔ وہاں سے اکثر اسٹور چلی جاتی۔ ایک پاکستانی اسٹور پر انہیں ایک سائیڈ کارنر مل گیا تھا۔ ”چز کالیں اس کارنر پر لگا دیا گیا۔ اس نے کارنر کی سیٹنگ کر لی۔ دو دن بعد وہ وہاں اک چکر لگاتی تھی۔ رات کو وہ اپنے کالج کے اسائنمنٹ پر کام کرتی۔ ہلکی پھلکی مصروف زندگی جاری تھی۔ سب ٹھیک ہی تھا۔

اس کے پاس عبدالعزیز کا میسج آیا کہ وہ اسے ایک ضروری بات بتانا چاہتا ہے۔ افق کو یقین تھا کہ وہ اسے یہی بتائے گا کہ عدن کا کیس ختم ہو گیا ہے۔ اسے اس خبر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ کیس ختم ہوتا ہے یا وہ چند سال اور جیل میں رہتا ہے۔

عدن کے بارے میں پڑھتے اور جانتے ہی وہ تھوڑی جذباتی ہو گئی تھی۔ لیکن اب وہ مضبوط تھی۔ اس کے اعصاب قابو میں تھے۔ عدن کتنا بھی بے گناہ تھا۔ لیکن اس کے لیے وہ دھوکے بازی ہی تھا اتنے سال اگر وہ اسے یاد کرتا رہا ہے تو ”شاید ڈوبے کو تنکے کا سہارا“ کے مصداق وہ افق کا سہارا لیتا رہا ہے۔ ماضی میں وہ اسے دعاؤں کے لیے کہتا رہا تھا اور اس کا عقیدہ بن چکا تھا کہ صرف افق کی ہی دعا قبول ہوتی ہے اور ضرور ہی قبول ہوتی ہے۔ اس طرح کی قید میں رہ کر کوئی بھی ایسے سہارے ڈھونڈ سکتا ہے۔ ایسے وقتوں میں ایسے افراد کو پھر ماضی ہی یاد آتا ہے۔ پھر وہ ان ہی لوگوں کو یاد کرتے ہیں جو اچھے تھے، مخلص تھے۔ ایسے افراد کو دھوکا دیا جاسکتا ہے، بھلا یا نہیں جاسکتا۔ وقت کا دھار ابد لے لے ہی ایسے مخلص لوگ نثر کر سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ افق نے اس سب پر بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ عدن کے ساتھ جو ہوا وہ افق کے ساتھ برا کرنے کی سزا ہے۔ افق اتنے پیارے دل کی تھی کہ اس نے یہ سوچا ہی نہیں۔ صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے سے اس شخص کی سب باقیات نکال پھینک رہی تھی۔

”عدن آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“ عزیز کی آواز گونجی۔ فون پھسل کر اس کی گود میں آگرا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے خود ہی فون کر لیا۔

”کیسے؟ آپ نے اپنا وعدہ توڑا؟“

”این جی او کا جو نمائندہ اس سے جیل ملنے گیا تھا۔ اسی نے ذکر کیا آپ کا۔ اس بار میری اس سے

ملاقات ہوئی تو وہ آپ کا بہت شدت سے پوچھ رہا تھا۔ میں خاموش ہی رہا اور لاعلمی ظاہر کی۔ لیکن کیا آپ اس سے ملنا چاہیں گی؟“

”ہرگز نہیں۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”اوکے! میں نے آپ کو مطلع کر دیا ہے اس بارے میں۔“ جواب دیے بنا اس نے فون بند کر دیا۔ بے چینی گھبراہٹ میں بدل گئی۔ اس شخص کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ یہاں ہے۔ اس کے لیے یہ سب اتفاق نے کیا۔ اتفاق جو یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ وہ اسے اب دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ اب وہ شخص اس سے ملنا چاہتا ہے۔ بہت کوشش کی اس نے کہ اسائنمنٹ پر کام کرے لیکن نہیں کر سکی۔ فرزام رات دن کر کے تھک جاتا تھا۔ وہ سو رہا ہوگا، ورنہ وہ اسے فون کر لیتی۔ اگر وہ سونہ رہا ہوتا اس وقت آن لائن ہی ہوتا۔ اٹھ کر وہ نمل کے پاس آگئی۔ وہ ایک انگلش فلم دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ نمل نے قریب رکھی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

”کچھ اور لاؤں؟“

”نہیں۔“ کہہ کر اس نے پڑا کا ایک ٹیس اٹھالیا۔

”پریشان ہو؟“ فلم کی ہیروئن کی اپ اسٹک پر نظر رکھ کر نمل نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”فرزام کو یاد کر رہی ہو؟“ اس سوال پر وہ صرف مسکرا دی۔

”فرزام سے کہو، ایک چکر لگا جائے۔ اتنا مصروف ہے کیا وہ؟“ نمل کی نظریں اب بھی اسکرین پر جمی تھیں۔

”بہت مصروف ہیں۔ ویک اینڈز میں بھی کام کر رہے ہیں۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔ جلد ہی فارغ ہو کر آجائے گا۔“

یہ تو فرزام بھی اس سے کہتا تھا کہ رات دن دس لوگوں کی ٹیم کام کر رہی ہے۔ چھ مہینے کے اندر اندر کام کو مکمل کرنا ہے۔ اس کے بعد وہ سو ف ویر میں تکنیکی خرابیاں جانچیں گے۔ پھر اسے اٹلانی کیا جائے گا۔ مارکیٹ میں لایا جائے گا۔ اب جب وہ اس سے آن لائن باتیں کرتا تو چھوٹے چھوٹے جملے بنا چھپکے کہہ دیتا۔ وہ اسے بہت یاد آتی ہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور کبھی کبھی اتنا کہ وہ کمانڈز لکھنے کے بجائے اس کا نام لکھ دیتا ہے۔ اب وہ اسے یاد کرتے ہوئے سوتا ہے اور یاد کرتے ہوئے اٹھتا ہے۔ مزید اسے دو عدد پرچا نہیں کیے کیونکہ اسے پرواز کر کے وہ اس کے پاس آجایا کرے۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ کمپنی کے ساتھ معاہدہ چرا کر پھاڑ کر پھینک دے۔ ایک دن وہ لیپ ٹاپ پر ذرا آگے جھکا اور دو انگلیاں اسکرین پر رکھیں۔

”میں تمہاری ناک کو پکڑ کر اسے ایسے کرنا چاہتا ہوں۔“ انگلیاں دائیں بائیں ہوتیں۔ ”اور پھر تمہاری ٹھوڑی کو ایسے پکڑ کر چہرے کو اوپر اٹھانا چاہتا ہوں۔“ ساتھ ہی ٹٹو سے لیپ ٹاپ کی اسکرین صاف کی۔

”سب گلابی گلابی کیوں ہو رہا ہے۔“

وہ ہنسی اور گلہابی ہو گئی۔

”تم بہت خوب صورت ہو۔“ ٹھہر کر سرگوشی کی۔

اس نے ادا سے ٹھوڑی کے نیچے بایاں ہاتھ نکالیا۔

”اور تمہاری آنکھیں جب ذرا سا جھک کر اٹھتی ہیں اور میری آنکھوں سے ملنا نہیں چاہتیں۔ آس پاس سے بچ کر نکل جاتیں ہیں تو کمال لگتی ہیں۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ باطل ایسے ہی۔“

ٹھوسے پھر اسکرین صاف ہونے لگی۔

باقی کا وقت وہ ان باتوں کو بار بار سوچ سوچ کر گلہابی ہوتی رہتی اور پھر اس کا جی چاہتا کہ فرزام ایسی ہی باتیں کرتا جائے بس۔ بلکہ وہ دونوں ہی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہیں۔ خوش ہونے کے سامان پیدا کرتے رہیں اور محبت کی طرف بڑھتے ہی جائیں۔ نمل کے ساتھ فلم دیکھتے دیکھتے وہ اونگھنے لگی تو اپنے گھر میں آ کر سو گئی۔ فرزام کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ ایسے ہی گہری نیند میں چلی جاتی۔ نعمت ہوتے ہیں وہ تعلق، وہ رشتے جو تھک تھک کر سلا دیتے ہیں۔ سکون کی نیند کا باعث بنتے ہیں۔ والدین کی آغوش میں بچے ایسے ہی جھٹ سے نہیں سو جاتے اور ایسے تعلق جو نیندیں چھین لیں۔۔۔؟



کالج میں اس کی دو تین اچھی دوستیں بن گئی تھیں۔ وہ انہی چیز کی کلیکشن دکھانے اسٹور بھی لے گئی۔ وہ سب اس بات پر کافی حیران ہوئیں کہ وہ پہلے سے ہی زندگی میں اتنی کامیاب ہے۔ اس کا میاں کی لیے اپنی نے کافی پاپڑ بیلے تھے اور کامیاب ہونے کے لیے پاپڑ بیلے لینے چاہئیں۔ محنت اور کام سے گھبرانا نہیں چاہیے۔

ان ہی دوستوں کے ساتھ وہ کبھی بکھار سیر کے لیے بھی چلی جاتی تھی۔ وہ لوگ اکٹھے خریداری بھی کر لیتے تھے، کافی پیتے تھے، آکس کریم کھاتے تھے، اسائنمنٹ میں ایک دوسرے کی مدد کرتے اور فون پر گپ شب لگا لیتے تھے۔

کالج سے نکل کر وہ سڑک پر آئی۔ اسے بس اسٹاپ تک پیدل جانا تھا۔ اسے ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی وہ آرام آرام سے چل رہی تھی۔ اکثر وہ راستے میں آنے والے ایک ہندوستانی ریسٹورنٹ سے لُنج کر لیا کرتی تھی۔ لیکن یہ اس کے مزاج اور بھوک پر تھا کہ وہ ریسٹورنٹ سے لُنج کر لے یا گھر جا کر نمل کے ساتھ۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک دم سے کسی نے پیچھے سے آ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے۔ اس نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ تیز تیز پیدل چلتے راہ گیر بھی رک کر اسے دیکھنے لگے۔

”یہ میں ہوں۔“ فرزام اس کے سامنے آیا۔ ریسٹورنٹ کا دروازہ کھولے ایک امریکی کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو ”سب ٹھیک ہے نا؟“

”سارے سر پرانز کا مزہ خراب کر دیا تم نے۔“ فرزام بری طرح سے شرمندہ ہوا۔ ”کالج سے آرہی ہو یا کوئی ہاررمووی دیکھ کر۔“

اس کے اوسان اور سانس بحال ہوئی جیسے ”اوہ! تو یہ تم ہو۔“ وہ اپنی جگہ پر بہت شرمندہ ہوئی۔ رات سے ہی ڈری ہوئی تھی۔ گھر کے دروازے کے باہر، کھڑکی

سے باہر، کوئی کھڑا محسوس ہو رہا تھا۔ کالج آتے ہوئے کوئی پیچھے آتے محسوس ہو رہا تھا کئی دنوں سے ایسے ہی چل رہا تھا۔ فرزام کو دیکھ کر خوش بھی نہیں ہو سکی۔ چہرے سے شکش ہی نمایاں تھی۔
”مجھے لگا کر خوشی سے تم مجھ سے لپٹ جاؤ گی۔ تم نے تو سب کو ہی چونکا دیا۔“ اس کا اشارہ راہ گیروں کی طرف تھا۔

”میں ڈر گئی تھی۔ میں حیران بھی ہوئی ہوں۔“ اس نے بات کو سنبھالا۔
”بہر حال میں بہت ناراض ہوں اب۔“ ہاتھ سینے پر باندھ کر فوجی مارچ کے سے انداز میں وہ آگے آگے چلنے لگا، تیز تیز۔

”میں منالوں گی۔“ وہ پیچھے پیچھے ساتھ ساتھ آنے لگی۔

وہ منہ پھلائے چلتا ہی رہا۔ تیز تیز ہوتا گیا۔

”پلیز رکو۔“ ساتھ ساتھ تیز تیز چلتے وہ ہانپنے لگی۔

وہ اور تیز ہو گیا۔ اب وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”آئی ایم سوری۔“ دونوں کان پکڑ کر بے چاری سی صورت بنا کر کہا۔

فرزام نے اس کی ناک پکڑ لی اور دائیں بائیں زور زور سے جھکے دینے لگا۔

”آہ۔۔۔! مجھے درد ہو رہا ہے مسٹر!“

”اس ہولناک چیخ سے میں بھی ڈر گیا تھا میڈم!“

ناک بدستور دائیں بائیں ہلائی جا رہی تھی۔ کان بدستور پکڑے ہوئے تھے۔ دونوں ایک فریم میں اچھی تصویر بنارہے تھے۔



فرزام جھوٹا آیا تھا اور دونوں رہ کر چلا گیا۔ اس بار افاقہ کا جی چاہا کہ اسے واقعی میں نہ جانے دے۔ سے پکڑ کر گھر میں لاک کر دے اور خود بھی لاک ہو جائے۔ لیکن وہ صرف اس سے ملنے کے لیے آیا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ اب بھی ملنے کے لیے نہ آتا تو یقیناً اس کا دم نکل جاتا۔

”چند ہفتوں کا ہی کام رہ گیا ہے۔ میں کسی بھی وقت آ سکتا ہوں۔ خیر! ایسا سر پر اترتو تمہیں اب نہیں دوں گا۔ بس تم تیار رہنا۔ ساری خریداری کر لینا اپنی یا ہم مل کر کر لیں گے۔ بہت اچھے پیسے مل رہے ہیں مجھے۔ بہت کچھ لے کر دے سکتا ہوں تمہیں۔ چاہو تو فہرست بنا لینا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر چیزیں لکھنا۔ انکار نہیں کروں گا۔ دونوں ماؤں کو پہلے سے ہی پیسے بھجوا دیے ہیں اور تمہارے بزنس میں بھی پیسے انویسٹ کر دوں گا۔ جب کا کانٹریکٹ سائن کرتے ہی تمہیں امریکا میں یا جہاں تم کہو گی، ایک اسٹور لے دوں گا۔ دہی کیسا رہے گا؟ برطانیہ جانے کا خیال میں نے دل سے نکال دیا ہے اب میں برطانیہ کو سزا دینا چاہتا ہوں۔ اسے مجھ جیسا قابل لڑکا نہیں ملنا چاہیے۔ عارضی شہری کے طور پر بھی نہیں۔ کیا معلوم وہ مجھے ہتھیایا ہے۔ مجھ سے کہے کہ شہریت لے لو یہاں کی۔ لیکن میں انکار کر دوں گا۔ میرا خیال ہے، کمپنی مجھے ساؤتھ ایشیا ہی بھیجے گی۔ میں اوکے ہوں۔ وہ مجھے جہاں بھی بھیج دیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“
”میں بھی اوکے ہوں۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے میری کوئی بات سنی ہی نہیں۔“

”یہاں سے کن کر یہاں سے نکال دی۔“ اس نے دائیں سے بائیں کان کی طرف اشارہ کیا۔

”تم پریشان ہو افاق؟“ وہ ہنس رہی تھی۔ لیکن اسے لگا کہ وہ خود پر پردے ڈال رہی ہے۔

”ایسا کیوں ہو گا بھلا؟“ جواب نہیں دیا۔ سوال کر لیا لانا کہ سوال کا جواب کیا دیتی۔ خوف نام کی ایک نیل اس کے اندر پھوتی پھلتی ہر شے سے لپکتی جا رہی تھی۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ وہ پردے ڈال رہی ہے، ہنسی اور مسکراہٹ کے۔ اگر وہ یہ پردے ہٹاتی تو فرزام اس سے کئی سوال کرتا۔ ہر سوال کا جواب نہیں تھا اس کے پاس اور اگر ہر سوال کا جواب دے بھی دیتی تو شاید فرزام کی تسلی نہ ہوتی اور ان دونوں میں کچھ نہ کچھ ضرور بڑبڑاتا۔ اس نے خود کو روکے رکھا اور اس سے کہا نہیں کہ کانٹریکٹ کو چھو کر پھاڑا ڈاؤر آؤ بھاگ چلتے ہیں امریکا سے راتوں رات اور پاکستان چل کر اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ آؤ، ہم دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں۔ لیکن وہ کہہ نہیں سکی اور فرزام اکیلا ہی واپس چلا گیا۔ لیکن واقعی صرف چند مزید ہفتوں کے لیے۔ وہ اسے لینے ایئر پورٹ گئی۔ رات کو فرزام نے اس کا بازو پکڑ کر اپنے بازو میں دیا اور دونوں نیو بری (New Bury) آگئے۔

فرزام بہت خوش تھا۔ جیسے ہر کام سے فارغ ہو چکا ہو۔ جیسے طویل محنت کے بعد اسکول کے بچے امتحان سے فارغ ہوتے ہیں اور جیسے ایک لمبے انتظار کے بعد کوئی خاص دن آتا ہے۔ آخر آئی جاتا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ آفتی نے فہرست نہیں بنائی تھی۔ اچھا ہی کیا تھا کہ نہیں بنائی کیونکہ بنا فہرست کے ہی وہ اتنا سب کچھ لے رہا تھا۔ اس نے اس سے جس فرکوٹ کا وعدہ کیا تھا، ایک بڑے اسٹور سے وہ فرکوٹ لے رہا تھا۔

”پیرس فرکوٹ کے بغیر نہیں جانا چاہیے۔“ ساتھ سے بتایا۔

وہ بار بار اس کی پسند کے کوٹ پہن پہن کر دیکھتی رہی۔ جو اسے اس پر اچھا لگا، وہ اس نے لے لیا۔ پھر اس کے دائیں بائیں ہاتھوں میں طرح طرح کے ہولڈنگ بیگز پکڑا پکڑا کر بیگز پسند کیے۔ برے بڑے شولڈر بیگز الگ سے لیے۔ اس وقت اس کا خریداری کا تجربہ اچھے اچھوں کو مات دے سکتا تھا۔

”اگر پیرس میں مجھے کسی نے یہ کہہ دیا کہ میری بیوی کتنی اولڈ فیشن ہے تو میں اس کا جڑا توڑ دوں گا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میری وہاں کسی سے ایسے لڑائی ہو؟“ وہ انتہا کی سنجیدگی سے سوال کر رہا تھا۔

”تم سے ایک روکس کا وعدہ بھی کیا تھا میں نے۔“

سارے وعدے اس نے خود ہی کیے تھے اور سارے وعدے وہ یاد سے خود ہی پورے کر رہا تھا۔ اس کے پاس واقعی بہت پیسے آگئے تھے۔ آفتی نے اسے اپنا کریڈٹ کارڈ دینا چاہا۔ لیکن اس نے اس کا بیک کھول کر اس میں سے چند ڈالرز نکال لیے۔

”تمہاری طرف سے فی الحال آؤس کریم کھا لیتے ہیں۔“

وہ ڈبل ڈیک آؤس کریم لے آیا۔ آؤس کریم اتنی بڑی تھی کہ وہ دونوں پندرہ منٹ سے اسے کھا رہے تھے۔ شاپنگ بیگز ہاتھوں میں پکڑے نیو بری کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔

”تم یہیں کھڑی رہنا۔ میں ابھی آیا۔ دیکھو، میرے پیچھے نہ آنا۔ اگر تم میرے پیچھے آئیں یا مجھے

دیکھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں تو میں اتنے سارے لوگوں کے درمیان سڑک کے عین وسط میں جھج زمین پر پھیل کر رونے لگوں گا۔“

رش میں اسے ایک طرف کھڑا کر کے وہ کہہ کر اسے اپنی طرف سے الٹی طرف گھما کر اس کے پیچھے سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں افق فوراً پٹی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ایک بڑی جیولری شاپ میں جا رہا تھا۔ وہ مسکرانے لگی۔ وہ جانتی تھی، وہ اس کے لیے ایک عدد انگٹھی لینے جا رہا ہے۔ ایک ایسی انگٹھی کا نہ اس نے وعدہ کیا تھا، نہ ہی تذکرہ۔ وہ اسے پروپوز کرے گا۔ پروپوز کرنے کا بھی اس نے وعدہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کی اسے خواہش تو بہت ہوگی۔ پرانی انارکلی میں وہ اس سے شادی کا کہہ رہا تھا۔ اب وہ اس سے اپنی محبت کا کہے گا۔ پہلے اس نے بتایا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ بتائے گا کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتا ہے۔

نیو بری کی پر رونق سڑکوں کی رونق مزید بڑھ گئیں۔ رات کی چکا چوند میں اضافہ ہو گیا۔ گہما گہمی بڑھنے لگی۔ دور نزدیک بڑی بڑی دکانوں اور اسٹورز پر گلے بورڈز اور جگلا گانے لگے۔ اپنی بام ڈیڈ کے ہاتھ پکڑے، باپ کارن، آکس کریم کھاتے مسکراتے بچے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے نوجوان لڑکے لڑکیاں۔ یہ سب افق کو بہت اچھا لگا۔
”فرزام اس کے لیے انگٹھی لینے گیا ہے“

چند دنوں سے وہ جتنی پریشان تھی۔ وہ پریشانی جاتی رہی۔ وہ افق سے صرف منفر فرزام بن گئی۔ ایک عرصے سے اس کی زندگی مضحک تھی۔ لیکن اب وہ وقت تھا جب وہ بے حد خوش تھی۔ ایک عورت کو اپنی زندگی میں ہر بل اس ایک لمحے کا انتظار ضرور ہوتا ہے جب کوئی مرد اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور وہ اس بات کا اقرار کرے کہ اس کے دل پر اس کا راج ہے اور وہ اس راج میں غلام بننے کے لیے بخوشی تیار ہے۔ اس گھٹنے ٹیک غلام پر خود کو لٹا دینے کو جی چاہتا ہے۔ اسے اپنا سردار، اپنے سر کا تاج بنانے کو جی چاہتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر راج کرتے ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کے غلام ہو جاتے ہیں۔ ان گئے سالوں میں وہ فرزام سے متاثر ہوئی تھی۔ اسے اچھا جانا تھا۔ وہ ہیرے کے دل والا تھا اور اس ہیرے کے دل میں اس نے اپنی تصویر دیکھ لی تھی۔ وہ دنیا میں سب سے پیارا تھا اور وہ اسے بھی سب سے زیادہ پیارا تھا۔

سڑک کے ایک طرف کنارے پر کھڑے افق یہ اعلان کرنے کے لیے تیار تھی کہ انسانوں میں ایک بے حد پیارے انسان ”فرزام“ سے وہ محبت کرتی ہے اور بے حد کرتی ہے۔ کرتی رہے گی اور کیے بنا رہے گی نہیں۔ اس اعلان کو کرتے وہ جھجکے گی نہیں۔ وہ وہاں سے گزرتے ہر شخص کو روک کر یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ دیکھو، میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ تم سب کتنے بد نصیب ہو۔ فرزام صرف میرے پاس ہے اور تم سب اس جیسے کے بغیر ہو۔ وہ تمہیں نہیں ملے گا۔ وہ صرف میرا ہے۔ اب وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ آکس کریم والے کو بیک میں سے نکال کر بہت سارے ڈالرز پکڑا دے اور کہے کہ سب میں آکس کریم مفت بانٹ دے۔ سب کو آکس کریم ملنی چاہیے۔ سب کو مسکراتا چاہیے۔ آس پاس سے گزرتے لوگوں کو چاہیے کہ اسے فردا فردا مبارک باد دیں۔ سب اکٹھے ہو کر اسے جیتز کریں۔ مل کر تالیاں بجائیں۔ اس

کے لیے کوئی محبت بھرا لوگ گیت گائیں۔ ہر تہوار کی آمد کا جشن منایا جاتا ہے۔ محبت کی وقوع پذیری کا جشن بھی شان سے منایا جانا چاہیے۔ اس جشن میں باقی سب جشنوں کو مات دے دینی چاہیے۔ محبت کی دھنک ابھر کر جب سامنے آتی ہے تو اس کے ساتھ جھوم کرنا سننے گانے کو ہی جی چاہتا ہے۔ بے خودی کے رقص ایسے ہی نہیں ہو جاتے۔ یہ واقعہ صرف محبت ہی واقع کرتی ہے۔ وہ عشق حقیقی ہوا مجازی، جھوم جانے کو دونوں میں ہی جی چاہتا ہے۔ نشو سے ہونٹ صاف کر کے افق چند قدم چل کر اس شاپ کی طرف گئی جس طرف فرزام گیا تھا۔ لیکن وہ اسے باہر نکلتا نظر آ گیا۔

”کیوں آ رہی تھیں میرے پیچھے؟“ وہ خفا ہوا۔

”میں کب تک اکیلی کھڑی رہتی آخر؟“

”تھوڑی سی دیر تم اکیلی نہیں رہ سکتیں؟“

”نہ۔۔۔ نہ۔“ اس نے ساتھ تیزی سے بچوں کی طرح سر ہلایا۔ فرزام کے ہاتھ میں کوئی شاپنگ بیگ نہیں تھا۔ جاتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگز بھی اسے ہی پکڑا گیا تھا۔ انگوٹھی پھر یقیناً اس کے کوٹ کی جیب میں ہوگی۔ افق نے نظروں ہی نظروں میں اس کا جائزہ لیا اس نے بازو اس کی کمر میں حائل کیا اور اسے ساتھ لے کر چلنے لگا۔ وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

”کیا تمہیں مجھ سے کچھ چاہیے؟“ یہ سوال ایسے تھا جیسے کیا ایک اور اس کریم کھانی ہے۔ وہ اسے انتظار کروانا چاہتا تھا۔ ابھی یہ مرد ٹھنکنے ٹھنکنے میں دقت لے گا۔

”ہاں۔“ فوراً کہا۔ ”جو اندر سے لائے ہو۔“

”کہاں اندر سے؟“ اس نے ذرا سی گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا۔

”میں نے تو کچھ نہیں لیا دیکھو، میرے ہاتھ خالی ہیں۔“ دونوں ہاتھ آگے کیے۔

”کوٹ کی جیب میں ہوگا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ اس نے دائیں طرف کی جیب

میں ہاتھ ڈالا۔ خالی باہر نکالا۔ پھر بائیں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ خالی ہاتھ آگے کیا۔

”کچھ ہے ہی نہیں۔“ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”اندروالی جیب میں ہوگا۔“ کوٹ کا دایاں کونا اٹھا کر اس نے کہا۔

فرزام کا ہاتھ اندر گیا۔ ”آں۔۔۔ چلو دیکھتے ہیں۔ کچھ مل ہی نہیں رہا۔“

وہ ہنس رہا تھا۔ پھر ہاتھ باہر آ گیا اور وہ مٹھی کی صورت بند تھا۔

”دیکھا، ہے اس میں کچھ۔۔۔ کھولے اسے۔“

”سوچ لو افق! یہ خالی بھی ہو سکتا ہے۔“

”اگر یہ خالی ہوا تو یہاں سب کے درمیان نیچے بیٹھ کر میں رو دوں گی۔“

”اچھا، پھر ذرا آنکھیں بند کرو۔“

وہ اس کا بازو تھام کر بیٹھنے میں سے نکال کر ایک طرف کونے میں لے گیا۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ذرا دور ایک بیٹج پرایک درمیانی عمر کا جوڑا بیٹھا برگر کھا رہا تھا۔ دونوں کا انداز اور مسکراہٹ

ایسی تھی کہ وہ افق اور فرزام کی طرف ایسے ہی دیکھنے لگے۔ افق نے آنکھیں بند کر لیں اور بند کی ہی تھیں کہ تڑپ کر کھول دیں اور بجلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹ گئیں جبکہ فرزام تو سامنے کھڑا تھا۔ مٹی اس نے کھول لی تھی، انگوٹھے اور شہادت کی انگلیوں میں انگوٹھی پکڑ لی تھی لیکن ”افق“ کی آواز سے وہ پیچھے دیکھنے لگی۔ اس کی بد قسمتی اس کی فاش غلطی پیچھے کھڑی تھی۔

”تم آئی کیوں نہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”شام پانچ بجے کا وقت دے رکھا تھا۔ اب دس بج رہے ہیں۔“

انگوٹھی کو مٹھی میں ہی بھیج کر فرزام دو قدم آگے ہوا۔ اس کے برابر آ کر کھڑا ہوا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک نظر افق کو دیکھا۔ وہ اس وقت چکر اکر گرنے کے قریب تھی۔

وہ مسکرا رہا تھا۔ ”تمہیں میں بعد میں پوچھتا ہوں۔ یہ کون ہیں؟ ان سے تعارف کرواؤ۔ تمہارے کزن ہی ہوں گے۔ میں اپنا تعارف خود ہی کروا دیتا ہوں۔ آئی ایم ڈاکٹر عدنان غلام علی۔ آپ کہہ سکتے ہیں افق کا نام۔“

ہاتھ اس نے آگے کیا۔ جسے تھما نہیں گیا۔ فرزام، افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ افق، عدنان کے آس پاس پھیلے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی۔ جو اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ افق گونگی بن گئی اور فرزام بہرا ہونے کے قریب تھا۔

”افق کا نام“ فقرے کی بازگشت بہت جان لیوا تھی اور یہ بازگشت تھم ہی نہیں رہی تھی۔ کینیڈا میں ترتیب دیے گئے سارے جملے اس بازگشت کے سمندر میں جا پھنسے تھے۔

”ایک ہفتہ پہلے مجھے یہ ملی تھیں۔ آج کے دن کا وعدہ کیا تھا دوبارہ ملنے کا۔ یہیں قریب میں ہی ایک ہوٹل ہے۔ میں کافی دیر سے وہاں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں تو یہ آئیں نہیں، یہاں نظر آئیں۔ میرے رہا ہونے کو سیلبرٹ کرنا تھا۔ سب افق کی وجہ سے ہی ہوا۔ ورنہ میں ابھی تک جیل میں ہی ہوتا۔“

افق نے فرزام کا بازو کھینچا۔ ”پہلیے، گھر چلتے ہیں۔“
”یہ کیا کہہ رہا ہے افق؟“ فرزام کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جو سن رہا تھا، اس کے بعد لگتا تھا کہ کچھ سنائی نہیں دے گا۔

”یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ افق بمشکل کہہ سکی۔
سامنے کھڑا عدنان مسکرایا۔ ”یہ کریڈٹ لینا ہی نہیں چاہتی۔ میں نے ٹیبل صرف دو لوگوں کے لیے ہی بک کروائی ہے ورنہ میں آپ کو بھی ضرور انوائٹ کرتا۔ آپ سمجھ ہی سکتے ہوں گے۔“ وہ فرزام کی طرف دیکھ کر بات کر رہا تھا۔ آخر میں گھٹیا انداز سے آنکھ ماری۔

شریف بیویوں کے شریف شوہر سر راہ ایسے الفاظ اور ایسے گھٹیا انداز پر گریبان پکڑ لیا کرتے ہیں۔
”یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ پھر سے یہی سوال تھی سے کہا گیا۔

”پہلیے گھر پلیر۔“ افق اس کا کوٹ بھیج رہی تھی۔ ”یہ مجھے بلا وجہ تنگ کر رہا ہے۔“
”میں تنگ کر رہا ہوں۔“ وہ ہنسا۔ ”تم ایسے کیوں بات کر رہی ہو؟ ابھی چند دن پہلے تو تم مجھ سے

ملی تھیں کہ نہیں؟ تب تو تم ٹھیک تھیں۔ اب ایسے بات کر رہی ہو۔ اپنے کزن سے ڈر رہی ہو؟ انہیں میرے بارے میں بتایا نہیں؟“

افق نے فرزام کے بازو پر دباؤ ڈالا اور آگے چلے گئی۔

”تمہارا یہ رویہ مجھے حیران کر رہا ہے!“ ساتھ ساتھ چلتے وہ بلند، حیران آواز میں بولا۔ ”تم نے مجھے جیل سے ضمانت پر آزاد کروایا۔ مجھے اپنا شکریہ تو ادا کرنے دو۔“

وائٹ گولڈ کی انگوٹھی فرزام کی کٹھنی میں ہی شرمندہ ہو گئی۔ اس کا بازو کھشتی تیز تیز چلتی افق اسی انگوٹھی میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔ فرزام نے اپنا بازو افق کے ہاتھ سے آزاد کروایا۔

”تم نے اسے جیل سے آزاد کروایا؟“ خود رک کر اور اسے بھی روک کر وہ پوچھ رہا تھا۔ عدنان دو قدم دور کھڑا تھا۔ افق نے فرزام کی طرف التجا سے دیکھا کہ یہاں سر راہ اس گناہ کے سامنے، جو دو قدم ہی پیچھے کھڑا ہے، یہ سب بند پوچھے۔ اس پر شک ضرور کرے لیکن اس پر یقین بھی رکھے۔

اپنے پیچھے کھڑے شخص سے اسے نفرت تھی۔ اپنے سامنے کھڑے شخص میں اس کی جان تھی اور ان دونوں کے درمیان کھڑی وہ ڈوب مرنے کے قریب تھی۔ اس کی خوشی ملیا میٹ ہو گئی۔ اس بار سر راہ اس کی عزت پر غلام علی نے نہیں، عدنان غلام علی نے ہاتھ ڈالا تھا۔

کیا وہ یہ کہتی، ہاں کیا۔۔۔ یا کہتی نہیں۔۔۔ دونوں ہی سچ تھے اور دونوں ہی جھوٹ تھے۔ اس سوال کا سیدھا جواب کوئی نہیں تھا۔ اس سوال کے سبب الٹے اور اچھے ہوئے جواب تھے۔ جواب دینے میں یہ معمولی سا تامل فرزام کو بہت سے جواب ایسے ہی دے گیا۔ ایک دم وہ افق سے بہت دور جا کھڑا ہوا۔۔۔ بہت دور۔

”تم اپنا وعدہ پورا کرو۔“ وہ آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ سے بیگز لیے اور تیزی سے چلنے لگا۔

”فرزام!“ اس نے بلند آواز میں چیخ ماری تھی۔ وہ رکا نہیں۔ وہ بھی تیز تیز چلتی اس کے پیچھے گئی۔ ”میری بات سنئے، میں سب بتا دیتی ہوں۔ ایسے نہ کریں۔“

”بتانا ہوتا تو تم چھپا تیں کیوں؟“

اسی کی طرح تیز آواز میں اپنی آواز کی نمی چھپا کر وہ بھاگنے کے قریب تیز ہو گیا۔ اگر وہ رکا تو وہ واقعی عین سڑک پر سب کے درمیان زمین پر پھیل کر اونچی آواز سے رونے لگے گا اور اس بار وہ بہت روئے گا۔

افق ”فرزام، فرزام“ ہی کرتی رہ گئی۔ وہ ٹیکسی لے کر چلا گیا۔ افق ہانپنے لگی۔ کوٹ کا کارل آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

فرزام کے لیے کیا گیا میک اپ بہرہا تھا۔ وہ پھر سے گھٹنوں میں سر دے کر رونے کے لیے تیار تھی اور وہ اونچی آواز سے رونے لگی۔ عدنان اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔

”چلیں افق!“

ساری نفرت اور پوری قوت سے اس نے پلٹ کر زوردار تھپڑ اس کے دائیں گال پر لگایا۔ اس بددعا پر جو نہ جانے اسے کون دے گیا تھا۔ وہ وقت ہی ہوگا۔



چند قانون دانوں کے بیانات اور بیگز کے شور مچانے پر اتنا ضرور ہوا کہ ایسے کیسوں کی سماعت میں تیزی آگئی۔ ویسے بھی وہ سالوں سے بند تھے۔ انہیں اب سزا سنائی جانی تھی یا رہا کر دیا جانا تھا۔ عدن اور اس جیسے چند اور لوگ باہر رہ کر کیس لڑ سکتے تھے۔ لیکن وہ امریکا سے باہر نہیں جاسکتے تھے۔ کیس کی سماعت میں تیزی آتے ہی عزیز نے جان لگا دی تھی۔ وہ ایک بے حد محنتی اور ایمان دار انسان تھا اور حقیقتاً عدن کے لیے پریشان تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لالچ میں اس سے غلطی ضرور ہوئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا جائے۔

اسے امید تھی کہ جلد ہی اس کا مقدمہ بھی ختم ہو ہی جائے گا۔ فی الحال یہی بہت تھا کہ وہ باہر آ چکا تھا۔ عدن نے عزیز کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اسے افتی کے بارے میں بتائے۔ لیکن عزیز نے صاف لاعلمی ظاہر کر دی کہ وہ اسے بارے میں نہیں جانتا۔ عدن کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

عزیز نے اس کے لیے رہائش کا انتظام کر دیا تھا۔ پاکستان میں وہ سب سے بات کر چکا تھا۔ اب اسے صرف بات کرنے کے لیے افتی چاہیے تھی۔ وہ اس ہیومن رائٹس کے ادارے کے دفتر آ گیا۔ جس کا نمائندہ اسے سیل میں آ کر ملا تھا۔ بظاہر وہ ان کا شکریہ ادا کرنے گیا تھا۔ لیکن باتوں ہی باتوں میں وہ معلومات لیتا گیا کہ ان کے پاس عدن کا کیس لے کر کون آیا تھا۔ اسے مسٹر جن کے اور ان کی این جی او کے بارے میں بتایا گیا۔ افتی کے بارے میں بھی بتایا گیا۔ مسٹر جن کی این جی او کی ویب سائٹ پر اسے چند ماہ پہلے ہوئے فنڈ ریزنگ ایونٹ کی بہت ساری تصاویر ملیں۔ اسے بتایا گیا تھا کہ افتی نے ان کی این جی او کے لیے کام کیا ہے ان کے لیے فنڈز اکٹھے کیے ہیں۔ مختلف دیوبند پتھر کا جائزہ لیتے اس کی نظر اس بچہ پر بھی پڑی جس میں فنڈ ریزنگ میں اچھے اسکور لینے والوں کے نام اور ان کے جمع کیے گئے فنڈز کی نشان دہی کی گئی تھی۔ بہت سے ناموں میں ایک نام افتی کا بھی تھا۔ ایک طرف اس کی پیش کی گئی برائڈ ”چز“ کا نام درج تھا۔ بریکٹ میں ملک کا اور شہر کا نام درج تھا۔

عدن نے سرچ انجن میں چز کی ویب سائٹ نکال لی اور جہاں جہاں برائڈ چزل سکتی تھی، وہ پتے بھی، ان میں سے ایک پتا بوٹن کے ایک اسٹور کا تھا، جہاں سے اس برائڈ کو خریدا جاسکتا تھا۔

وہ بہت خوش تھا۔ اس نے اسے ڈھونڈ لیا تھا۔ اب وہ افتی کو سر پرانز دینا چاہتا تھا۔ ایک بار اسٹور جا کر اس نے تصدیق کر لی تھی کہ وہی افتی ہے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ دو یا تین دن بعد وہاں کا چکر لگاتی ہے۔ رابطہ نمبر کے طور پر اسے پاکستان میں موجود آفس کا کارڈ دی دیا جا رہا تھا۔

وہ مسلسل دو دن وہاں جاتا رہا۔ وہ قریبی ریستورنٹ میں بیٹھ جاتا۔ جہاں سے وہ اسٹور پر نظر رکھ سکتا تھا۔ سارا دن ایسے ہی بیٹھا رہتا۔ سالوں بعد وہ اسے دیکھنے جا رہا تھا، اس سے ملنے جا رہا تھا۔ اس نے اس کی زندگی بھالی۔ اسے باہر نکالا۔ اس پر اس کی زندگی کا سب سے بڑا احسان کیا۔ عین مرنے کے وقت اسے زندگی کی نوید دی۔ اس کا اسپتال ضبط کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹری کا لائسنس منسوخ کر دیا گیا تھا۔ اس کی صحت، اس کا مردانہ حسن و وجاہت سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ رشتے اور رتبے کے نام پر اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ شروع کے صرف دو ڈھائی سالوں میں ہی اس کی ہمت پست ہو چکی تھی۔ ماریہ جس

طرح اسے چھوڑ گئی۔ اس نے اپنا سر دیواروں پر مارا۔

وہ اسے چھوڑ جاتی لیکن اس کی تھوڑی مدد تو کر دیتی۔ وہ امریکن تھی۔ وہاں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھی۔ الٹا اس نے طلاق لے لی اور اس کا سر جن کی گندی بیٹی کی وہ چوکیداری کرتا رہا تھا۔ ایک بار آکر اس سے ملا تک نہیں۔ وہ دنوں ان دنوں کو گالیاں دیتا رہا۔ وہ انہیں بد ذات سمجھتا تھا۔ وہ عدن کے لیے ایسے بے غیرت تھے جن میں نام کی بھی غیرت نہیں تھی۔ نائٹ کلب میں ڈانس کرنے والی ڈانسر بھی اس کے نزدیک ماریہ سے زیادہ شریف اور قابلِ عزت تھی۔

اسے احساس ہوا کہ وہ دراصل اپنے پیانے سے گر گیا تھا۔ اس کا پیانا صرف افق تھی، جہاں اس نے کالج کی بہت سی جان چھڑکنے والی امیر زادیوں کو لفٹ نہیں کروائی تھی۔ وہاں اس نے یہ لفٹ صرف افق کو کروائی تھی۔ اس نے فاش غلطی کی جو وہ بہک گیا۔ جبکہ اس نے سوچ ہی لیا تھا کہ اسے صرف افق سے ہی شادی کرنی ہے۔ وہ اچھے خاصے مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں نوکری کر سکتا تھا۔ اپنا کلینک بنا سکتا تھا۔ بے حد پراساس نہ سہی، آرام دہ زندگی ضرور گزرتی۔ لیکن یہ آرام دہ زندگی اسے امریکی چندنی سیل میں بیٹھ کر دکھائی دی۔ جب وہ یہاں نہیں تھا تو اسے ڈبل اسٹوری اسپتال بنا بنایا بوسٹن میں نظر آ رہا تھا۔ آغا کے اسٹورز کی چین نظر آ رہی تھی۔ غلام علی غلام کو آغا کے ذاتی طیارے کے مالک ہونے کا غرور توڑنا تھا انہیں اس شخص آغا سے شدید نفرت تھی۔ اس شخص نے ہمیشہ انہیں ہر میدان میں پیچھے چھوڑا تھا۔ کبینہ، عیاش، الو، بے غیرت۔ وہ اسے بہت سے ناموں سے یاد کرتے۔ لاس ویگاس میں وہ جا جا کر کیا کرتا ہے۔ ایک دن غلام علی نے بہت رازداری سے ازبک بیوی کان بھرنے چاہے وہ پہلے تو اپنے شوہر کی طرح سنتی رہی۔

”وہ ایک ماہر جواری ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ باقی کی معلومات مجھے کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ ہیں۔“ مطلب آئندہ اپنی بکواس بند ہی رکھنا۔

تب اسے ماریہ جنتِ نظیر نظر آئی تھی۔ جو جو بھی تھی اور ایک دنیاوی جنت کی مالک بھی۔ تب کیوں سب ٹھیک لگتا تھا؟ اب سب کیوں برا لگ رہا ہے؟ عدن یہ بات نہیں جان سکا۔ وہاں وہ دن رات ایک ہی کام کرتا۔ ”وہ افق کو یاد کرتا“ ان دنوں اس پر افق کی محبت کا بھوت بری طرح سے طاری ہو گیا۔ اسے اس کے نام کے دورے پڑتے۔

وہ یہی تانے بانے بنا رہتا کہ اگر وہ آج یہاں نہ ہوتا تو ایک گھر میں افق کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا۔ اس کے بچے ہوتے۔ بے حد محبت کرنے والی بیوی ہوتی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ زندگی میں ان دو چیزوں کے علاوہ کسی تیسری کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ ”سکون اور محبت“ اسے یاد آتا تھا کہ وہ اس سے کتنی بے لوث محبت کرتی تھی۔ ایسی محبت جو کچھ مانگتی نہیں، پردے

سب دیتی ہے۔

”اتنی اچھی پلاننگ میں یہ سب کیسے ہو گیا۔“ وہ اپنے بال نوچتا۔ جب سب افق کے ساتھ سارے منصوبے بنا چکا تھا تو وہ سب کیوں نہ مضبوط رہا۔

اتنے سالوں میں غلام علی نے پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ آسٹریلیا میں پڑھنے والا اس کا چھوٹا

بھائی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی تباہ ہو چکی تھی۔ غلام علی کے پیسے کے کنویں خالی ہو رہے تھے۔

ان گزرے سالوں میں ان کی کمزور چکی تھی۔ فیکٹریاں نقصان میں ہی جاری تھیں۔ قرضوں کی قسطوں کی ادائیگہ نہ ہو سکی۔ سود و سود بڑھ گیا۔ یہ کھیل غلام علی کے ہاتھوں سے نکل گیا اور دونوں فیکٹریاں بینک نے ضبط کر لیں۔ جس فیکٹری میں آگ لگی تھی اس سمیت بینک نے فیکٹریاں نیلام کر دیں۔ غلام علی کے پاس ایک چھوٹی تین کینال کی فیکٹری ہی بچی تھی یہ ایسے ہی تھا جیسے وہ مر سیڑز چلاتے چلاتے سائیکل پر آگئے ہوں۔ لاہور ڈی ایچ اے کا بنگلہ بھی بک چکا تھا۔ سیالکوٹ کا گھر ہی بچا تھا۔ فارم ہاؤس پر بھی مزید قرضہ لے لیا گیا تھا۔

غلام علی چاہتے تھے کہ بس وہ جلد سے جلد واپس آجائے۔ اب بھی وہ اسے ایک چھوٹا سا اسپتال تو بنا کر دے ہی سکتے تھے۔ اسپتال کے کاروبار میں اتنا مبالغہ ہے کہ دنوں میں ہی ان کا نقصان پورا ہو ہی جائے گا۔ پھر وہ تو امریکن ڈاکٹر بھی ہے۔ کہنے میں کیا جاتا ہے کہ اتنے سال اس نے امریکا میں پریکٹس کی ہے۔ امریکیوں کا علاج کرتا رہا ہے۔ پاکستان میں انہوں نے اس کے جیل جانے کی خبر کو سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ وہ فیکٹری بیچ کر اسے ایک بڑا اسپتال بنادیں گے اور نہیں تو چھوٹے چھوٹے دو تین ہی بنالیں گے۔ غلام علی نے بہت اعلیٰ منصوبے بنا رکھے تھے۔

”حالات یہی رہے تو ہم فٹ پاتھ پر آجائیں گے۔“ بارہ کینال کے گھر میں رہنے والے غلام علی کو فٹ پاتھ کے نام سے ہی نفرت تھی۔ جبکہ یہی فٹ پاتھ گا ہے بگا ہے انہیں خواب میں دکھائی دیتا تھا۔ ”تم بھاگ نہیں سکتے وہاں سے؟ کوئی ایجنٹ ڈھونڈو عدن! کوئی تمہیں کینیڈا کے راستے یا برازیل کے راستے نکال سکے۔ میں یہاں بھی ایسا ایجنٹ ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم بھی کوشش کرو۔ سنا ہے یہ سیاہ فام بہت طاق ہیں ان کاموں میں۔ بہت سوں کو امریکا لے آتے ہیں غیر قانونی۔“

اس نے سنتے ہی صاف صاف انکار کر دیا۔ ”میں دوبارہ چھس جاؤں گا اگر ایسے بھاگتے پکڑا گیا تو ان کا شک یقین میں بدل جائے گا۔ وہ مجھے دہشت گرد ہی سمجھ لیں گے۔ میں مر جاؤں گا یہیں مقدمہ بھگتے بھگتے لیکن دوبارہ جیل نہیں جاؤں گا۔“

”مردو عدن۔۔۔! زندگی میں خطرات مول لینے ہی پڑتے ہیں۔“

”میں سوئی چھنے جتنا خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہتا۔“ صاف انکار۔

”اتنے ڈر پوک ہو تم۔“ انہیں غصہ آ گیا۔

”جیل میں رہا ہوں۔ پولیس والوں کی شکل دیکھتے ہی جان نکل جاتی ہے۔“

”امریکا کا پانی پی کر تم بزدل بن گئے ہو۔“ وہ اسے اکسارہے تھے۔

”امریکا نہیں، جیل کا پانی پی کر۔“

”مرد ہی جیلوں میں جاتے ہیں۔“

”پھر وہی مرد کسی اور قابل نہیں رہتے پاپا!“

انہوں نے فون ہی بند کر دیا۔ ایک طرف اس کے آنے کی خوشی، دوسری طرف اس کی بزدلی پر

افسوس۔

اس کی ہائی فائی فیشن ایبل ماں ڈپریشن کی مریضہ بن چکی تھی۔ وہ روتی پہلے تھی بات بعد میں کرتی تھی۔ اس کی بہن نے یونیورسٹی کے ایک لوئر مڈل کلاس لڑکے سے خود ہی شادی کر لی تھی اور آج کل وہ دہلی میں تھی۔ غلام علی کو ایک عرصہ منانے کے بعد اس نے اس لڑکے سے خود ہی نکاح کر لیا۔ اس کے باپ کے پاس دولت کے علاوہ کوئی دلیل نہیں تھی دی جانے کے لیے اور اس کے پاس دولت کے علاوہ ہر دلیل تھی اس لڑکے کے حق میں دے جانے کے لیے۔ اسے اپنی بہن کے بارے میں معلوم ہوا تو اسے خود پر اور افسوس ہا۔ کاش! وہ بھی اپنی بہن کی طرح کا ہی ہوتا۔

رہائی کے تیسرے روز رات کے وقت اپنے قلیٹ میں اندھیرا کیے وہ آخری بازی ہمارا شخص بنا بیٹھا تھا۔ سودوزیاں کا حساب وہ جیل میں ہی لگا چکا تھا۔ باریہ سے لے کر اپنی ڈاکٹری تک۔ غلام علی سے آغا تک۔ اس نے ہر چیز کی گنتی کر لی تھی۔ اسے سب مایا اور کھوکھلا نظر آیا۔ سب بے کار۔ اسے بہت احساس ہوا کہ زندگی کی اصل کامیابی اصل اور کھرے انسانوں کا حاصل کرنا ہے۔ انسانی تعلقات میں اول آنا ضروری ہے۔ جذبول اور سچائی میں اول۔۔۔ وہ جان گیا کہ برے وقت میں انسانوں کو صرف ایک ہی چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ ”اپنے انسان کی۔“

قید کے عرصے میں وہ ایسی کان میں دبا رہا، جہاں اسے کونکوں اور ہیروں کی پہچان ملی۔ تاہم اس نے کونکوں سے ہی خود ہی کو سیاہ کیا تھا۔ ہیرے کو تو اس نے ٹھوکر مارنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ افق کو۔۔۔ ملے کو۔۔۔ اس کی بہن فضا کو۔۔۔ اپنے اسکول دوست ملے کی بہن فضا کو اپنے پیچھے پاگل کر دیا۔۔۔ آج وہی ملے اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے کا ہیڈ تھا۔ اس کی بہن جس نے عدنان کے لیے نیند کی گولیاں کھالی تھیں، ریڈ کر اس کے لیے کام کرتی تھی اور وہ چار دوست جو اس کے ساتھ ڈی ایچ اے کے بنگلے میں رہتے تھے۔ وی ایگل گروپ کے ممبر۔۔۔ آج بڑے بڑے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ ایک تو امریکا میں ہی ہارٹ سرجن تھا۔ غلام علی نے تعاون کے لیے جب رابطہ کیا تو اس نے صاف انکار کرنے کی زحمت بھی نہیں کی اور آئندہ سے ان کا فون منٹا ہی بند کر دیا۔

تو ایسی صورت حال میں۔۔۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ این جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ نیلے گنبد میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی این جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ ”کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کر رہا ہے“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں، یہی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

اس رات عدنان نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فعال ہو گئی۔

باہر نکلتے ہی وہ اب اس سے شادی کر لے گا۔ اس نے اور افق نے بہت انتظار کر لیا۔ بس۔۔۔ اسے اس کی میٹھی آواز اور بھولی صورت یاد آئی۔۔۔ شرافت سے جھکا اس کا سر اور محبت سے بھر اس کا دل۔۔۔ اب یہ دل کسی اور کا نہیں۔



کالج سے سیدھا وہ اسٹور آگئی تھی۔
 ”کوئی آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“ اسٹور کے در کرنے سے بتایا۔
 ”کون تھا؟“

”نام نہیں بتایا۔۔۔ صرف پوچھ رہے تھے۔“
 ”آرڈر دینا تھا؟“

”میں نے آرڈر کا پوچھا تو مسکرانے لگے۔ پوچھ رہے تھے کہ آپ کب، کب آتی ہیں۔ میں نے کارڈ دے دیا تھا آپ کے ہیڈ آفس کا۔“ کچھ ہی دیر میں وہ اسٹور سے باہر آگئی۔ جب کسی نے آکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔

”فرزام۔۔۔!“ ایسا صرف وہی کر سکتا تھا۔

”یہ فرزام کون ہے؟“ ہاتھوں کو فورا ہٹالیا گیا۔ آواز پر وہ ایسے ہلچلی، جیسے سانپ نے کاٹ مار لیا ہو۔ جس پر اس کی نظر پڑی، وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔۔۔۔۔ شان دار عمارت کا بد نما کھنڈر بنا عدن تھا۔ اس کی سرخ و سفید دودھیا رنگت، لمبے عرصے سے گردوں کے عارضے میں مبتلا سرخ و سفید بدن کی اور گدہ کی ہو چکی تھی۔ تھوڑا بہت جو گوشت جسم پر بچا تھا، وہ ڈھلتی عمر کے بیماری زدہ مرد کی جھریوں بھری کھال جیسا تھا۔ اپنے وقت کا شاہکار عدن عرف امان کھنڈرات بنا کھڑا تھا۔

”یہ فرزام کون ہے افق؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔ کون تھا، جو اس طرح اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ سکتا تھا اور کون تھا، جس کے ہاتھ رکھنے پر افق کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ صبح سے اس کا یہاں آکر انتظار کر رہا تھا۔ ریٹورنٹ اسٹور کے سامنے تھا۔ لیکن سڑک پار کر کے۔ کئی بار وہ اسٹور کے قریب بھی چلا گیا تھا۔ ریٹورنٹ اوپن تھا اور دن کے شروع میں وہاں زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ اس کی نظر ایک طرف اٹھی اسے گمان ہوا کہ یہ افق ہی ہے۔ لیکن اسے یقین نہیں آیا کہ کیا یہ افق ہو سکتی ہے۔ وہ کپ آکس کریم کھا رہی تھی۔ نیلے رنگ کی پنسل جینز پر اس نے مشرقی طرز کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ ہلکے خاکے کرتے پر اس نے گہرے سرخ رنگ کا اسکارف گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ بال کھلے ہوئے تھے اور بالوں میں سرخ ہی میئر بینڈ لگا ہوا تھا۔ دونوں کانوں میں ایئر فون فکس تھے اور کپ سے چمچے سے آکس کریم نکال نکال کر کھاتے ہوئے وہ ہنس رہی تھی۔ وہ یقیناً کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔

”میں تمہارے آس پاس ہی ہوں۔“ فرزام کہہ رہا تھا۔

”کوئی نہیں۔“ اس نے آس پاس دیکھا۔

”گردن گھماؤ مت نا۔۔۔ اسے ذرا ساجھا کالو۔“

وہ ہنسی۔۔۔۔۔ وہ سمجھ گئی۔۔۔۔۔ اس کے پاس چند منٹ ہی تھے بات کرنے کے لیے۔ عدن کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یقین کرے کہ سرخ اسکارف میں جو لڑکی شرابی چال چلتی جا رہی ہے، وہ افق ہی ہے۔

اتنے سالوں میں کیا اس نے صرف یہی ایک کام کیا کہ وہ اور سے اور خوب صورت ہوتی گئی۔ اس

بار اس نے اپنے ساتھ کیا کیا۔۔۔ کیا کہ وہ اتنی خوب صورت ہو گئی، اتنی پر اعتماد۔ بوٹن کی سڑک پر وہ ایسے چل رہی ہے جیسے بوٹن میں ہی پیدا ہوئی ہے۔ چادر کا کونا منہ میں دبا کر، سر کو جھکا کر پیدل چلنے والی۔۔۔ ہر ادا پر گھبرانے والی، ڈر جانے والی، کس ادا سے ہنس رہی ہے۔ اسے دیکھ کر لگ رہا ہے کہ اسے کوئی فکر، کوئی غم نہیں ہے۔ عدن کا تصور ذرا الٹ تھا۔ اس میں ایک تصور خاص غالب تھا کہ وہ اداس آنکھیں لیے ہر طرح سے بہت اداس ہوگی۔ اپنے امان سے دور۔۔۔ اس کی جدائی میں گھلتی، اس کے پیار کے لیے تڑپتی، افق عبدالقدوس۔

وہ چل کر اسٹور کے پاس ہی آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔
افق نے نفرت سے اسے دیکھا۔ عدن اس نظر پر حیران رہ گیا۔
”ہو آریو؟“ اس سوال پر بھی حیران رہ گیا۔
”میں کون ہوں؟“ اس نے ہنسنے کی صرف کوشش ہی کی۔

”تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی؟“ اگلا سوال پہلے سے بھی برا تھا۔ انداز اس سے بھی بدتر تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے بیگ میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ موبائل ہاتھ میں نکال کر پکڑا۔
عدن اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ”تم پولیس کو فون کر رہی ہو؟“ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب افق کر رہی ہے۔
”آئی۔۔۔ ایم سوری افق!۔۔۔ ایسے تو نہ کرو۔“ فون کو ہاتھ میں پکڑے پکڑے ہی افق نے اسے دیکھا۔

”تم نے مجھے ہاتھ کیوں لگایا؟“ کہنا تو وہ یہ چاہتی تھی کہ تم باپ، بیٹے نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔
”میں پھر سے سوری کہتا ہوں۔۔۔ لیکن تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہو؟“ اس کے انداز اور کڑے تبوروں پر وہ بری طرح سے الجھ گیا۔ ساتھ ہی اس کی آواز رندہ گئی اور آنکھوں میں نمی نظر آنے لگی۔ افق کو بڑا ترس آیا۔

”کیا چاہتے ہوڈا کٹر عدن۔۔۔! کیوں آئے ہو یہاں؟“
”تمہیں شکریہ کہنے آیا تھا۔“ فی الحال وہ یہ کہہ ہی نہیں سکا کہ تم سے فوری شادی کرنے کے لیے آیا ہوں، جو افق اب اس کے سامنے کھڑی تھی، وہ چادر کا کونا منہ میں دبا کر بیٹھی افق نہیں تھی۔
”کیوں؟“ افق نے حیران ہونے کی کمال ادا کاری کی۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم ہی مجھے آزاد کرواؤ گی۔“
”میں نے؟ میں نے کیا کیا؟ تم جیل میں تھے کیا؟“
عدن اس پر الجھ گیا۔ ”اتنی بڑی این جی او کا نمائندہ تم ہی نے تو بھیجا تھا میرے پاس۔۔۔ مارش نام تھا اس کا۔“

”میں نے تمہارے پاس کوئی نمائندہ نہیں بھیجا تھا۔“
”اس نے خود مجھے تمہارا نام بتایا تھا۔“
”تو تم بھی جیل میں تھے؟ وہ تمہارے پاس بھی چلا گیا؟“ عدن اور الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

”این جی اوجن لوگوں کے لیے کام کر رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان میں تم بھی ہو۔ ہم نے عرب۔۔۔ بنگلہ دیش اور چند دوسرے ملک کے لوگوں کے لیے تھوڑا سا کام کیا تھا اور بس۔۔۔“ افق نے کندھے اچکائے۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ عدن کو یقین ہی نہیں آیا۔
 ”تم کیا سمجھ رہے ہو، مجھے اس سے مطلب نہیں ہے۔“
 ”تم ایسے کیوں کر رہی ہو افق؟“ وہ پھر سے رو دینے کے قریب ہو گیا۔
 ”کیسے؟“

”اجبھی کیوں بن رہی ہو۔۔۔ اتنے سالوں بعد ملی ہو۔ کوئی حال احوال پوچھو۔ کوئی بات کرو۔ میں پاگل ہو رہا تھا تم سے ملنے اور تمہیں دیکھنے کے لیے۔“
 ”تم نے کہا، تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا تھا۔ جب کچھ کیا ہی نہیں تو کیسا شکریہ۔“ افق نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔۔۔ صاف جھوٹ۔۔۔ تم تو جھوٹ بولتی ہی نہیں افق اب کیوں؟ میں جانتا ہوں، ہم ناراض ہو مجھ سے۔“

اس سب پر افق کا جی چاہا کہ وہ دھکا دے کر اسے سرک پر گرا دے۔ اب یہ شخص اس سے اور کیا چاہتا ہے۔ اس کی سب خوبیوں کو جانتے ہوئے بھی چھوڑ گیا تو اب اور کیا چاہتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھوں اس کی مدد ہو گئی تھی۔ اس مدد کو اس نے انسانیت کے خانے میں لکھ دیا تھا۔ عدن کے خانے میں نہیں۔

”تم نے اپنی محبت کا حق ادا کر دیا۔“ عدن کی اگلی بات افق کو چاٹنے کی طرح لگی۔
 ”کون سی محبت؟“ افق کا سر گھوم گیا۔ اب ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔ شاید بہت غلط ہوئے جارہا ہے۔

”ہماری محبت۔۔۔“ اس نے بڑے دھڑلے اور جوش سے کہا۔
 ”ڈاکٹر عدن۔۔۔! زبان سنبھال کر۔“ اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ ”میری محبت میرا شوہر ہے اور بس۔۔۔ اس چکر کو جس میں مجھے پھنسا دیا تھا، اسے محبت کا نام مت دو۔“

قید سے پہلے ”تم دہشت گرد ہو“ اس پر آسمانی بجلی بن کر گرا تھا۔ رہائی کے بعد ”میری محبت، میرا شوہر“ وہی بجلی بن کر اس پر گرا۔ حیرانی، صدمہ، خوف، لا چاری، بے بسی، دکھ، سب آگے پیچھے اس پر وارد ہوئے۔ جب اسے مارش نے افق کے بارے میں بتایا تو وہ یہی سمجھا کہ قسمت افق پر مہربان ہو گئی ہے اور اس نے کسی نہ کسی طرح اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہ امریکا تک آ پہنچی ہے۔

”تم نے شادی بھی کر لی افق؟“ یہ بازی بھی ہاتھ سے گئی۔ عدن کا یہ سوال ایسے تھا کہ تم نے تو مجھے موت کی ہی سزا سنائی۔ اس کا گد میلا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ دو آنسو آنکھوں سے نکلے۔
 ایک بار پھر سے افق کو اس پر ترس آیا۔

”کیوں نہ کرتی؟“ اس نے بہت اعتماد سے پوچھا۔ عدن کو تو شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس کا

گر بیان نہیں پکڑ رہی۔ کوئی سوال نہیں کر رہی۔ اس نے بمشکل سر کو ہلایا۔

”ہاں کرنی چاہیے تھی۔“ اس کی طرف سے پیچھے موڑ کر وہ مخالف سمت میں چلنے لگا۔

”دوبارہ کبھی میرے راستے میں مت آنا۔“ افتی کی آواز اس کے پیچھے آئی۔ اس نے تائید میں سر کو ہولے سے ہلا دیا۔ اب وہ ایک ایسے انسان کی طرح سڑک پر چل رہا تھا، جو نہ کسی میدان کا کھلاڑی تھا، نہ ہی تماشائی۔۔۔ دنیا کے سب ہی کھیل تماشے اس کے لیے ختم ہو گئے۔ بے نام قدم ہی انھیں گے اب۔۔۔ جو کہیں بھی رک جاتے ہیں اور کسی سمت بھی نہیں جاتے۔



ساری رات وہ سڑکوں پر گشت کرتا رہا۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر روتا بھی رہا۔ دراصل اب ہی وہ صحیح معنوں میں خالی ہاتھ ہوا تھا۔ افتی کے اب کبھی نہ ملنے پر اسے اصل دکھ ابھی ہوا۔ وہ اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے۔۔۔ اس پر زیادہ ہوا۔۔۔ ہاں صرف شوہر۔

اس نے اپنی نم آنکھیں دائیں ہاتھ کی تھیلی سے صاف کیں۔ وحشت زدہ پاگل آنکھیں جو صدے اور دکھ میں جامد بھی ہو جاتی ہیں اور تیزی سے پھر پھڑانے بھی لگتی ہیں۔ وہی نفسیاتی دورے کی کیفیت، جو اسے قید کے دوران پڑتے تھے۔

انتارو کر، اتنا پیچھتا کر بھی عدن روز اسٹور کے قریب چلا جاتا۔ دو، چار، چھ دن افتی وہاں آ ہی نہیں رہی تھی۔ عدن کو ہنسی آئی۔ وہ اس سے ڈر رہی تھی۔ ایک ہفتے بعد وہ تھوڑی سی دیر کے لیے آئی اور چلی گئی۔ فاصلہ رکھ کر عدن اس کے پیچھے پیچھے اس کے گھر تک جا پہنچا۔ پھر وہ روز اس کے گھر تک جانے لگا۔ وہ اس کے شوہر کے انتظار میں تھا۔ افتی اکیلی ہی گھر سے باہر نکلتی نظر آتی۔ وہ سمجھ گیا کہ افتی نے اس سے جھوٹ بولا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ کیوں بولا ہے۔ یہ پوچھنے کے لیے وہ اس کے ساتھ ساتھ کالج آ گیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی افتی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا افتی! تم مجھ سے اتنا کترا کیوں رہی ہو؟ میں وہی امان ہوں جو تمہاری جان ہے۔“

عدن نے کالج کی طرف جاتی سڑک پر اسے جالیا تھا۔ افتی نے سختی سے اپنے لب بھینچے اور ایسے ظاہر کیا کہ نہ اسے جانتی ہے، نہ ہی اسے سن رہی ہے اور تیز تیز چلنے لگی۔

”تم اتنا سخت ناراض ہو مجھ سے۔۔۔ میں نے تمہیں فون نہیں کیا، اس لیے۔۔۔ میں حالات میں بھٹس گیا تھا۔ تمہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ تم میری بات تو سنو۔ تم اس طرح منہ موڑ کر کیسے میرے بغیر رہ سکتی ہو۔“

افتی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ شخص کتنے مزے سے اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔

”کیسے حالات؟“ اس نے پوچھا۔

”میں امریکا نوکری کے لیے آیا تھا۔ مجھے اچانک آنا پڑا۔ جہاں اہلائی کیا تھا وہاں سے فوری کال آ گئی تھی۔ تیاری کرنے میں، میں اتنا مصروف ہو گیا کہ تمہیں ایک فون نہیں کر سکا۔ سوچا تھا امریکا آ کر کر لوں گا۔“

”وہ اسپتال تمہارا اپنا نہیں تھا، جہاں تم نوکری کرتے رہے ہو؟“
وہ سمجھ رہا تھا کہ افق کو کچھ نہیں معلوم اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ عزیز سے بھی مل چکی ہے اور آرنیکل بھی بڑھ چکی ہے۔ وہ اسے وہی افق سمجھ رہا تھا جو فیکٹری جایا کرتی تھی۔ ایف اے میں مل ہو گئی تھی۔ کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔

”وہ کسی آغا عباس حیدر کا تھا۔“

”اور وہ آغا عباس حیدر تمہارے سر نہیں تھے؟“ اب عدن کا حلق خشک ہو گیا۔

”ان کی بیٹی۔۔۔ تمہاری بیوی۔۔۔ ماریہ۔۔۔ تمہارے بچپن کی محبت۔“

عدن کے فرشتوں کو بھی گمان ہیں تھا کہ وہ نہ صرف اس کی شادی، بلکہ ماریہ تک کے بارے میں

جانتی ہے۔ وہ اتنا سب کچھ کیسے جانتی ہے۔

”میں اسے چھوڑ چکا ہوں۔“ اسے یہی بات سوچھی۔

”طلاق اس نے لی تھی تم سے۔“ افق کی معلومات زیادہ جامع تھیں۔

”تم اس لیے ناراض ہو کہ میں نے ماریہ سے شادی کر لی؟ پاپا نے زبردستی۔۔۔“

”میری طرف سے تم دنیا میں موجود ہر ماریہ سے شادی کر لو۔“ افق نے مسخراڑایا۔

”روز میرے راستے میں ایسے مت آیا کرو۔ میں اپنے شوہر کو بتا دوں گی۔ میرا شوہر روایتی

پاکستانی بھی ہے اور امریکا کا لاء تو تم جانتے ہی ہو۔ دونوں اگر مل گئے تو۔۔۔“

عدن جس کا شرمندگی سے حلق خشک ہو چکا تھا۔ افق کے اس دھمکی بھرے انداز سے آنکھوں میں

خون اتر آیا۔ اسے دو، دو پیسے کے کام کرتے دیکھا تھا نا۔ ہمارے ملازم۔۔۔ جو تیاں اٹھانے والے۔۔۔

گندے برتن دھونے والے۔۔۔ آواز پر ”جی“ کہنے والے۔۔۔ ترقی کر کے کسی بھی آسمان پر جا

بیٹھیں۔ کسی کے لیے وہ تب بھی ملازم ہی رہتے ہیں۔

”شوہر کو؟“ وہ ہنسا۔ ”کس شوہر کو جو سرے سے ہے ہی نہیں۔ کہاں ہے وہ۔۔۔؟ بلاؤ۔“

افق نے اسے نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اتنی بات کر کے بھی بے وقوفی ہی کی تھی۔ اس کی

طرف دیکھے بغیر وہ آگے بڑھی اور عدن نے اسے آگے بڑھتے دیکھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روکنا

چاہا۔

”میں ہر بار تمہاری جرات معاف نہیں کروں گی۔“ وہ حلق کے بل چلائی۔

”تمہیں میری بات سننا ہی ہوگی۔“ وہ بھی چلایا۔ ”ورنہ میں بار بار تمہارے راستے میں آؤں گا۔

تمہارے گھر آ جاؤں گا۔ تمہیں ایک بار مجھے موقع دینا ہی ہوگا۔“

افق اس سے ڈرتی نہیں تھی لیکن اندری اندر اب ڈر گئی۔ وہ کالج تک اس کے پیچھے آ گیا تھا۔ اب

بار بار آئے گا۔ گھر بھی آ جائے گا۔ وہ نہ جانے کیوں ایسے پاگل ہو رہا ہے۔

اس کی بات آخری بار سننے کے لیے وہ قریب کی کافی شاپ میں آ گئی۔

”تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ گیا تھا۔ بتاؤ، کس کی قسم کھاؤں کہ تمہیں یقین آ جائے۔ میں

نے تمہارے لیے اپنے خاندان کو، پاپا کو بھی منایا۔۔۔ گھر چھوڑنے کی دھمکی دی۔ دو دن ہوٹل میں

رہا۔۔۔ ماما بیار ہوئیں تو ہوئیں پاپا کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ اپنے باپ کے لیے میں اتنا بھی نہ کرتا کہ اس کی مرضی سے شادی کر لیتا؟ کس منہ سے تمہیں فون کرتا؟ سب بتاتا۔۔۔ مجھ پر الزام لگا کر جیل بھیج دیا گیا۔ ماریہ نے طلاق لے لی۔ اس سب میں میرا قصور کہاں ہے؟ میں نے تمہیں بہت یاد کیا افق! بہت۔۔۔ میں نے ہمیشہ صرف تم سے محبت کی۔۔۔ تمہارا کتنا احترام کرتا رہا ہوں میں۔۔۔ اتنے سال میں تمہارے لیے روتا رہا ہوں اور تم ایسے دور جاری ہو۔۔۔ مجھ پر کچھ رحم کرو۔ اتنی بڑی سزا نہ دو۔ میرے پاپا نے زبردستی میری شادی کر دی۔“

افق صرف آخر بار اس کی بات سن رہی تھی۔ تاکہ وہ بار بار اتنی بات کہنے کے لیے اس کے راستے میں نہ آئے۔ اسے کوئی مطلب نہیں تھا کہ وہ جھوٹ اور کتنا بچ بول رہا ہے۔
”میں نے سب سن لیا ہے۔۔۔ ساری باتیں۔۔۔ تم اپنی زندگی میں خوش رہو۔۔۔ اور مجھے میری میں رہنے دو۔“

”تمہارے بغیر میں کیسے خوش رہوں؟“
افق نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔ ”میں اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوں کہ اس نے مجھے فرزام دیا۔“
”مجھے اس کی قسمت پر رشک ہے۔“

”یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
”میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ مت جاؤ۔ تم تو کہتی تھیں کہ تم میرے بغیر رہ نہیں سکتیں۔“
”تب میں بے وقوف تھی۔“ اس نے بہت اعتماد سے کہا۔

”تم اب بے وقوف بن رہی ہو اور مجھے بتا رہی ہو۔ تمہارے اعذار آج بھی میں ہی ہوں۔ ورنہ تم میری مدد نہ کرتیں۔ تمہاری اماں نے زبردستی تمہاری شادی کروادی اور تم مان گئیں۔“
”تمہارے باپ نے تمہاری زبردستی شادی کی اور تم مان گئے۔“ کرنے پر آئی تو کڑے طنز افق کے پاس بھی بہت تھے۔

”میں مجبور تھا افق!“

”میں مجبور نہیں تھی۔ میں چودہ جماعتیں پڑھی، ایک عاقل و بالغ لڑکی تھی اور پورے ہوش و حواس میں فرزام کو تا عمر کے لیے ”ہاں“ کی تھی۔ اپنے منہ سے اس کے عین سامنے ہو کر۔۔۔“
”حالات کے پیش نظر ”ہاں“ کر دی ہوگی۔۔۔ محبت نہیں۔ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ محبت تم صرف مجھ سے کرتی ہو۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتیں۔“ اتنا جانتا تھا وہ افق کو۔ اسی لیے اتنا دور تھا اس سے۔

”ہاں، شاید صرف خالی خولی محبت نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ جذبہ تو اس سے بھی آگے کا ہے۔ میں فرزام کے لیے اپنی جان دے سکتی ہوں ڈاکٹر عدن۔۔۔! اور کسی کی جان لے بھی سکتی ہوں۔“
اس نے ٹھہر ٹھہر کے عین اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اسے اعزازہ ہونا چاہیے کہ افق کتنا بڑا بچ بول رہی ہے۔ خالی خولی دعوائیں۔

عدن تڑپ اٹھا۔ افق کے منہ سے کسی اور کے لیے یہ سن کر اس کا جی اس شخص کو مار دینے کو چاہا۔

”بکواس بند کرو اپنی۔“ وہ چلایا۔ ”جھوٹ مت بولو۔“
 افق نے پروا بھی نہ کی اور قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ پیچھے لپکا۔
 ”تم نے کہا تھا تم میرے بغیر سانس نہیں لیتیں۔ تمہارا دن رات ہوں میں۔ مجھے سوچ کر تمہیں
 نیند آتی ہے اور میں تمہارے سب ہی خواب ہوں۔“
 افق آگے آگے تھی۔ وہ پیچھے پیچھے تھا۔ جو وہ کہہ رہا تھا وہ اسے پاتاں میں گراتا جا رہا تھا۔ وہ اس
 شخص سے اب اور نفرت کرنے لگی۔

”تم مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟“ پلٹ کر وہ چلائی۔ وہ اس کے پیچھے ہی آتا جا رہا تھا۔
 ”فرزام کو چھوڑ دو۔ آؤ، ہم شادی کر لیں افق!“
 افق تھکا بکا رہ گئی۔ کس ہمت اور بے غیرتی سے وہ اسے کہہ رہا تھا یہ سب۔۔۔ اسے چھوڑ جانے
 والا۔۔۔ صفائی سے جھوٹ بولنے والا یہ تو فتح بھی کیسے کر سکتا تھا۔

”تمہارے جیسے دو کوڑی کے انسان کے لیے اسے چھوڑ دوں؟ جس نے ایک امیر باپ کی بیٹی
 سے شادی کر کے مجھے چھوڑ دیا۔ اس شخص کے بیٹے کے ساتھ، جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا۔“
 افق یہ بات کسی کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی عزت کا پردہ تھا۔ اسے وہ چاک کرنا نہیں
 چاہتی تھی۔ لیکن اب عدن کے منہ پر یہ بات ماری ہی پڑی۔ آخری بات سن کر عدن سناٹے میں رہ گیا۔
 ”تمہارا کمینہ باپ۔۔۔ موچھوں والا گدھ۔۔۔ جب اپنی ماں کے علاج کے لیے تم سے مدد
 لینے تمہیں ڈھونڈنی میں وہاں گئی۔۔۔ تو اس نے میرے آگے پیسے پھینکے اور میری عزت پر ہاتھ
 ڈالا۔۔۔ تمہارے باپ نے میرے سامنے تمہیں فون کیا تھا۔ تم اور ماریہ جب ہنی مون پر تھے اور تم
 چاہتے ہو کہ اب بھی میں تمہارے جیسے انسان کا احترام کروں؟ تم سے بات کروں؟“

”ہونہ۔۔۔ اسفید جھوٹ، سر اسر الزام۔“ وہ الٹا بدک گیا۔ اگر حالات دوسرے ہوتے تو وہ
 گدھ کہنے اور ایسے الزام لگانے پر اس کی گردن دبا دیتا۔

”یہ تم اپنے باپ سے جا کر پوچھو۔ پاں، میری وجہ سے تم باہر کھڑے ہو اس وقت۔ شاید اللہ
 میرے ہی ذریعے تمہیں باہر لانا چاہتا تھا۔ جو تم سے مدد لینے کے لیے گئی تھی، اسی کے ذریعے۔ جا کر بتاؤ
 اپنے باپ کو، یہ افق ہے جس نے تمہاری مدد کی ہے۔ عزت بچا کر بھاگ جانے والی کے ہاتھ سے مدد کا
 یہ پتھر بہت زوردار ہے۔ یہ تھپڑ تم دونوں کو بہ یک وقت لگا ہے۔ بہت پاگل بنالیا تم نے مجھے۔ بہت ذہین
 نہیں ہوں لیکن تم سے اب ہمیشہ دور ہی رہوں گی، اتنی سمجھ دار تو ضرور ہوں۔“

افق چلی گئی۔ عدن بت بنا وہیں کھڑا رہا۔ ماں اور باپ، صرف یہ دوا ایسے رشتے ہیں کہ کتنے بھی
 گناہ گار ہوں، اولاد کسی تیسرے کے منہ سے ان کے گناہ نہیں سن سکتی۔ اپنے باپ کو افق کے بارے میں
 بتا بھی چکا تھا۔ پھر بھی اپنے بیٹے کی پسند کے ساتھ۔۔۔ افق کے ساتھ۔۔۔ فون بوتھ سے اس نے فون
 کیا۔

”افق آپ کے پاس آئی تھی کبھی؟“
 ”کون افق؟“ لمحہ بھر کے تامل کے بعد کہا گیا۔

”جس کی عزت پر آپ نے ہاتھ ڈالا تھا۔۔۔ جو میرا پوچھنے ڈی ایچ اے والے بنگلے میں آئی تھی۔“ آخر حد پر تھا گل کی۔

”کیا بکواس ہے یہ؟“

”ہاں، نہ میں جواب دیں۔“ تن کر کہا۔

”بکواس بند کرو گدھے۔۔۔ اپنے باپ پر الزام لگا رہے ہو؟“

”اسی افق نے بوٹن میں مجھے اس سیل سے آزاد کروایا ہے، جہاں زمین پر میں نے ایڑیاں رگڑی

ہیں اور دیواروں سے سرکرایا ہے۔ اس۔۔۔“

”کیا یک رہے ہو؟“ فون بند ہو گیا۔ عدن جان گیا۔ افق سچ کہہ گئی ہے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ وہ

اپنے باپ کی سرکریوں سے واقف نہیں تھا۔ لیکن اسی لڑکی کے ساتھ، جس کا ذکر وہ ان سے کر چکا تھا۔

اسی کے ساتھ یہ سب کچھ۔۔۔ عزیز کے ہاتھوں جب وہ بار بار پیغام بھیجتا تھا کہ افق کے گھر جائیں۔

اسے عدن کے بارے میں بتائیں تو اسے ایک ہی جواب ملتا تھا کہ وہاں کوئی ایسا گھر نہیں ہے۔ نہ ہی

وہاں کوئی افق رہتی ہے۔

وہاں کوئی گئیابی نہیں تھا۔ اس کا باپ کس منہ سے وہاں جاتا۔۔۔ زندگی کے اس حصے میں باپ

نام کا بھرم رکھے اس شخص کی عزت بھی اس کے اندر سے گئی۔ تو اب سب کچھ چلا گیا عدن کے پاس

سے۔۔۔ عدن خالی ہاتھ رہ گیا۔ اس سے اچھا تو وہ امریکی سیل میں ہی تھا۔ سری پھوڑتا ہے تو آزادی

میں ہی کیوں۔ پاگلوں کی طرح اس نے ایک ہی سڑک کے دس چکر لگائے۔ بڑبڑاتا رہا۔

اب اس کے پاس کچھ نہیں بچا۔۔۔ جو بچا تھا، اسے چھین لیا گیا۔ اب اسے زندہ رہنا ہے تو صرف

اپنی مرضی کے ساتھ۔ اپنے من پسند لوگوں کے ساتھ۔



چند دن وہ عزیز کے ساتھ مقدمے کی سماعت میں مصروف رہا۔ چند اخبار والوں نے اس کے تفصیلی

انٹرویو بھی لیے۔ عزیز اسے اپنے ساتھ چند دوسرے اداروں میں لے کر گیا، جو مزید اس کی مدد کر سکتے

تھے۔ وہ ہفتے سے کچھ زیادہ دن مصروف رہا۔ فارغ ہوتے ہی اس نے افق کی نگرانی شروع کر دی۔ اب

وہ گھر سے کم ہی باہر نکلتی تھی۔ لیکن جب بھی نکلتی، فرزام ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ اسے فرزام کے آنے کا انتظار

تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک دن افق بہت بن ٹھن کر ایئر پورٹ گئی۔ اسے وہ شخص دیکھنا تھا، جس کے لیے وہ

جان لے بھی سکتی ہے تو اس کا خیال تھا کہ پھر یہ ”جان“ لینا فرزام کی ہی سہی۔ فرزام کی جان لے لینی

چاہیے۔

اسی دن شام کو وہ دونوں اکٹھے باہر نکلے۔ وہ ان کے پیچھے ہی تھا۔ بس ایک بار اس نے انہیں ایک

سڑک سے گم کر دیا تھا۔ دو گھنٹے وہ انہیں نیو بری میں ڈھونڈتا رہا۔ جب وہ اسے دوبارہ نظر آئے تو دونوں

آمنے سامنے کھڑے ہنس نہں کر باتیں کر رہے تھے۔

فرزام کی جان نکالنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ وہ ان دونوں کے پاس چلا گیا تھا۔

تھپڑ مار کر اس کا گریبان جھنجھوڑی تھی۔ ”تم نے میرے ساتھ یہ کیوں کیا؟ اتنا جھوٹ بولا؟ میں

نے تمہاری مدد کی۔“ وہ ساتھ ساتھ رو رہی تھی۔

”تم نے میری مدد نہیں کی۔ تم ہی نے کہا تھا کہ تم نے میرے باپ کے منہ پر تھپڑ دے مارا ہے۔ اس تھپڑے کے بارے میں میں نے انہیں بتا دیا ہے۔“ خود کو اس کے ہاتھوں سے چھڑوا کر اس نے اطمینان سے کہا۔

”تم نے ایک بار پھر میرے ساتھ برا ہی کیا نا۔۔۔ تمہاری مدد کر کے میں نے خود اپنے ساتھ برا کیا۔“

”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا افق! چھوڑ دو اسے۔۔۔ تم صرف مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں ہوں تمہارا امان۔“

ایک اور تھپڑ سے اپنا ہاتھ روک کر افق اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف بھاگی۔ فرزام کا فون بند جا رہا تھا۔ پہلے جب اس نے کہا تھا تو ایک بیل گئی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھی وہ مسلسل اسے فون کر رہی تھی۔ اب وہ اسے سب سچ بتا دے گی۔ اسے چھپانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ ناراض ضرور ہوگا۔ لیکن مان ہی جائے گا۔ بات بگڑ گئی تھی تو سنبھل بھی جائے گی۔

دروازہ کھول کر وہ اندر آئی تو ہر طرف اسے فرزام کا غصہ بکھرا نظر آیا۔ شاپنگ بیگز ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ جیسے ایک ایک کو اٹھا کر پھینکا گیا ہے۔ سارے جوتے، بیگز، کوٹ، کپڑے، شیشے، کچھ چیلری، ادھر ادھر بکھری پڑی تھی۔ گل دان بھی ٹوٹا ہوا تھا۔

”فرزام۔۔۔!“ وہ لپک کر اس کے پاس آئی۔ وہ ڈانٹنگ ٹیبل پر سر رکھے بیٹھا تھا اور ایسے بیٹھا تھا جیسے کہیں سے بے عزت کر کے نکالا گیا ہو۔ اس نے سر اٹھا کر ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔

”مجھے وہاں اکیلا چھوڑ آئے۔ مجھے سنتے تو سہی۔“ راستے بھر وہ روئی آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پھر سے رونے لگی۔

”لے لی تم نے اس کی ٹریٹ؟ کیسا رہا ڈنر؟“

”بکواس کر رہا تھا وہ۔“ وہ چلائی۔ ”جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے نہ بتا کر غلطی کی۔ اب نہیں کروں گی۔“

فرزام اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھا۔ جیسے اسے سن ہی نہیں رہا۔

”پلیز میرا بات سنو فرزام! میں نے مان لیا کہ میں نے غلطی کی۔ میرا یقین کرو۔ میں سب بتا دیتی ہوں۔“

”سن آیا ہوں۔ تم نے اس کی مدد کی۔“

”ویسے نہیں۔۔۔ جیسے آپ سمجھ رہے ہیں۔“

”پھر کیسے؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ کہاں ہے؟“ وہ ایسے جرح کر رہا تھا جیسے مقدمے کا فیصلہ تو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اب تو صرف وہ ایسے ہی سوال کر رہا ہے۔ ”تم اسے بھولیں نہیں؟ تم نے اسے ڈھونڈ نکالا۔“

اس نے صرف نفی میں سر ہی ہلایا۔ اتنے سے ہی سوالوں پر اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ بات اتنی بھی

آسان نہیں رہ گئی۔ اب اس یقین پر جواب دے دینے پر بھی کامل نہیں ہوگا۔ سرتیزی سے نفی میں ہلتا رہا۔

”ایسا نہیں ہے فرزام!“ آواز اور بھیگ گئی۔

”پھر کیسا ہے؟ کیسے ہوا یہ سب؟“

”میں نے میگزین میں اس کے بارے میں پڑھا تھا۔“ وہ جانتی تھی۔ اس سلسلے میں پوچھا گیا اگلا سوال تھوڑے سے بچے کے لیے یقین اور اعتماد کی بھی موت کر دے گا۔

”پھر۔۔۔؟“ اس کے لیے پہلی بار فرزام کا انداز سخت تر ہو گیا۔ اس ”پھر“ کا جواب تو وہ خود نہیں جانتی تھی۔ اس ”پھر“ کا جواب ہی اسے لے ڈوبے گا۔ یہ ”پھر“ بہت الجھا ہوا تھا۔

”میں اس کے وکیل کے آفس گئی۔“ اس کی آواز ٹک گئی۔ حلق خشک ہو گیا۔ الفاظ سارے غائب ہو گئے۔

”تمہیں اس کے وکیل کا کیسے معلوم ہوا؟“

”میں نے سرچ کیا تھا۔“ شرمندہ سے وہ اور شرمندہ ہو گئی۔

”اوکے۔۔۔۔۔“ یہ اوکے بہت جان لیوا تھا۔

”تم آفس کیوں گئیں؟“ وہ سوال کر رہا تھا۔ وہ اپنا اور اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

پاگل تھی جو گئی۔ خود نہیں جانتی تھی۔ اب بتا اور سمجھا نہیں سکتی تھی۔

”میں پاگل تھی فرزام! جو چلی گئی۔ خدا جانتا ہے۔ میں بنا کسی وجہ کے گئی۔ وکیل نے میری بہت منت سماجت کی۔ مجھے اکسایا۔ انسانیت کے واسطے دیے۔ مسلمان ہونے کا کہا۔“

”تم نے انسانیت کے ناطے یہ سب کیا؟“ وہ بظاہر بہت اطمینان سے یہ سب پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میرا یقین کرو۔ حالات ایسے۔۔۔۔۔“

”لاکھوں لوگ جیلوں میں بند ہیں۔ پاکستانی، مسلمان، انسان بھی۔“

”مجھے معاف کر دیں فرزام!“ اس کے پاس فرزام کے ایسے سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ سوال کے نام پر اب اس کے پاس مانگنے کے لیے صرف معافی ہی تھی۔

”تم کس دن آفس گئیں؟“

”جس دن آپ کا میسج آیا تھا کہ گھر سے باہر نہ جانا۔“ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ جتنے بھی سچ بول رہی تھی۔ وہ حیثیت میں دو کوڑی کے بھی نہیں تھے۔ ایک سچ جو جج کے سامنے بول کر کسی کو چھائی سے بچا لیتا ہے۔ اگر بروقت نہ بولا جائے تو بعد ازاں بے شک ساری دنیا کے سامنے بلند وبا نگ بولا جائے۔ پھر وہ سچ صرف ایک گونج، ایک اعلان ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

”مجھے معاف کر دیں فرزام۔۔۔! میں نے اتنا کچھ چھپایا۔۔۔ میرے اور اس۔۔۔۔۔“

”معاف کیا۔“

اسے درمیان میں ہی ٹوک کر وہ خود اٹھ کر بیڈروم میں چلا گیا۔ دروازہ لاک کر لیا۔ لمحوں میں ہی اس نے اس دن سے اب تک کی ساری فلم آنکھوں میں چلائی۔ اس کے سارے جھوٹ فرزام کے کانوں

کونسا دے گئے۔ افق لاؤنچ میں کھڑی رہ گئی۔ گھٹنے ٹیکنے والا مرد مقفل ہو کر اکیلا ہی بیٹھ گیا۔ اٹوٹھی نہ جانے کہاں گئی۔ ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر۔۔۔ یا اس گھر کی۔ پہلی بار افق نے اپنی قسمت کو کوسا۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ رونے لگی۔ فرزام کی جگہ کوئی بھی ہوتا، وہ یہی کرتا۔ شاید اسے سر راہ ہی پھڑمادیتا۔ گھر سے نکال دیتا۔

عدن نامی دبا اسے ہمیشہ ناکام کروادیتی تھی۔ آج وہ فرزام کے آگے بھی فیل ہوگئی۔ اگلے دن وہ صبح ہوتے ہی چلا گیا۔ وہ گھر میں ہی اس کا انتظار کرتی رہی۔ ابھی وہ غصے میں ہے۔ اس سے بہت ناراض ہے۔ وہ مان ہی جائے گا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ رات گئے وہ آیا اور سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ اس نے کوشش کی بات کرنے اور کمر اکھلوانے کی مگر نہ اس نے بات کی، نہ ہی کمر اکھلا۔ آنے والے چند اور دن بھی ایسے ہی چلتا رہا۔ پیرس جانے والا جوڑا اور خریدی گئی اتنی ساری چیزیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ وہ سارا وقت رونی رہتی۔ دونوں کے درمیان وقت اور حالات کی جو خلیج تھی اور جسے دونوں ہی جانتے تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ ختم کر رہے تھے۔ وہ خلیج ایک دم ہی پھیل کر انہیں بہت دور لے گئی۔ اب جب وہ اس کے قدموں میں بیٹھنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کچھ غلطیاں نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ کچھ غلطیاں لے ڈوبتی ہیں اور کچھ پکچل کر ملیا میٹ کر دیتی ہیں۔ عدن یہ تینوں غلطیاں تھا اور یہ تینوں افق سے ہوتی تھیں۔ اس کے باپ کو پہچان لینے پر بھی وہ اس کی خصلت کو نہیں جان سکی۔ آخر خون تو ایک ہی تھا۔ وار کر دیا نا عدن نے اس پر۔ ایسا وار کہ اس کی جان ہی نکال لی۔

اگر انسانیت کے نام پر اسے یہ سب کرنا ہی تھا تو فرزام سے کیوں چھپایا؟ یہ غلطی اسے ملیا میٹ کر چکی تھی۔ اب اسے وقت کا ہی انتظار تھا کہ فرزام اس پر یقین کر لے۔ جس کمپنی کے ساتھ وہ کینیڈا کام کر کے آیا تھا اسی کی ایک اشترا کی کمپنی میں وہ کام کرنے لگا۔ آفس کے پہلے دن جو اسے پھولوں کے بکے ملے اسے اس نے ٹیبل پر پٹخ دیا۔ سارے منصوبے خاک ہو گئے۔ دو ماہ کی لمبی چھٹی اور یورپ کی سیر۔۔۔ صرف اس کی پیاری بیوی افق اور ساتھ صرف وہ۔۔۔

افق نے کالج جانا چھوڑ دیا۔ اسٹور جانا بھی چھوڑ دیا۔ وہ اس حالت میں ہی نہیں تھی کہ کہیں جاتی۔ سارا دن لفظ جوڑتی رہتی اور فرزام کی طرف نظر اٹھتے ہی اس کا دم نکل جاتا۔ وہ اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کی طرف دیکھتا نہیں تھا۔ ناشتا کر کے نہیں جاتا تھا۔ گھر آ کر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ رات رات بھر افق رو، رو کر دعائیں کرتی رہتی۔ وہ فرزام کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن وہ فرزام کے ساتھ ایسے بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اسے وہ بتا نہیں سکی کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتی ہے۔ دونوں ایک ہی راستے پر ایک ساتھ چلتے چلتے ایک دوسرے کی پشت پر آ گئے۔

ایک روز وہ حسب معمول رات گئے آیا تو اس نے آتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
”خدا کے لیے میرے ساتھ ایسے نہ کرو فرزام! مجھے مارلو، برا بھلا کہو، لیکن ایسے نہ کرو۔“
سارا دن بھی وہ رونی رہی تھی۔ اس کے سامنے بھی رو رہی تھی۔

اس نے جھپکے سے اپنا ہاتھ اس سے آزاد کر دیا۔

”اور تم نے میرے ساتھ کیا کیا، افق! تم نے مجھ سے سب کچھ چھپایا۔ جھوٹ پر جھوٹ بولا۔ کئی بار میں نے تم سے پوچھا۔ تم ٹھیک ہو۔ تم یہی کہتی رہیں کہ تم ٹھیک ہو۔ ان دنوں تم اس سے مل رہی تھیں نا؟ چھپ کر اتنا کچھ کر رہی تھیں۔“

”میں اس سے نہیں ملتی تھی۔ وہ میرے راستے میں آتا تھا۔“
 ”کیوں اس شخص کے لیے تم اس ویل کے آفس جا پہنچی تھیں۔ مجھے یقین دلاؤ افق! تم بنا کسی وجہ کے گئی تھیں۔ تم اس شخص عدن کے لیے نہیں گئیں۔ ابھی تک وہ تمہارے اندر رہے۔“
 ”میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔۔۔ میرا یقین کرو۔“

”ہاں مجھے یقین دلاؤ افق! میں یقین کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا ہی تو یقین کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن تم نے اس یقین کا بہت غلط استعمال کیا۔ تم نے میرا اعتماد تار تار کر دیا۔ اتنے سال سے میرے ساتھ ہو۔ مجھے جان نہیں سکیں۔ تم نے مجھ سے اتنے جھوٹ بولے۔ جس نے شادی سے پہلے ہر کڑوے سچ کو سن کر بھی تمہیں اپنا یا۔ اگر تمہیں اس شخص سے نفرت ہوتی تو تم اس میگزین کو ہی پھاڑ کر پھینک دیتیں۔ یہ ہوتی تمہاری نفرت۔ اپنے قدم باہر کی طرف بڑھانے سے پہلے تم میری طرف آئیں۔ سالوں پہلے میں نے ہزاروں بار یہ شکوہ کیا تھا کہ کس قوت نے مجھے برطانیہ سے نکال باہر کیا۔ تم سے شادی کرتے ہوئے مجھے اس قوت پر بہت پیار آیا۔ میں نے لاکھوں بار شکر ادا کیا کہ مجھے افق کے لیے بروقت وہاں سے نکال دیا گیا۔ رومی سے دور کر دیا گیا۔ آج مجھے یقین ہوا افق! کہ مجھے تو تم سے میرے ناکردہ گناہوں کی سزا دینے کے لیے ملوایا گیا ہے۔ جس کے بعد میں کسی اور قابل ہی نہ رہوں۔ بس تم ہی میرا یہ انجام ہو۔ ہر خواب کی اجڑی تعبیر۔۔۔ زندگی میں جس تباہی سے میں بچتا رہا، اس تباہی کو خود اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ مجھے یقین دلاؤ افق! تم اس شخص سے نفرت کرتی ہو۔۔۔ اور یہ سب کچھ تم نے نفرت میں کیا؟ اب نہ جانے یہ وقت کتنا وقت لے گا۔ پھر سے محبت کے لیے۔“
 فرزام چلا گیا۔ افق کھڑی رہ گئی۔

اب اکثر وہ اسے آن لائن رومی سے بات کرتا نظر آتا۔ افق نے چھپ کر عدن سے بات کی تھی۔ وہ سامنے کرتا تھا۔ مسٹر فرزام کے گھر میں مسٹر فرزام اجنبی ہو گئیں۔ دنیا کے ہر کام سے افق کا دل اچاٹ ہو گیا۔ ایک فرزام کے علاوہ اسے کسی کی فکر نہ رہی۔ ایک اسی کے علاوہ اسے کوئی دکھ نہ رہا۔ اس کی سب سے بڑی خوشی اس کے لیے سب سے بڑا غم بن گیا۔

وہ آفس سے جلدی آ گیا۔ اسے آواز دے کر سامنے صوفے پر بٹھایا۔ دونوں کے درمیان آواز دے کر بلانے اور ایسے موقع پر آنے سامنے بیٹھنے کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ وہ اس کی شکل کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی طرف دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ کانوں میں انگلیاں دے لے۔

”میں کاغذات بخوار ہا ہوں۔۔۔ اسلامک سینٹر گیا تھا۔“

”کیسے کاغذات؟“ اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”طلاق کے۔۔۔“ کتنے آرام سے اس نے کہہ دیا۔ نہیں اتنے آرام سے بھی نہیں کہا۔ قیامت

دونوں طرف ہی آئی تھی۔



وہ اس سے ناراض تھا۔ بلاشبہ۔ بہت ناراض تھا۔ لیکن آج عدن اس کے آفس میں آیا تو اس نے وہ ناراضی بھی چھوڑ دی۔

”کیوں آئے ہو؟“ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اور معدوم ہو گئی۔
”اتفاق کے لیے۔“

”بکواس بند کرو۔ تمیز سے بات کرو۔ بیوی ہے وہ میری۔“ فرزام کا توجہ چاہ رہا تھا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے۔ ورنہ اس کا گلا ہی دبا دے۔

”بیوی وہ تمہاری ہے۔ لیکن محبوبہ وہ صرف میری ہے۔ وہ آج بھی صرف مجھ سے محبت کرتی ہے۔“

”اسے تم بے وقوف بنا کر بھاگ گئے۔ اب پھر سے آ گئے ہو۔“

”بے وقوف تو تم ہو۔ جو اس کے ساتھ تعلق کا رشتہ سمجھ رہے ہو۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اس نے صرف میرے لیے ناممکن کو ممکن کر دیا۔ میں پچھلے پانچ، چھ سال سے جیل میں تھا۔ مجھے میرا قابل وکیل اور امیر کبیر باپ بھی آزاد نہیں کروا سکے۔ لیکن اتفاق نے کر دکھایا۔ یہ ہے اس کی محبت کی طاقت۔ وہ بہت قابل لڑکی ہے۔ کس کس سے جا جا کر ملی۔ میرے لیے درخواستیں دیں۔ صحافیوں سے ملی۔ پاکستانی کمیونٹی سے واک کروائی۔ اتنی بڑی این جی او کو میرے لیے فعال کر دیا۔ کون کون آ کر وہاں مجھ سے نہیں ملا۔ اس نے این جی او کو فنڈز بھی دیے۔ یہ سب کیوں کیا اس نے؟ کس لیے؟ وہ میرے بغیر سانس نہیں لیا کرتی تھی۔ ایک بار پاکستان میں بھی جیل چلا گیا تھا۔ روڈ پر بیمار ہو گئی تھی۔ وہ رات رات بھر دعاؤں کرتی تھی میرے لیے۔ اس وقت وہ میرے لیے دعا کر سکتی تھی۔ اس بار اس نے سب کر دکھایا۔ کیا یہ کم ہے سمجھنے کے لیے کہ وہ مجھ سے کس قدر محبت کرتی ہے؟ اتنے سال اس نے میری کشدگی کا ہی سوگ منایا ہے۔ میری زبردستی شادی کر دی گئی تھی۔ اپنے باپ کی بیماری کے ہاتھوں میں مجبور تھا۔ تمہارے لیے اسے کبھی نہ چھوڑتا۔ وہ تو نہ ہنسی ہوگی، نہ ہی روئی ہوگی۔ زندگی کو مرمر کر گزارا ہوگا۔ تم اسے کبھی نہیں جان سکتے۔ اس کے اندر کا بھید نہیں پاسکتے۔“

خاموشی کا وقفہ اس نے اپنی مرضی کا لیا۔

”اور نہیں تو اتنا ہی سوچ لو کہ اس جیسی شریف لڑکیاں محبت کے کھیل بار بار نہیں کھیلتیں۔۔۔ یہ وہ لڑکیاں ہوتی ہیں، جو پہلی محبت کا جو پودا اپنے اندر لگا لیتی ہیں، اسی کے نیچے اپنی قبر بنالیتی ہیں۔ اسے اکھاڑ کر نہیں پھینکتیں۔ حالات سے مجبور ہو کر اگر اس نے شادی کر بھی لی تو۔۔۔ کیا وہ تم سے محبت بھی کرنے لگی؟ اگر کہہ بھی دیا ہوگا۔۔۔ جیسا کہ مجبور مشرقی لڑکیاں کہہ ہی دیتی ہیں۔۔۔ تو کیا وہ سچ سچ کرتی ہے؟ اپنی ماں کی وجہ سے تم سے شادی کر لی ہوگی۔۔۔ یا سہارا چاہیے ہوگا۔ اس کا تو کوئی بھائی بھی بڑا نہیں تھا۔ تمہیں اس نے سہارا بنالیا۔ لیکن جان ابھی تک اس کی میں ہی ہوں۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میرے بارے میں جانا تو باز نہیں رہ سکی۔ دیکھو، ہمارے تعلق کی مضبوطی کی وہ میری طرف بھاگی آئی۔

عقل سے کام لو، اسے چھوڑ دو۔۔۔ اسے مجبور نہ کرو۔۔۔ اپنی اماں یا تمہارے کسی احسان کی وجہ سے وہ تو شاید تم سے نہ کہے۔ ایسے ہی مجبوری سے تمہارے ساتھ بندھی رہے۔ آزاد کر دو اسے اور پھر دیکھو کہ کیسے بھاگی آتی ہے میرے پاس وہ۔۔۔ وہ مجھ سے یہاں بار بار چھپ چھپ کر ملتی رہی ہے۔ تب تم یہاں نہیں تھے۔ اس نے تمہیں بتایا کہ میں نے اس کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے؟ چلو، میرے ساتھ اس کا پی شاپ پر جہاں اس نے کافی پی تھی۔ کوئی ایک آدھ تو تمہیں ضرور بتا دے گا کہ وہ میرے ساتھ وہاں جاتی رہی ہے اور کتنی باتیں بتاؤں کہ تم یہ یقین کر لو کہ وہ میرے لیے بنی ہے۔ تمہارے لیے نہیں اسے آزاد کر دو۔“

فرزام گم صم اسے سنتا رہا۔۔۔ سنتا رہا۔ دنیا کو کوئی بھی مرد ہوتا، وہ عدن کو سنتا۔ عدن کا یقین کرتا۔ اتفاق پر شک کرتا، اپنی قسمت پر روتا۔۔۔ اور نہیں تو اس سارے نقصان پر، اس سب پر خودکشی تو ضرور ہی کر لیتا۔

وہ سب سنتے سنتے فرزام کہیں کا نہ رہا۔ وہ شخص اپنی مرضی سے بول کر چلا گیا۔ وہ فاتح تھا۔ آیا اور چلا گیا اور فرزام شکست خوردہ وہیں پڑا رہا تھا۔ اس نے ماں کو فون کرنا چاہا۔ گلا بھڑا کر رونا چاہا۔۔۔ نہ فون کر سکا، نہ ہی روسکا۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور وہ۔۔۔ وہ عدن سے۔۔۔ پہلی محبت۔۔۔ مشرقی عورت۔۔۔ ٹھیک کہا اس نے۔ اتفاق جیسی لڑکی محبت کا کھیل نہیں کھیلتی۔ محبت ایک ہی کرتی ہے اور اسی محبت میں خود کو دفن دیتی ہے۔

اس سے متاثر ہوتے۔۔۔ اس کے قریب آتے۔۔۔ اس سے محبت کرتے۔۔۔ فرزام عین وقت پر لٹ گیا۔ اب وہ کسی پل سے چھلانگ لگا دینے کے ہی قابل رہ گیا تھا بس۔۔۔ اب ایسے انجام کے ساتھ وہ کیسے زندگی جیے گا۔ کسی کو بناتا ہے وہ آفس سے چلا آیا۔ مجبوری کے ان دونوں کے رشتے کو اسے ختم ہی کر دینا چاہیے۔

وہ ناراض ہے۔ وہ مان جائے گا۔ لیکن وہ تو طلاق کی بات کر رہا ہے۔ وہ اس انگوٹھی کے انتظار میں تھی، جو جلد ہی دوبارہ اسے پیش کی جائے گی اور وہ اسے باہر کا راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ اس قدر پتھر دل ہو چکا ہے اتفاق کے لیے۔ اتنا متفر۔ اس کے جسم پر چونٹیاں لوٹ کھسوٹ کرنے لگیں۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

فرزام نے اس کے ایسے دیکھنے پر اسے نظر اٹھا کر دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دو مختلف نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظر میں وہ روٹ گھوم رہا تھا جو صرف کام کرتا تھا۔ نہ ہنستا تھا۔ نہ بولتا تھا۔ نہ ہی زندگی میں زندہ تھا۔ وہ اندر باہر سے مردہ ہو چکا تھا۔

اتفاق کی نظر اس فرزام پر تھی جس کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت کا سمندر تھا اور جواب آنکھیں بدل رہا تھا۔ اب وہ شاید روی کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ اس کا یقین ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنی زندگی میں رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ فرزام نے سچ مان ہی لیا تھا کہ انارکلی بازار میں شادی کا سن کر بت بن جانے والا وجود عدن کی محبت کا سوگ ہی منارہا تھا۔ وہ بھول گیا کہ نیو بری میں اس کے ساتھ وہ کس قدر خوش تھی۔ اس نے مان لیا تھا کہ وہ اس وقت وہ خود بہلا چکی تھی۔ وہ ایک پہلی ہوئی زندگی

گزار رہی تھی۔ ایک سمجھوتے کی زندگی۔

”مجھے طلاق دے رہے ہو؟“ صرف سوال نہیں تھا۔

”تمہیں اور کیا چاہیے؟ تمہیں عدن ہی چاہیے نا۔۔۔ تو تم آزاد ہو۔“

واقعات اتنے معمولی اور عام بھی نہیں تھے۔ جتنا کہ بظاہر نظر آرہے تھے۔ کوئی شخص سر بازار کسی دوسرے کی بیوی کا ہاتھ پکڑ لے اور کہے کہ یہ مجھ سے چھپ چھپ کر ملتی ہے تو یہ بات اتنی عام بھی نہیں رہتی۔ کوئی ایسے ہی کسی کی بیوی پر بات نہیں کرتا۔ صاف دل کے، بڑے دل کے شوہر اگر غصہ پی بھی جائیں تو دلوں میں بال ضرور آجاتے ہیں۔ شک اور دوسوہ تو شیطان کا پسندیدہ ہتھیار ہے۔ جسے وہ ہمیشہ اٹھائے رکھتا ہے اور تاک کر موقع سے انسان پر وار کرتا ہے اور زہر پھیل کر کس کس تک چلا جاتا ہے۔ تو یہ وار فرزام پر بھی کام کر گیا۔ تب ہی اس کا انداز ہر خند تھا۔۔۔ جان لیوا تھا۔

”مجھے فرزام چاہیے۔“ پانی افق کے سر پر سے گزر چکا تھا۔ اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ فرزام کی زندگی سے نہ وہ جانے کی نہ ہی اسے جانے دے گی ہر کام کو پھرتی اور دل جی سے کرنے والی افق، فرزام پر اپنی ساری جان لگا دے گی۔ جو ہو رہا ہے، اسے ہونے نہیں دے گی۔

”وہ مسخر سے ہنسا۔“ یہ فرزام تمہارے پاس پچھلے تین سال سے ہے۔ کبھی تم اس کے پاس آئیں؟ اس فرزام سے تمہارا دل بہل رہا تھا۔۔۔ بس تمہیں ایک سہارا مل گیا تھا۔ ”مگرم کی بھوسی میں جیسے آگ لگتی ہے اور بجھتی نہیں۔ ایسے ہی فرزام میں عدن آگ لگا گیا تھا اب یہ آگ بجھ نہیں رہی تھی۔“

”نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔۔ یہ غلط ہے۔“

اس نے اس کی بات کو درمیان میں ہی اچک لیا۔

”تم اپنے لیے آنے والے ہر رشتے کے لیے انکار کر دیتی تھیں۔ تم نے تک آکر مجھے ہاں کہہ

دیا۔“

”یہ غلط ہے فرزام! یہ زیادتی ہے میرے ساتھ۔۔۔ یہ جھوٹ ہے۔ تک آکر نہیں۔۔۔“

”پھر کیا تمہیں مجھ سے محبت تھی؟“

”محبت تو ہم دونوں کو ہی نہیں تھی نا۔ ہم نے ایک دوسرے کو جان کر ہی ہاں کی تھی۔ میں نے سب سچ بتا دیا تھا۔ میں تب نہیں کرتی تھی۔ مگر اب بہت محبت کرتی ہوں فرزام!“ اس نے ایسے وقت میں اپنی محبت کا اعلان کیا۔ جب اسے کوئی وقعت ہی نہ دی گئی۔

”کب کی تم نے مجھ سے محبت؟ میرا تمہارا محبت کا معاہدہ نہیں تھا ایمان داری کا تو تھا۔ مجھے تم اچھی لگیں۔ تمہاری شرافت، تمہارے کام، تمہارے اصول۔۔۔ بہت متاثر تھا میں تم سے۔ میرا ایمان تھا کہ صرف ایک افق جیسی لڑکی میری زندگی کو تباہ نہیں کرے گی۔ میں نقصان میں نہیں رہوں گا۔ میں بہت خوش نہ رہا تو ناخوش بھی نہیں رہوں گا۔ تمہارے جس حسن پر دنیا مارتی ہے نا۔۔۔ اس پر میں نے کبھی نظر نہیں ڈالی تھی۔۔۔ جو حسن تمہارے اندر تھا، اس پر میری نظر تھی۔ گزرے سالوں میں، میں نے رومی کو یاد کیا۔ تاکہ مجھے یاد رہے کہ مجھے رومی جیسی غلطی دوبارہ نہیں کرنی۔ تمہارے یہاں۔۔۔ نے سے پہلے مجھے بہت بار اس کے فون آئے لیکن اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں اس سے بات کرنا میں نے گوارا نہیں کیا۔“

آنسو کا گولہ اس کے حلق میں اٹکا۔

”تم سے متاثر ہوتا میں تمہارا مقید ہو گیا۔ تمہارے بغیر رہنا محال ہو گیا۔ پہلے تمہیں پرکھ رہا تھا پھر تمہارے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن صرف تمہارے لیے کہ تم ماضی کے ہر طرح کے دکھ سے باہر نکل آؤ۔ تم اتنی مستحکم ہو جاؤ کہ تم۔۔۔ تمہیں مجھ تک آنے میں کوئی مسئلہ نہ پیش آئے۔ اس الٹ پلٹ میں، میں کہیں کا نہیں رہا۔ جس خوف سے بچتا رہا اسی سے محبت کرنے لگا۔ قسم کھائی تھی میں نے کہ کسی عورت پر یقین نہیں کروں گا۔ بہت یقین کیے تھے میں نے رومی پر۔۔۔ قسم توڑی اور نقصان بھی خود ہی اٹھایا۔“ جسے انگوٹھی پہنانا تھی، وہ تقریباً رو رہا تھا۔۔۔ جسے تالیاں بجوانا تھیں، وہ سن کر سن ہو رہی تھی۔

”تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا افق؟ دل میں اسے چھپائے تم میرے ساتھ رہیں۔

دور۔۔۔ دور۔“

”میں تم سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ بار بار یہی کہوں گی، باقی باتیں حالات نے پیدا کر دی ہیں۔ بظاہر وہ سچ ہیں۔۔۔ پردہ۔۔۔ وہ جھوٹ ہیں۔ صرف ایک بار میرا یقین کرو۔۔۔ میرے ڈر نے مجھے دور رکھا۔ مجھے محبت کرنے سے ڈر لگتا تھا۔“

”محبت سے نہیں افق! کسی اور کے ساتھ محبت کرنے میں۔۔۔ تم وہی لڑکی ہو جو پہلی محبت کے نام پر زندہ رہتی ہے اور اسی پر مر جاتی ہے۔“

”ہاں! میں وہی لڑکی ہوں، جو محبت کے لیے جیتی اور مر جاتی ہے اور وہ تمہاری محبت ہے۔ میری اس نادانی کو محبت نہ کہیں۔ میرے شوہر کے برابر کوئی نہیں آ سکتا۔“

”اس نادانی کو۔۔۔؟“ فرزام نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ”اپنی اماں کا لحاظ کر رہی ہو۔ معاشرے کا۔۔۔ خاندان کا۔ مجبور ہو یا احسان اتار رہی ہو۔۔۔ آج تم مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو۔۔۔ مجھے ہی تمہیں چھوڑ کر رومی کے پاس چلے جانا چاہیے تھا کیونکہ تم نے وار میں اسے بھی مات دے دی۔ وہ صاف صاف انکار کر گئی۔ انگوٹھی منہ پر مار دی اور تم روایتی لڑکی، ڈر پوک اور شریف۔۔۔ پہلی محبتوں کو سینے سے لگائے رکھنے والی۔ تمہیں تو مجھ سے دور جانا آیا نہ ہی قریب کرنا۔“ غم و غصے سے وہ تقریباً پاگل ہی ہو چکا تھا۔ اس کی آخری بات نے افق کو اندر تک ہنس نہیں کر دیا۔

تو اب اسے بار بار رومی یاد آ رہی ہے اور اب یہ خود رومی کے پاس جانا چاہ رہا ہے۔ اب وہ رومی کے لیے تڑپ رہا تھا۔

”تمہارا وہ امان تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا ہے جس کے لیے تم نے اپنی محنت سے جمع کیا گیا پیسہ فنڈز میں دے دیا۔ اگر تمہارے اکاؤنٹ میں اور پیسے بھی ہوتے تو تم وہ بھی دے دیتیں نا؟“

”بکواس کی ہے اس نے سراسر۔۔۔ میں نے کوئی پیسے نہیں دیے۔ اس کی بات پر یقین ہے۔۔۔ مجھ پر نہیں۔“

”یقین دراصل بروقت سچ بولنے پر کیے جاتے ہیں کیونکہ افق! اس کی گئی باتیں اب تک سچ ہی نکل رہی ہیں۔ کیا اس کا کہا سب سچ نہیں؟ اگر وہ نہ ملتا تو تم مجھے بتاتیں یہ سب؟ شاید بناتے ہی چھوڑ جاتیں۔ وہ جس تمہارے کالج آیا۔۔۔ پھر اسٹور تک۔ تم لوگ کافی شاپ میں ملے۔ اس کے وکیل کے

پاس تم بار بار جاتی رہیں۔۔۔ اور کیا کچھ تمہیں کرنا تھا افق؟ کیا کچھ اور اتنا کچھ چھپایا تھا تو بتانا کیا تھا؟“
 ”کہ مجھے تم سے۔۔۔ صرف تم سے محبت ہے۔ صرف اپنے شوہر سے۔۔۔ اپنے فرزام سے۔
 بہت بڑی غلطی کر دی میں نے۔۔۔ دھوکا نہیں دیا۔“

”اب بھی کہہ رہی ہو محبت کا۔۔۔ اب بھی۔ کیا ابھی اور میرے نام کا سہارا چاہیے۔ جب تک
 ڈاکٹر عدن کا گیس ختم نہیں ہو جاتا۔۔۔ کیا تب تک؟“ وہ واقعی پاگل ہی ہو چکا تھا۔ اس کا دماغ جو جو کچھ
 سوچ رہا تھا اسے جانچے بغیر وہ زبان پر لا رہا تھا۔

صوفے پر گرے ہوئے انداز سے بیٹھی وہ اونچی آواز سے بچوں کی طرح رونے لگی۔
 ”میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں فرزام! میرا یقین کر لو۔۔۔ چلو ہم پاکستان چلیں۔ میں نے کہا
 نہیں کہ میں محبت کرتی ہوں لیکن مجھے کہنا ضرور تھا۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک ہے کہ تم میرے شوہر ہو۔
 میں تمہارے پیروں میں گر کر معافی مانگ لیتی ہوں۔ میں نے اتنا کچھ چھپایا، لیکن میں نے ایک پل کو
 بھی دھوکا نہیں دیا۔ میں کس کی گواہی لاؤں کہ تمہیں یقین آئے۔ صرف اللہ ہی ہے جو سب جانتا ہے
 فرزا! تم اسی اللہ پر جو سب جانتا ہے، یقین رکھ کر میرا یقین کر لو۔ اسی اللہ کے لیے میری بات مان جاؤ۔
 صرف ایک بار اللہ کے لیے۔“

جس وقت وہ یہ بات کر رہی تھی، ٹھیک اسی وقت بیل دی گئی۔ فرزام نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ افق
 سمجھی نمل ہوگی۔ وہ اٹھ کر اندر جانے لگی لیکن جسے اس نے دیکھا۔
 فرزام نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔۔۔ سامنے نظر آنے والے شخص کو دیکھ کر اس کی کپٹنی کی رگیں
 پھڑک کر تن گئیں۔ وہاں عدن کھڑا تھا۔

اس کی شکل پر وہی تاثر تھا جو میدان جنگ میں دشمن کے سپاہیوں کی لاشوں کو ٹھڈے مارنے
 والوں کی آنکھوں میں ہوتا ہوگا۔ وہ عدن آگیا تھا۔ اپنی فتح کا جھنڈا فرزام نامی لاش پر گاڑنے۔
 ”افق مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔“ اس نے ذرا سا جھک کر سر گوشی کی۔
 چوٹ عین مقام پر لگی۔

”تمہیں پورا حق ہے۔“ فرزام ذرا سی بلند آواز میں بولا۔ وہ بے انتہا غصے میں نظر آنے لگا۔ اس کا
 جی چاہا، گھونسا مار کر اس خبیث کو چت کر دے۔ اسے گھونسا مار دینا چاہیے تھا لیکن وہ باہر نکل گیا اور عدن
 اندر آگیا۔ افق دروازے کی طرف جب تک آئی فرزام باہر جا چکا تھا۔

”فرزام!“ بند ہوتے دروازے تک یہ آواز پہنچی۔ عدن دروازے کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”جانے دوا سے۔ اس نے ہی مجھے بلایا تھا کہ میں آ کر تمہیں لے جاؤں۔“

افق نے اسے دھکا دیا اور لپک کر باہر نکلی۔ سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔ فرزام وہاں نہیں تھا۔ وہ
 پارکنگ کی طرف لپکی۔ فرزام کی کار تیزی سے وہاں سے نکلی اور وہ چلا گیا۔ اس نے نیچے آنے میں دیر کر
 دی۔۔۔؟

نہیں۔۔۔ اس نے ہر معاملے میں دیر کر دی۔ عدن سے متعلق ہر بات بتانے میں۔۔۔ اپنی زندگی
 میں فرزام کو اس کا مقام دکھانے میں۔۔۔ وہ اسے چھوڑ رہا ہے۔ یہ صرف عدن کی وجہ سے ہی نہیں

ہوا۔۔۔ یہ افق کی وجہ سے ہوا ہے۔ افق کی آنکھیں جھلملائیں۔

دل کے رستے جان کیسے ٹھکتی ہے وہ آنسوؤں کی زبان میں بتا سکتی تھی۔۔۔ واقعات ایسے کیسے بنتے ہیں، وہ ایک ایک کو سمجھا سکتی تھی۔ برسوں پہلے اس نے اپنی عقل پر ماتم کیا تھا۔ جب وہ عدن کے باپ کے ہاتھوں سے بچ نکلی تھی۔ برسوں بعد بھی وہ اپنی عقل پر ماتم ہی کر رہی تھی۔ وہ عدن کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکی۔

اب وہ حلق پھاڑ کر اعلان کر سکتی تھی کہ وہ فرزام سے محبت کرتی ہے، لیکن اب اس اعلان کو کون وقعت دے گا۔ یہ ایسے ہی ہونا جیسے کسی کے مرنے کے بعد اس کی پیدائش کا اعلان کیا جائے۔۔۔ پھر ایسی خبروں سے کسی کو کیا سروکار۔۔۔ فرزام تو جا چکا تھا۔۔۔ کھڑے کھڑے افق پر بہت سی حقیقتیں وارد ہوئیں۔

وہ اس وقت اسے تنہا کر گیا ہے۔ یہ چھوٹی بات ہے۔ بڑی بات تب ہوگی۔ اگر وہ ایک بار بھی پلٹ کر نہ آئے۔

شاید ایک لمبی مسافت اس کے انتظار میں تھی۔

یا ایک طویل کرب۔

کیا وقت اسے اور سبق دینا چاہتا تھا یا وقت واقعی بے رحم بن کر اس سے کچھ چھین لیتا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار پھر سے سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ اجنبی لوگ بھی اسے دیکھ لیتے تو ضرور اس سے پوچھتے۔ ”کیا ہوا؟“

وہ زیر لب اللہ کو یاد کرنے لگی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کر رہی تھی۔ وہ تو مجسم انجیل (دعا کی صورت جڑے ہاتھ) بنی کھڑی تھی۔

عدن کھڑکی میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ وہاں ایسے کھڑی تھی جیسے اپنے ہی ہاتھوں اپنے تخت و تاج کے ٹکڑے کر ڈالے ہوں۔ جیسے اپنے ہی مردہ وجود پر کھڑی ماتم کر رہی ہو۔ ذرا سادہ۔۔۔ تھوڑا سا دھندلا ہی سہی عدن دیکھ رہا تھا کہ وہاں کون کھڑا ہے۔ وہاں امان کی افق نہیں کھڑی تھی۔ وہ اس کے لوٹ آنے پر نہیں، کسی اور کے چلے جانے پر ماتم کناں تھی۔

کیا وقت ایسے بدل جاتا ہے۔ اگر یہ وقت ہی ہے تو عذاب کا مستحق ہے۔

عدن نے صاف شیشے پر اپنا ہاتھ رکھا۔۔۔ وہ افق کو خود میں بھینچ لیتا چاہتا تھا۔ وہ اس میں حلول کر جانا چاہتا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے بتانا چاہتا تھا، ان سالوں میں اس پر کیا گزری۔ اس نے ایک ایک ساعت اس کے لیے جمع کر رکھی تھی۔ وہ گزری ساری ساعتیں اس کی جھولی میں ڈال دینا چاہتا تھا۔ وہ اب اسے ٹھیک ٹھیک بتانا چاہتا تھا کہ اس کی محبت اس پر کب اتری۔ اس محبت پر اس کا ایمان کب مکمل ہوا۔ اس کا ملیت کا لفظ لفظ وہ اس پر آشکار کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتائے گا کہ قید کے ان برسوں میں اس نے کتنی بار اسے یکارا۔ کتنی بار اس نے اسے خواب میں دیکھا اور آنکھ کھل جانے پر رویا۔

”وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔“ اس نے غلطی کی۔

”وہ واپس آ گیا ہے۔“ غلطی کی اصلاح ہوگئی۔

افق ہتھیلی سے آنکھیں رگڑ رہی تھی۔ وہ دیکھ سکتا تھا۔ اسے اس پر ترس آ رہا تھا۔۔۔ بہت آ رہا تھا۔ لیکن خود سے زیادہ نہیں۔ ترس اس نے پہلے خود پر کھالیا تھا۔ اس نے ایک پُر عذاب وقت کاٹا تھا۔ زیادہ رجم کا سختی وہ ہی تھا۔ افق سے دور عدن اس سے زیادہ ہارا کھڑا تھا۔ وہ کیسے افق پر ترس کھالیتا؟ اتنا ظالم کیسے ہو جاتا کہ خود کو ہی مار ڈالتا؟ عدن کے اندر افق کے لیے اب محبت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ جتنی افق کا خیال تھا، اس کے اندر فرزام کے لیے ہے۔

وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ کس حال کو پہنچی کھڑی ہے۔
وہ کس حال کو پہنچ چکا ہے۔ وہ کیوں نہیں پلٹ کر دیکھتی۔
وہ اپنے نفعے کی طرف کیوں نہیں پلٹ رہی؟

”یہ جو آسمان کا رنگ ہے۔ یہ کتنا پیارا ہے امان! مجھے اتنی دیر سے کیوں معلوم ہوا کہ آسمان اتنا خوب صورت ہے۔“
”تمہاری آنکھوں میں امان آ بسا ہے۔ اب تمہیں خوب صورتی کا ہر پیمانہ معلوم ہوگا۔ کہو امان جی! شکر یہ۔۔۔“

”اے اللہ شکر یہ۔۔۔ میری آنکھوں کو امان دیا۔ یہ بند ہوئی ہیں تو اندھیرے پر بھی فدا ہوئی ہیں۔“
”میں ان پر فدا ہوں۔“

عدن نے اپنی گیلی آنکھیں صاف کیں۔ اب اسے افق کی نفرت ملے گی۔ ایک لمبا عرصہ ملے گی۔ فرزام اسے طلاق دے دے گا۔ وہ عدن سے نفرت کرے گی۔ ٹھیک کرے گی۔ افق کی ہے، تو نفرت ہی سہی۔ اسے ایک طویل انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس کی پہلی جیسی محبت پانے کے لیے۔۔۔ اور وہ تو افق ہے۔ مستقل نفرت پال ہی نہیں سکتی۔ محبت کے بتا رہے ہیں کہ نہیں سکتی۔

وہ ضرور کرے گا یہ انتظار۔۔۔ اب وہ صابر بن جائے گا۔ اب وہ سب کرے گا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تو اب پریم امرت ہی پینا ہے۔ یہی خضر اب اسے زندہ رکھ سکے گا۔ ایک ایک بوند کے لیے وہ ہر حد سے گزر جائے گا۔ وہ افق کے لیے ہر پاتال میں اتر جائے گا اور اسے بھی گھسیٹ لے جائے گا۔ وہ اندر باہر سے افق ہو چکا تھا۔ اس کی ذات میں صرف اسی کا عکس جھلما رہا تھا۔ وہ کیسے پیچھے ہٹ جاتا۔ اسی لیے وہ فرزام کے پاس گیا تھا۔ ایک سپر پاور بلک کی بدنام زمانہ جیل میں وقت گزارنے والے کو ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا کہ اسے کس وقت ان دونوں کے درمیان دخل دینا ہے۔

وہ اس بلڈنگ کے آگے پیچھے ہی ٹہل رہا تھا۔ فرزام آفس سے فوراً ہی اٹھ آیا تھا۔ وہ کیوں جلدی آیا تھا۔ عدن نامی نام نہاد بدست گرد جانتا تھا۔ الٹی انگلیوں کے کاٹی گروہ کچھ چکا تھا۔

افق گھٹنوں کے بل زمین پر ڈھکے گئی۔ بوسٹن میں آج یہ کیسی رات اتری تھی۔ اتنی اندھی۔ اس رات نے سب کو اندھا کر دیا تھا۔ یہ اندھا پن ستارہ صبح کو نکل رہا تھا۔ یہ اندھیرا۔۔۔ اندھیرا۔۔۔

زندگی میں وہ اتنے صدمات سے گزری تھی۔ وہ کسی ایک بھی صدمے سے مریوں نہ گئی۔ مرنے کے لیے یہ آج ہی کی رات کیوں؟

اسی صدمے سے کیوں؟

کیا محض ساعت ابھی بھی اس کے پیچھے ہیں؟

پیچھے ہی ہوں گی۔ ورنہ وہ گہرے ہوتے اندھیرے میں حلول نہ کر رہی ہوتی۔

اس کا جی چاہا، دیوانی ہو کر در بہ در بھٹک جائے۔ یہ دیوانگی اس نے فرزام پر ظاہر کیوں نہ کی؟ لیٹ جانے کے لیے دھول ہی سہی۔ قدم بوسی کے لیے خاک ہی سہی۔ یہ بھی کم تھا اس پہلے شخص کے لیے، جس نے عزت سے اس کی طرف دیکھا اور شرافت سے اپنی عزت بنالیا۔ بلور جان کر رخ روشن کیا۔ دل میں ایک مقدس دعا کی طرح رکھا۔ ایسی دعائیں جن پر خدا سے خاص وعدہ لیا جاتا ہے۔ وہ اس پر زندگی کے رخ روشن کرتا رہا۔ اس پر لمحہ بہ لمحہ خدا ہوتا رہا۔ وہ ایک ایسا ندائی تھا۔ جس نے کبھی پرستش کیے جانے کی خواہش نہ کی۔ پس ہاتھ جوڑے بیٹھے رہنے پر ہی نازاں رہا۔ رشتے اور تعلقات میں کون ایسا کرتا ہے۔۔۔ کون ہے جو ماضی کے عیبوں کو فراموش کر کے دیوتا بناتا ہے۔۔۔ کون ہے، جو تعلق کو مقدس فریضے کی طرح سرانجام دیتا ہے۔ ایسی عبادتیں کون کرتا ہے، جو فرض نہیں ہوتیں۔ لیکن فرض کر لی جاتی ہیں۔ محبت سے۔۔۔ محبت کے لیے یہ صرف محبت ہی ہے، جو اس مقام تک لے آتی ہے۔ یہ کرشمے محبت کے ہی

ہیں۔

کشمیری حسن پر اس کی چاہت قائم نہ تھی۔ وہ حسن جس پر نظر پڑتے ہی شاہراہ قائد اعظم کی ٹریفک عدن کے لیے ساکت و جامد ہو گئی تھی۔ وہ بلی گہری آنکھیں، جن میں عدن کا دل ڈوب گیا تھا۔

”مجھے معلوم ہو گیا، صرف ایک ہیلن کے لیے جنگ کیوں کی گئی۔ میں تاریخ کے اس افسانے پر ہنسا کرتا تھا۔ اب یہ تاریخ مجھے پرہنس رہی ہے افق! تمہارے لیے تو عالمی جنگ بھی کم ہے۔“

وہ عدن کی وہ ہیلن تھی جو لاکھوں انسانوں کو میدان جنگ میں گھسیٹ لائی تھی۔ جسے اٹھالیا جاتا ہے۔ پہلو میں بٹھالیا جاتا ہے۔ وہیہ حسن اور وہی کشش، جو عظیم قوموں میں جائز نہیں۔ جس پر قلم اٹھا کر دو لفظ بھی نہیں لکھے جاتے۔

”میں نے سنا ہے کہ کچھ روگی بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ایک سچا اور کھرا انسان ایسے روگیوں پر ایک پھونک مارے تو وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔۔۔ تمہیں تو مجھے پھونک بھی مارنی نہیں پڑی۔ اور سنو۔۔۔ اگر ہم اچانک سے بہت غریب ہو گئے تو ہم ایک شفا خانہ کھول لیں گے۔ تم پھونکیں مارتی جانا۔ میں میسے کٹھنے کرتا جاؤں گا۔۔۔ ہا ہا ہا، نہیں، نہیں۔۔۔ میں تمہیں ایک شفا کے میسے نہیں دوں گا۔ ایک روپیہ بھی نہیں۔ ٹھیک ہے، میں کوئی ایسا روگی بھی نہیں تھا۔ لیکن تم میں تو کمال کا کمال تھا۔“

”افق۔۔۔!“ عدن کی آواز اس کی پشت سے ابھری وہ آواز دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑھ کر اسے

تھام لیتا چاہتا تھا۔

افق آنسو بہاتی رہی۔ وہ ابابک (مبہوت) کھڑا رہا۔

”کاش۔۔۔! خدا نے فرزام نامی انسان پیدا ہی نہ کیا ہوتا۔“ خدا سے یاد بھی آیا تو شکوے کے لیے۔

”اس شخص کے لیے آنسو بہا رہی ہو، جو تمہیں چھوڑ گیا۔۔۔؟“

افق کے جوگ سادھنا میں تبدیلی نہ ہوئی۔ شاید وہ اسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ یقیناً وہ فرزام کے

دل کی دھڑکنیں تلاش رہی تھی۔ آس پاس سے اندھی بہری ہوئی، وہ فرزام کے آسن جمائے تھی۔ عدن گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھا۔

”ہم دونوں جانتے ہیں کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔ تم کہا کرتی تھیں کہ خدا کو تمہیں امان دینا ہی ہوگا۔ تم خدا کو منا کر بھی چھوڑو گی۔۔۔ دیکھو، تم نے خدا کو منا ہی لیا۔ خدا مان گیا افق۔۔۔ اسی نے ہمیں دوبارہ ملایا ہے۔ واقعی خدا تمہاری بہت مانتا ہے۔ تم نے راضی کر ہی لیا اسے۔۔۔“

”اب ہی تو میں نے اسے ناراض کیا ہے۔۔۔“ افق نے عین اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں ڈر کا شبہ تک نہ تھا۔ چادر کا کونا دانتوں میں دبائے، سرخ پڑتی، ذرا ذرا سی کپکپاتی، کیا یہ وہی لڑکی ہے۔ مال پر اس کے سامنے سے گزرتے، جس کی جان نکل جاتی۔ وہ فرزام کے لیے اس کی جان لے لینا چاہتی تھی۔ نگاہوں کے اس تصادم نے ایک گہرا صدمہ دیا۔

عدن کا بھاگ کر کہیں چھپ جانے کو جی چاہا۔ کوئی اس پر صرف اتنا مہربان ہو جاتا کہ وقت کو پیچھے لے جاتا جہاں اس لڑکی کی نظریں شرمنا کر چر اکر نکل جایا کرتی تھیں۔ جن نظروں میں پہلی شبیہ اس کی ہوا کرتی تھی۔

اسے صدمہ ہوا۔۔۔ گہرا صدمہ ہوا۔ اس لڑکی نے رو رو کر ان آنکھوں کو برباد کیوں نہ کر لیا۔ اسے یہی تو کرنا تھا۔ ایک کمزور ڈال پر بیٹھی کمزور سی تلی جیسی لڑکی کو۔۔۔ خود کو اجاڑ لینا چاہیے تھا۔ اس نے ایسا کیوں نہ کیا۔ اتنی مضبوط کیوں ہوئی؟ وہ جو گمن ہو جاتی تو وہ زندگی کے کسی بھی حصے میں اسے خود کو دان کر آتا۔ اب تو وہ کفول لیے کھڑا ہے۔ افق جیسی لڑکی اس پر یہ نویت کیوں لائی؟ اول آنے والے کو وہ اس درجے پر کیوں لے آئی؟ وہ افق سے پوچھتا۔ ضرور پوچھتا۔ لیکن اب کیسے پوچھتا؟

”تب وہ میرا تھا۔ اس نے مجھے بچا لیا۔ میری راتوں کی عبادتوں، سجدوں، دعاؤں پر اس نے مجھے فرزام دیا۔ اس نے مجھے وہ ہیرا دیا، جو انسانوں کی کان سے نہیں نکلتا۔۔۔ جسے مقدس صفات سے بنایا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو، وہ کیا ہے؟ تم نہیں جان سکتے تمہارے پاس وہ علم نہیں ہے۔ تمہارے پاس تو وہ آنکھ ہے جسے میرا حسن نظر آتا ہے۔ وہ آنکھ، جو مجھے دیکھتے رہنا چاہتی تھی۔ میرے حسن کے قصیدے بیان کرتی تھی۔ تم نے وہی سب دیکھا نا، جو بازار سے خریداری کرتے وقت ایک گاہک دیکھتا تھا۔ وہی گاہک جو انسان اور چیز میں فرق نہیں کر سکا تھا۔۔۔ اپنے مطلب کا۔ اپنے مطلب سے خریدنے سے تعلق رکھتا ہے بس۔۔۔ وہی خریدار ہونا تم۔۔۔؟“

”تم اس وقت غصے میں ہو۔“ عدن نے اپنے اندر اٹھنے والی کپکپی کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ وہ افق کے سامنے ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”اگر میں غصے میں ہوتی تو تم پر تھوکتی۔ کیا میں نے ایسا کیا؟ میرا تم پر غصہ بھی حرام ہے۔ جیسے تم مجھ پر حرام ہو۔“

عدن کو اب سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ بیٹھا ہی رہتا۔ وہ کھڑا کیوں ہوا؟ ”دیکھو تم میرے لیے کس قدر حقیر ہو۔ اگر تم اس حال تک نہ پہنچتے۔ اگر تم اس دنیا کے بادشاہ ہوتے تو بھی افق پلٹ کر تمہیں نہ دیکھتی۔ تمہیں تمہاری اوقات معلوم ہوتی؟“ افق جم کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ عدن کو واقعی اپنی اوقات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو گئی تھی۔

”فرزام کی نظروں میں مجھے تمہاری اوقات معلوم ہو گئی ہے۔“ ہمت کر کے آواز مضبوط بنا کر عدن نے کہہ دیا۔ جبکہ وہ ایسے گرنے والا تھا جیسے گھن کھایا زینہ۔ جو ذرا سے دباؤ سے دھڑام سے چر مرا کر گر پڑتا ہے۔ اسے کچھ بھی نہ ملا اور وہ گھن کھایا کھڑا رہا۔

”تمہارا نام ان ناموں میں لکھا ہی نہیں گیا۔ جن پر محبتیں واجب ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو جان جاؤ۔“ وہ بددعا دے رہی تھی یا سزا سنار ہی تھی۔ اس نے یہ سب کیسے جان لیا تھا۔ جیل جانے کے بعد سے وہ بار بار رو پڑتا تھا۔ اس سے پہلے زندگی میں یہ نوبت کبھی نہیں آئی تھی اس پر۔۔۔ یہ بات سن کر اسے رونا آیا۔ اس پر ہمینوں روار کھے جانے والے تشدد سے زیادہ اسے اس وقت صحیح سلامت کھڑے ہو کر آیا۔

”مجھ پر محبت واجب نہیں ہوئی۔۔۔؟ بھول گئیں، کیسے تم سے محبت کرتا تھا؟“

”مجھے یاد ہے، کیسے تم مجھے چھوڑ گئے اور کس لیے چھوڑ گئے۔ میں تو تمہاری شکر گزار ہوں۔ کاش! کہ تم جان سکتے کہ میں نے نصیحت کے بعد انعام ملنے پر کیسے شکر ادا کیا۔ تم وہ نصیحت تھے، جو مجھے وقت نے دی۔۔۔ اور فرزام وہ انعام ہے، جو مجھے خدا نے دیا۔ تم وہ آزمائش تھے جو زندگی میں ایک بار تو ہر انسان کو چھلکتی ہی پڑتی ہے۔ وہ آزمائش جو دھل دھلا کر انسان کا اصل اس کے سامنے لے آتی ہیں۔ فرزام کا دل دکھا کر میں خدا کی ناشکری کیسے کروں۔۔۔ ابھی تو فرزام کے ملنے پر اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکی۔“ اتنی مضبوط آواز افق کی۔ اتنا کھرا انداز اس کا۔

”فرزام تمہیں چھوڑ گیا ہے افق۔ اس صدمے سے باہر آ جاؤ۔“ وہی عدن کا شبہہ پر مات دینے والا

انداز۔

”افق تمہیں دھکا رہی ہے۔ اسے اپنی پیشانی پر کند کرالو۔“ اس نے عدن کی بچائی بساط ہی

الٹ دی۔

”جب جب اپنی شکل دیکھو۔ تمہیں یہ دکھائی دینا چاہیے۔“

”مجھے تم دکھائی دیتی ہو افق! ایسی باتیں تو تم کرنی تھیں۔ اب میں کر رہا ہوں۔ مجھ میں تم سما گئی ہو۔ میں سانس کیسے لوں افق! میری سانسیں تم سے جڑ گئی ہیں۔“

اس نے بڑھ کر افق کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ افق دو قدم پیچھے ہوئی۔ وہ اس سے ڈر نہیں رہی تھی۔ بھاگ تو اب قطعاً نہیں رہی تھی۔ وہ اب اس سے نہیں بھاگے گی۔ یہ ڈر کر بھاگنے کا ہی انجام تھا۔

پانی آئے تو اونچائی پر چڑھ کر جان بچانی چاہیے۔ عذاب آئے تو سجدے میں جھک کر۔۔۔ انسان وہاں بن کر آئے تو سامنے سے ڈٹ کر۔۔۔

”میں اسے تمہاری اور اپنی ساری باتیں بتا آیا ہوں۔ تم کتنی بار میرے ساتھ اکیلا نکلیں۔ کیسے تم دیوانہ وار مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ ساری خاص باتیں بتا کر آیا ہوں اسے افق۔۔۔! آخر کو وہ بھی ایک انسان ہی ہے نا۔۔۔ کتنا بھی اچھا ہوگا، فرشتہ نہیں ہوگا۔ وہ تمہاری زندگی میں اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ تمہاری قسمت میں، میں لکھا گیا ہوں۔“

اس کے رد عمل پر وہ چڑ گیا۔ ورنہ یہ سب نہ کہتا۔ افق نے اپنے تاثرات پر بمشکل دبائے۔ جن میں پہلا تاثر غیظ و غضب کا تھا۔

”مجھ سے متعلق مشورہ لینے وہ تمہارے پاس نہیں آئے گا۔“
 ”اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایسے چلانہ جاتا اپنی بیوی کو میرے ساتھ چھوڑ کر۔۔۔ وہ تمہیں چھوڑ چکا ہے۔“
 ”اگر وہ مجھے چھوڑتا تو خود ہی رہتا اور مجھے تمہارے ساتھ چلنا کرتا۔“

”تم بہت خوش فہم ہو افق!“
 ”تھی۔۔۔ جب تک ”امان“ نامی آزمائش میں مبتلا رہی۔ فرزام میرے لیے کوئی جنگلی جھاڑی نہیں جسے اکھاڑا اور زمین کسی اور تیل بوٹے کے لیے تیار کر لی۔ تمہاری بھول ہے۔ اگر ایسا کچھ ہوا بھی تو بھی وہ میرا ہی ہوگا کیونکہ میں اسے اپنا ہی رہنے دوں گی۔“
 اس آخری بات سے عدن کو بہت تکلیف ہوئی اس کا جی چاہا کہ زوردار تھپڑ افق کے گال پر مارے۔

”تم سو سال بھی میری راہ میں کھڑے رہے۔۔۔ تو بھی تمہیں میری ایک نظر نہیں ملے گی۔ تم افق کو پلٹ کر خود کو دیکھنا نہیں پاؤ گے۔“
 کیا ہوا، اگر وہ اس جسم حور کو گھسیٹے اور اپنے ساتھ لے جائے۔ کاش! وہ پاکستان میں ہوتا۔۔۔
 کاش! وہ نام نہاد دہشت گرد نہ ہوتا۔

”تم افق کو پلٹ کر خود کو دیکھنا نہیں پاؤ گے۔“ اس کے اندر بارہا سائیں سائیں ہونے لگی۔
 ایک نے اس سے محبت کی تھی۔ ایک سے اس نے شادی کی تھی۔
 افق کو چھوڑ دیا تھا۔۔۔ ماریہ نے چھوڑ دیا ہے۔
 ایک کو دھکارتا تھا۔۔۔ ایک دھکارتا رہی تھی۔
 افق نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ ضرور رخ موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی چال میں تھکن اور دکھ ضرور تھا۔ لیکن اس کی سمت سیدھی تھی۔ اس کا اٹل انداز بتا رہا تھا کہ وہ کب تک بنا رکھے چل سکتی تھی۔
 وہ تا عمر بنا رکھے چل سکتی تھی۔

عدن وہیں کھڑا رہ گیا۔ افق اپنے پیچھے وہ اندھیرے سمیٹ لائی جو آج ہی کی رات خاص بوئشن پر اترے تھے۔ اس نے خوف زدہ ہو کر سب ہی بتیاں روشن کر دیں۔ اندھیرا پھر بھی پھیلتا ہی جا رہا تھا۔
 اس نے چاہا، بھاگ کر جہاں بھر کی روشنی لے آئے۔ فرزام لے آئے۔ باہر نکلے اور حلق پھاڑ پھاڑ کر فرزام کو آوازیں دے۔ وہ اس کی پہلی آواز پر نہ پلٹے تو آخری آواز پر ہی پلٹ آئے۔ وہ اسے اٹھا کر دریا میں پھینک دے۔ اسے بچائے بھی نہ۔۔۔ اسے مر جانے دے۔ لیکن ایسے چھوڑ کر نہ جائے۔

”میرا دل چاہتا ہے، میں تمہیں دریا میں پھینک دوں۔“
 ”مجھے۔۔۔؟“ اسے سن کر بھی یقین نہیں آیا۔
 ”ہاں، تمہیں ہی یار۔۔۔! تمہیں بہانے سے، سب سے نظر بچا کر کنارے سے دھکا دے دوں۔“
 پھر جھٹ جیکٹ اتار کر خود بھی کھو جاؤں اور تمہیں بچا لاؤں۔“
 ”سب سن کر بھی مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”سنو۔۔۔ تمہیں اوپر لے جاؤں اور دھکا دے دوں شرواپ۔۔۔ تم پھر گئیں پانی میں۔۔۔ میں

بھی کو داپانی میں اور پھر سے تمہیں بچا کر اوپر لے آؤں گا۔ میں ہیرو بن جاؤں گا۔“

”ہیرو۔۔۔ بننے کے لیے؟“

”ہاں، میں بار بار تمہارا ہیرو بننا چاہتا ہوں۔“

وہ اس بات پر دنوں ہی۔۔۔ اور خوشی سے اسے کئی راتیں نیند نہ آئی۔ وہ ذہن میں اپنے دریا میں گرنے کی اور فرزام کے ہاتھوں بچائے جانے کی فلم چلاتی رہی۔۔۔ ہر بار اس فلم کو چلاتے اسے بہت اچھا لگتا۔ ہر بار اسے اس فلم کے ہیرو پر انوکھے انداز میں پیارا آتا۔

محبت ان پر بہت سے الگ الگ لمحوں میں وارد ہوئی تھی۔ جیسے اوس۔۔۔ بارش کی طرح نہیں برستی۔۔۔ نظر بھی نہیں آتی۔ لیکن گیلا کر دیتی ہے۔ نرمی سے۔۔۔ محبت کے لیے گائے گئے لوک گیتوں کی طرح بھی۔ جو ان گنت پتیاں رکھنے والے پھولوں کی طرح الگ الگ جدا جدا ہوئے۔ لیکن لے اور ردھم ایک ہی رکھتے ہیں۔

اگر وہ دریا میں کود جائے تو کیا وہ کہیں سے بھی آجائے گا۔

”ہاں۔۔۔“ افق جانتی تھی۔ ایسا جانا، جس کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ جس یقین کے پیچھے ہی شک چلا آتا ہے۔

”میں تمہیں بہت یاد کرتا رہا۔“ ایک دن وہ اسے ہر دن منٹ کے بعد فون کر کے کہتا رہا۔

”بارش ہو رہی ہے۔ بہت بد صورت سی بارش ہے۔ مجھے تو اچھی نہیں لگ رہی۔ ہوا ایسے چل رہی ہے کہ دل بیٹھا جا رہا ہے۔ جانے کیوں۔۔۔ اور پھول، ہاں صرف پھول ہی پیارے لگ رہے ہیں۔ لگتا ہے سارے امریکی گھروں سے باہر نکل آئے ہیں۔ دیکھو، مجھے چلنے کے لیے جگہ نہیں مل رہی۔ اف! یہ امریکی۔۔۔ اف! یہ لڑکے لڑکیاں۔۔۔ اف! حق۔۔۔ ہاں، میں بھیگ رہا ہوں۔۔۔ نہیں، میں آکس کریم نہیں کھاؤں گا۔ نہیں بیٹھنا مجھے کہیں۔ مجھے یہ سب نہیں چاہیے اپنا نام تو تم لے نہیں رہیں۔ میں بھی نہیں لوں گا۔ نہیں، مجھے اب افق نہیں چاہیے، وہ دیکھو ذرا۔۔۔ ایک گندی سی لڑکی نے مجھ جیسے معصوم سے لڑکے پر کوئلہ کافی انڈیل دی ہے۔ وہ اب اسے نہیں چھوڑے گا۔ وہ اس کا گلا دبا دے گا۔ اسے اس کا گلا دبا دینا چاہیے۔ میں تمہارا گلا دبا دوں گا افق۔۔۔ یاد رکھنا۔“

ہولے ہولے الہام کی سی صورت لیے محبت ان پر اترتی رہی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مقید ہونے لگے۔

وہ اسے فون کر رہی تھی۔ لیکن اس کا فون بند تھا۔ اس کے بیڈروم کی کھڑکی کے ساتھ وہ ناک کر کھڑی ہو گئی۔ جس راستے سے اسے آنا تھا، اس پر نظریں گاڑے۔۔۔

واقعات تیزی سے رونما ہوئے تھے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ محبت کا جو معجزہ رونما ہو چکا تھا۔ وہ اپنا اثر رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا، فرزام ضرور آئے گا۔ ایسا یقین جو خود کو خود ہی کر دیا جاتا ہے۔ جو بانی پر بنے بلبلے سا ہوتا ہے۔ اس کے پاس یقین کے کئی دھاگے تھے۔ وقت ہی ثابت کرنے والا تھا کہ کون سا دھاگا کتنا مضبوط اور ٹوٹ جانے کے لیے کتنا نازک۔

وہ بہت زیادہ رونا چاہتی تھی۔ ہر وہ حربہ آزمانا چاہتی تھی جس سے اس کی زندگی میں فرزام کے

ہونے پر آج نہ آئے۔

جب وہ امریکا آ رہی تھی تو اماں نے کہا۔ ”میری بیٹی بہت خوش قسمت ہے۔“
”امریکا جا رہی ہوں، اس لیے؟“ وہ مسکرائی۔

”تم فرزام کے پاس جا رہی ہو، اس لیے۔“

اس نے اپنے ویزے کے لیے بہت دعائیں کی تھیں۔ دو بار اس کے ویزے پر اعتراضات لگ چکے تھے اور دونوں بار وہ کئی کھنڈے روٹی رہی تھی۔ اس نے فرزام کو نہیں بتایا تھا کہ یہاں آنے کے لیے اس سے پیکنگ نہیں ہو پاری تھی۔۔۔ چیزیں پھسل پھسل کر اس کے ہاتھوں سے گر جاتی تھیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ فرزام کے پاس آخر کار جا رہی ہے۔ آخر کار اس کے عین سامنے بیٹھ کر اسے دیکھ سکے گی۔ اسے سن سکے گی۔ جہاز میں بیٹھے تک اسے یقین نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ جہاز کریش ہو جائے گا۔ وہ مرجائے گی اور آخر کار وہ بھی بھی فرزام سے نہیں مل سکے گی۔ بوسٹن ایئر پورٹ پر اس کے کاغذات روکر دیے جائیں گے۔ ان پر کوئی نیا اعتراض اٹھے گا۔ اسے وہم تھا کہ اس کے اور فرزام کے درمیان ضرور کوئی آئے گا۔ وہ عدن ہوگا، اسے گمان تک نہ تھا۔ اس طرح آئے گا، اسے خیال تک نہ تھا۔
”فرزام۔۔۔!“ اس نے سسکی سی سرگوشی کی اور پھر وہ سستی سرگوشیاں کرتی ہی رہی۔



ایک غیر معروف علاقے۔۔۔ ایک غیر مصروف سڑک کے کنارے سے ذرا آگے وہ ایک ڈھلان نما جگہ پر دونوں گھٹنوں پر بازو دکائے بیٹھا تھا۔
”فرزام۔۔۔؟“

آبادی کے نشانات ذرا دور ہی معدوم ہو جاتے تھے۔ وقفے وقفے سے سڑک پر سے کوئی نہ کوئی گاڑی معمول کی رفتار سے گزر جاتی تو زندگی کے شواہد زندہ ہو جاتے۔
یہاں بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک ریٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھانے کی کوشش کی۔ ”افق جائے بھاڑ میں“ سوچ کر۔

اس سے کھانا نہیں کھایا گیا تھا۔ اس نے کافی پینے کی کوشش کی اور کافی ٹھنڈی ہوتی رہی۔
وہ ایک بار میں بھی گیا۔ وہ خود سے بے خود ہو جانا چاہتا تھا۔ اس کا داغ سوچے جا رہا تھا۔۔۔
سوچے جا رہا تھا۔ وہ اسے سلا دینا چاہتا تھا۔ وہ ہر اس زبان کو بند کر دینا چاہتا تھا جو اس سے ہزاروں طرح کے سوال کر رہی تھی۔ اسے اکسار ہی تھی۔ بہلا رہی تھی۔ تکلیف دے رہی تھی۔ اتنے سارے سوال جو اس کے اندر اٹھ رہے تھے۔ اس کے پاس ان سب کا جواب نہیں تھا۔

آرڈر دے کر وہ اٹھ گیا۔ واش روم جا کر وہ بلاوجہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کرنا کیا ہے۔ وہ کیا کر رہا ہے۔ کل اس کی زندگی کچھ اور تھی۔۔۔ آج کچھ اور تھی۔ کل تک ہی جو بھی، وہی زندگی تھی۔

اسے افق پر غصہ تھا۔ وہ بے حد ناراض تھا۔ اس کی شوخی جاتی رہی تھی۔ وہ بدتمیزی کی حد تک بد مزاج ہو گیا تھا۔ یہی تجویز کردہ سزا تھی۔ اس کی طرف سے افق کے لیے۔۔۔ وہ بد دل بھی ہوا تھا اور افق

کو ایک تھپڑ بھی مارنا چاہتا تھا۔۔۔ اور یہ سب بس یہاں تک ہی تھا۔ وہ افق کو نکال باہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔
 ”بیوی وہ تمہاری ہوگی۔ محبوبہ وہ میری ہے۔ وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔“

ایسے لفظوں کی بازگشت پر وہ اس وقت گھر سے باہر نہ ہوتا تو کہاں ہوتا۔
 ”میں اس کی جان ہوں۔ مجھے یقین ہے اتنے سال اس نے میری کشدگی کا سوگ ہی منایا ہوگا۔
 اس جیسی لڑکیاں محبت کے نام پر کھیل نہیں کھیلتیں۔۔۔ یہ وہ عورتیں ہوتی ہیں، جو محبت کے نام پر جو پودا
 لگاتی ہیں اسی کے نیچے اپنی قبر بناتی ہیں۔“

فرزام نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ بار بار اپنا ذہن جھٹک رہا تھا۔ وہ افق کو سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی
 پرسکون جگہ پر جا کر اپنے ذہن کو سلا دینا چاہتا تھا۔ اسے خیال سا آیا۔۔۔ زندگی صرف دودن پیچھے چلی
 جائے تو وہ افق کو لے کر کہیں چلا جائے۔ اس نے اس انسان کی یہ سب باتیں نہ سنی ہوتیں جواب اس
 کے ہر یقین کو بے یقین کر رہی تھیں۔

وہ افق کو جانتا تھا اس جانے کو وہ اب بھول رہا تھا۔ وہ افق سے محبت کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں
 تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس پر اس کا یقین کھو گیا تھا۔
 اسے عدن کی کئی باتیں سچ لگ رہی تھیں۔ وہ بکواس کر گیا تھا۔ وہ مکار ہے۔ وہ افق کا امان ہے۔
 وہ انہیں برباد کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو صرف حقیقت بیان کر گیا ہے۔ وہ افق کو چاہتا ہے۔ وہ افق کی ترجمانی
 کر گیا ہے۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔

پہلے کو رد کرتے۔۔۔ دوسرے سے سراٹھاتے خیالات اس کے اندر جنگ کی حالت میں تھے۔
 اس کی عقل عروج و زوال کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔

رومی گئی تو وہ روتا رہا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا، اسے فون کرے اور اسے بتائے ”کہ ایسے چلے
 جانے سے۔۔۔ ایسے اپنا کچھوڑ دینے سے کیا کیا ہوتا ہے۔“
 لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ وہ رومی کی محبت کو رومی سی محبت کو دوبارہ زندگی میں لانا نہیں چاہتا تھا۔
 افق جا رہی ہے تو اس کی جان کیوں نکل رہی ہے۔ اب وہ روئے گا نہیں۔ اب وہ مرجائے
 گا۔۔۔ کیا نیا ہوگا۔۔۔ جانے کتنے، چلتے پھرتے اپنی لاش لیے پھرتے ہیں۔

So good bye

pleasase! don't cry

(اچھا تو پھر الوداع۔۔۔ دیکھو رونا نہیں)

اسے یہ ساعت منحوس لگی Houston Whitney کے اس الوداع کا یاد آنا منحوس سا لگا۔
 تو کیا وہ افق کو الوداع کہہ آیا ہے؟ کیا محبتوں میں ایسے الوداع کہہ دینا جائز ہے؟

"I will always love you"

اس نے افق کا ہاتھ اپنے شانے پر رکھا۔

سائمن کی نیو ایئر پارٹی میں Whitney کے انسٹرومنٹل (Instrumental) عشق کو بہت
 سوں نے زندہ جاوید کیا۔ وہ مہبوت دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے اسے معلوم نہیں تھا۔ محبت رقص کی کیفیت

میں اسے بھی فسوں جگاتی ہے۔ دراصل جس دل کے اندر محبت در آنے لگی ہو، اسے ہر چیز قصاں نظر آتی ہے۔

If i should stay
I would only be
in your way....

”تم مجھے گرا دو گی۔۔۔ کاش! تم کبھی ایک کام تو میری خوشی کے لیے کر سکو۔۔۔“

اس نے اس کی کمر میں بازو سما لیا کیے اور اس کے رنگ بدلنے حسن کو دیکھنے لگا۔
وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ کمری نہیں سکتی تھی۔ وہ ہی شہزادی تھی نا،
جو سب سے چھپ کر اپنے شہزادے کے لیے بیٹھے بیٹھے گیت گاتی ہے، بالکٹی میں کھڑی ہوتی ہے، چاند کو
دیکھتی ہے اور جنگل میں گھل جاتی ہے۔ اپنی بہترین پوشاک میں ملبوس۔۔۔ سارا ہار سنگھار کیے۔۔۔
میٹھی آواز میں ترنم سے اسے بلاتی ہے۔ اسے ڈھونڈتی ہے اور جب اس کا محبوب آ جاتا ہے تو چھپنے کے
لیے جگہ تلاش کرتی ہے اور اگر وہ اس کے بالوں کی ایک لٹ کو ہی چھو لیتا ہے تو کانپ کر بھاگ جاتی ہے
اور پھر رات بھر سکرانی رہتی ہے۔

”ایسے ایسے کرنے میں تمہارا کیا جاتا ہے افق؟“ وہ اسے دکھا رہا تھا کہ وہ صرف مذاقابی یہ سب
کر رہا تھا جبکہ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

”میں انگریز نہیں ہوں۔ مجھے ڈانس نہیں آتا۔“ شہزادی ڈر گئی۔

”انگریز ہونے سے رخصت نہیں آتا۔۔۔ محبت ہو جانے سے آتا ہے۔ کیا تم نے دیوانوں کو رقص کی
کیفیت میں نہیں دیکھا۔۔۔؟“ وہ اسے کیسے سمجھاتا کہ عشق میں جھوم جانے کی کس کیفیت میں وہ تھا۔

So i'll go but i know
i'll think of you every step

(اور میں چلا ہی جاؤں گا۔۔۔ اور ہمیشہ ہر موڑ پر تمہیں ہی سوچوں گا)
وہ بیٹھا تھا۔ وہ افق کی طرف نہیں جارہا تھا۔

So good bye
Good bye

(اچھا تو پھر الوداع۔۔۔ الوداع۔۔۔)

اس سب کا حساب کرنے میں ان کی زندگیوں میں یہ سب کیا ہو گیا۔ بہت وقت نہیں، بہت حوصلہ
چاہیے تھا۔ اس میں یہ حوصلہ ابھی نہیں تھا۔

گمنام سی سڑک کے کنارے بیٹھے ”افق، عدن سے محبت کرتی ہے؟“ سوچ آتے ہی اس کا جی
چاہا، کسی کار کے سامنے آ جائے یا خود کو نوچ ڈالے۔

لیکن کیوں؟ جب بات ہی ختم ہو گئی۔ وہ افق کو چھوڑ دے گا۔ بس سب ٹھیک۔۔۔

سر کو تھام کر وہ اس ”مب ٹھیک“ کو لے کر بیٹھا کیوں ہے۔ کسی آرام دہ جگہ پر جا کر آرام کیوں
نہیں کرتا۔۔۔ جہاں وہ بیٹھا تھا، وہ جگہ کھسک رہی تھی۔ وہ جانتا تھا، وہ جہاں جہاں افق کو خود میں سے

جھٹک کر کھڑا ہوگا، زمین اس کے وجود کے نیچے سے کھسکے گی۔ افق نہ رہی تو اس کے پاس کیا رہے گا؟ اس نے اپنی آنکھیں مسلیں۔

افق نے اسے ایک شلوار سوٹ خود بیزائن کر کے بھیجا تھا۔ صرف خاص اس کے لیے۔ جس کے ساتھ سیاہ رنگ کی مردانہ شال بھی تھی۔ جس الماری میں اس نے وہ شلوار سوٹ پینگ کیا تھا۔ اسے وہ کھول کر دیکھتا تھا۔ ایسے ہی آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کمرے میں کیل ٹھونک کر اسے لٹکا لیا احمد کی تھیم پارٹی میں وہ پہن نہ سکا۔ اس پر کچھ بھی گر سکتا تھا۔

ایک ہندوستانی ہم جماعت کی شادی میں پہننے کے لیے اس نے ایک گھنٹہ لگا کر اچھی طرح استری کیا اور پھر اسے خیال آیا کہ روایتی ہندوستانی کھانوں میں سے اگر اس پر کچھ گر گیا تو۔۔ اس داغ کو کون مٹائے گا۔ اگر وہ داغ نہ مٹا تو۔۔؟

جمعہ کے دن سوٹ کو پہن کر وہ کمرے میں ہی بیٹھا پڑھتا رہا۔ جب وہ کافی بنانے کے لیے اٹھا تو واپس اپنے پرانے لباس میں آ گیا۔ صرف آدھے گھنٹے بعد ہی۔

پھر اسے وہ سوٹ کب پہننا چاہیے؟ اس نے یہ سوچنا چھوڑ دیا۔۔ بیڈ کے عین سامنے کی دیوار پر وہ افق کے آنے سے پہلے تک لٹکا رہا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس کے روم روم میں چراغ جل اٹھتے۔ وہ اس کے لیے دیکھ کر راگ بن گیا الہامی محبت اسے مکمل کرتی جا رہی تھی۔ اپنے احساسات کی مختلف اشکال پر وہ خود ہی فدا ہوتا جا رہا تھا۔

کون ہے، جو محبوب بننا نہیں چاہتا؟

کون ہے، جو محبوب کو پانا نہیں چاہتا؟

اب جو کچھ اس کے اندر جل چکا تھا۔ وہ بجھا تو وہ مر جائے گا۔ کیا ابھی بھی شک تھا۔۔ ابھی بھی کوئی شک تھا فرزام کو۔۔؟

”میں خود چھوڑ دوں گا افق کو۔۔“ وہ بلند آواز سے بڑبڑایا تاکہ خود کو پکار کر سکے۔ اپنی زبان سے اپنے دل کو سن رہا تھا۔

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ اب اگر کسی رشتے، تعلق سے اسے صدمہ ملا تو وہ اس کی جان لے لے گا۔ وہ اس کی جان لے رہا تھا۔

وہ افق کو چھوڑ دے گا۔ یعنی اپنی جان دے دے گا۔

دو بار اس نے رومی کو وقفے وقفے سے فون کیا تھا۔۔ شکر یہ ادا کرنے کے لیے۔ وہ بری طرح سے چڑھ گئی۔

”معلوم ہے تمہاری بیوی بہت خوب صورت ہے۔“

”غلط معلوم ہے۔ خدا نے اسے فرصت سے نہیں بنایا۔ خدا نے اسے اپنی بے پایاں محبت سے بنایا ہے۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ اگر تم مجھے نکال باہر نہ کرتیں۔ اگر تم سب وہ نہ کر تیں تو میں خدا کا اتنا شکر گزار نہ ہو پاتا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے رومی! خدا کی رحمت کسے کہتے ہیں۔ مجھ پر وہ افق کے نام سے نازل کی گئی۔“

”رحمت کو رحمت بنتے در نہیں لگتی۔“

”تم بدو عادی تو بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔“

”تم خوش گمان رہو تو بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”ہو چکا ہے رومی! کاربن کالی کے بجائے کائنات کے مصور نے مجھے اصل تصویر تھادی۔ اس تصویر کا عنوان ”اُتق“ ہے۔ اس تصویر کا خالق خدا ہے۔ اس تصویر کا مالک فرزام کو بنایا گیا ہے۔“ وہ خوش ہو رہا تھا۔۔۔ ان گزرے سالوں میں وہ بہت خوش رہا تھا۔ کھلو ڈالس کے دوران اس نے ایما کو انکار کر دیا۔

”میں کسی اور کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”کس کا۔۔۔؟“ وہ سمجھی کسی اور ہم جماعت کا۔

”ویل۔۔۔ کوئی بہت ہی خاص۔۔۔“ وہ آگے بڑھ گئی۔

”وہ بہت ہی خاص“ گیارہ ماہ بعد امریکا آ سکی۔

جودل ہوتا ہے نا، یہ مکمل وجود سے پرے، الگ کسی اور ہی مقام پر موجود ہوتا ہے۔ اسے فرق نہیں پڑتا۔ باقی کے وجود نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اپنے فیصلے خود کرتا ہے۔ اس دل کے مقام پر باقی کا وجود چاہے گر بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اس نے یاد کرنا چاہا کہ وہ اس سے محبت کرتا بھی ہے یا نہیں۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ گہری ہوئی رات میں وہ گہرائی میں ڈوب چکا تھا۔

البتہ اسے وہ وقت ضرور یاد آ رہا تھا، جب وہ ایک پتلا بی ان کے پاس کام کیا کرتی تھی۔ ایک ایسا پتلا جسے یہ تو معلوم تھا کہ اسے کام کرتا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ خوش کیسے ہوتا ہے۔ ہونا بھی ہے یا نہیں اور۔۔۔ ہونا بھی کیوں ہے؟؟

وہ ایک سوالیہ وجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی کئی سوال جاگ اٹھتے۔

”وہ اس سے محبت نہیں کرتی۔“ فرزام کو یقین سا ہوا۔۔۔ شکوک و شبہات کے پاتال میں وہ پور

پور ڈوب چکا تھا۔ عدن کا زہرا اثر دکھا رہا تھا۔

ایک گہرا سناٹا پھٹ کر پھیلنا۔ درد کی ایک گہری تیز لہر اس کے وجود میں لہرا کر پھیلی۔

خودکشی کرنے والا آخری بار تو سوچتا ہی ہوگا۔۔۔ آخر یہ موت ہی کیوں؟

مارنے والا نہ جانتا ہو۔ مرنے والا تو جانتا ہی ہے تا کہ وہ مر رہا ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ بوسٹن میں رہنے والے دو لوگوں پر ایک ہی قیامت جدا جدا مقامات پر ایک

ہی انداز سے گزر رہی تھی۔

فرزام نے سر کو جھٹکا۔۔۔ کوشش کر کے بھی وہ دل کو نہ جھٹک سکا۔ ایسی کوشش بار بار کرنے سے

بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ ایسی کوشش بار بار کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی جانی تا۔۔۔

منگنی ٹوٹ جانے پر وہ دس بار رومی کے پاس گیا تھا۔ محبت کے ٹوٹ جانے پر اسے ہزار بار تو جانا

ہی چاہیے۔

اس نے کارا سٹارٹ کی۔

اسے تا عمر جاتے رہنا چاہیے۔ ایک محبت کے لیے۔۔۔ صرف اتنا کرنے میں کیا جاتا ہے؟



عدن اپنے فلیٹ تک جانے کے لیے بس میں بیٹھا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہ بس میں بیٹھا تھا۔ اس کا مطلوبہ اسٹاپ آکر گزر چکا ہے۔ آخری بس اسٹاپ پر اسے اترنا ہی پڑا۔ اسے پھر معلوم ہوا کہ وہ کتنی دور آچکا ہے۔ وہ اتنی دور گئیے آگیا۔ اسے معلوم کیوں نہ ہوا؟ اسے واپسی کی جلدی نہیں تھی۔ ایسی جگہ جانے کی جہاں اس کے سونے کے لیے ایک بستر موجود

ہے۔۔۔

صرف سونے کے لیے ہی گھروں کو کون جاتا ہے؟

وہ چلتا جا رہا ہے۔ کہیں تو وہ رک ہی جائے گا۔

چند دن پہلے وہ بن ٹھن کر ماریہ کے پاس گیا تھا۔ وہ اس کے باپ کے پاس بھی جانا چاہتا تھا۔ وہ انہیں دکھانا چاہتا تھا کہ وہ باہر آچکا ہے۔ وہ بے قصور ہے۔ وہ انہیں ذرا سا ڈرا بھی دینا چاہتا تھا کہ اس کے اس طرح جیل جانے پر ان کے دماغ کو وہ بھی نہیں بھولے گا۔ کبھی نہ بھی انہیں چوت ضرور پہنچائے گا۔

ماریہ تین چار مزید شادیاں تو کر ہی چکی ہوگی۔ اسے ایسے دیکھ کر ضرور پچھتائے گی۔ عدن جیسے قابل ڈاکٹر کو کیوں ہاتھ سے جانے دیا۔ باہر آ ہی گیا نا۔۔۔ کیوں طلاق لی۔ اس کا باپ ضرور ہاتھ ملے گا۔ نشہ کر کر کے کہیں مر ہی نہ گئی ہو۔

اس نے زیر لب گالیاں دی۔ خالص تاویہی گالیاں جو اس پر تشدد کرنے والے دیا کرتے تھے۔ ان گالیوں کے لائق صرف ماریہ ہی تھی۔

اسے شک تھا کہ وہ اگر زندہ ہوئی تو اسے امریکا میں نہیں ملے گی۔ عزیز کا کہنا تھا کہ وہ ایک لمبے عرصے کے لیے امریکا چھوڑ گئے ہیں۔ آغا کو اس نے تلاش کیا تھا وہ بوسٹن میں ہی تھا۔ ماریہ سے متعلق کوئی خبر نہیں ملی تھی سیٹ سے۔۔۔

وہ اپنے اور اس کے گھر گیا۔ وہ گھر بک چکا تھا۔ ناچار اسے آغا سے بات کرنی پڑی۔ اسے پہچان کر وہ چپ ہو گئے۔

”کیا چاہتے ہو؟“

”ماریہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے ایسے کہا جیسے اگلے الیکشن میں وہ گورنر کی سیٹ کے لیے کھڑا ہونے والا ہے۔ فارغ وقت میں وہ ماریہ سے بھی مل لینا چاہتا ہے۔

ذرا دیر خاموشی رہی۔ وہی اس کے فرعون صفت سابق سرکاری عظیم عادت۔

دس منٹ بعد اسے دوبارہ فون کیا گیا۔ ماریہ کے گھر کا پتا لکھوایا گیا۔ وہ خوب ہنسا۔ یعنی اس کی گری ہوئی لڑکی کو پھر اس کے سامنے کیا جا رہا تھا۔ پھر اسے اسے علاج کی ضرورت ہوگی۔ اس بار وہ اسے اس کا ٹیکس خلاصہ ضرور سنا آئے گا۔

وہ ٹیکسی سے گیا تھا اور گھروں کے نمبر پڑھ رہا تھا۔ پھر اسے یہ ضرورت بھی نہ رہی۔ ایک بڑے گھر کے سامنے بنے کھلے اور وسیع لان میں اسے ماریہ کھڑی نظر آگئی۔ وہ پودوں اور پھولوں کے ساتھ

مصروف تھی اور ایسے مصروف تھی جیسے یہ دنیا کا مقدس ترین کام ہو۔ قریب ہی گھاس کاٹنے کی مشین رکھی تھی۔ جس کے ساتھ ایک دوڑوڑا ہالی سالہ بچہ زور آزمائی کر رہا تھا۔
”مار یہ۔۔۔!“ گھر کی روش پر کھڑے ہو کر اس نے آواز دی۔

مار یہ پٹی۔ اس کا حسن۔۔۔ اف! اس کا وہ بے مثال حسن۔۔۔ عدن نے جھر جھری لی۔
امریکن میگزین میں چھوٹے چھوٹے کپڑے پہنے والی، ڈانس فلور پر جم کر ناچنے والی کا حسن نہیں تھا وہ۔۔۔ بار میں کبھی اس کی بانہوں میں، کبھی اس کی بانہوں میں۔۔۔ کبھی اس کوٹنے میں، کبھی اس کوٹنے میں۔۔۔ یہ وہ حسن نہیں تھا۔ جس کو دیکھ کر خیانت سے آنکھ ماری جائے نہیں۔۔۔ اب اسے دیکھ کر یہ جرات نہیں کی جاسکتی تھی۔

”اوہ عدن۔۔۔!“ وہ فوراً اس کی طرف آئی۔ سیاہ فام بچہ بھی ماریہ کے ساتھ اس کی طرف لپکا۔
”میرا خیال تھا، تم ایک دو دن میں آؤ گے۔ پاپا نے فون کیا تھا۔ آؤ، کہاں بیٹھو گے۔۔۔ آ جاؤ، اندر ہی چلتے ہیں۔“ پلٹ کر اس نے بے بی کاٹ اٹھایا۔ جس میں اس کی شبابت لیے ایک بچی آنکھیں کھولے دراز تھیں۔

”فلورا۔۔۔!“ اندر داخل ہوتے ہی اس نے آواز دی۔
میڈیکن میں سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں فیڈر تھا۔ جو ماریہ نے لے لیا۔
”ابراہیم ابھی اور کانٹ چھانٹ کر ناچا ہوتا ہے آپ اس کے ساتھ رہیے۔“
مار یہ اسے اپنے ساتھ لیے سنگ ایریا میں آگئی۔
”صرف پندرہ منٹ لگیں گے سارہ کو سونے میں۔ تمہیں اتنا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔“
”ایک سیاہ فام ہے۔۔۔ ایک سفید فام۔۔۔ کتنے شوہر بدل چکی ہو ماریہ۔۔۔ یا۔۔۔“
وہ اس کے سامنے صوفے پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ اس نے لفظوں کا پہلا طمانچہ ماریہ کو مارا۔۔۔ نفیس خلاصے کی پہلی سطر۔

مار یہ کے چہرے کے رنگ بدلے اور صاف نظر آنے لگا کہ وہ خود کو قابو میں رکھنے کے لیے دل ہی دل میں کچھ دوہرا رہی ہے۔ ذرا سی دیر بعد وہ مسکرائی اور اس کی طرف کامل اطمینان سے دیکھا۔
”میرا خیال تھا، تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔“ وہ پھر ایسے مسکرائی۔ جیسے عدن کی بیوی ہوتے تو کبھی نہیں مسکرائی تھی۔

”یہ۔۔۔“ اس نے سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ جس دیوار کو دیکھ کر عدن پہلے ہی منہ موڑ چکا تھا۔

”جس نے بڑا سا بیٹ بہن رکھا ہے۔ طلال ہے اور اس کے ساتھ جو پنک شرنٹ میں ہے، وہ زکریا ہے۔ دونوں اس وقت اسکول میں ہیں۔ ورنہ تم دیکھتے کہ یہ تمہیں کبھی اتنے سکون سے بیٹھنے نہ دیتے۔“ جن کی طرف وہ اتنے اطمینان سے اشارہ کر رہی تھی۔ وہ بھی سیاہ فام ہی تھی۔ ایک کی عمر تقریباً نو سال تھی اور دوسرا سات آٹھ سال کا ہوگا۔

عدن حیران ہوا۔ دیواروں پندرہ تصویروں سے ایک ہی جگہ سے بھری ہوئی تھی۔ ایک تصویر میں

ماریہ اور ایک اسمارٹ سالز کا مسکراہٹ دبائے کھڑا تھا۔ صرف اسی تصویر کو عدن نے ذرا سی دیر کے لیے دیکھا تھا۔

”ہوگا موجودہ بوائے فرینڈ۔“ وہ تمسخر سے ہنسا۔ بچوں کی تصویروں کے بارے میں اس نے کوئی بھی خیال دوڑانے کی کوشش نہیں کی۔

”یہ جمال ہے۔۔۔“ اس نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ جو گرل فاشن دم سے پکڑے کھڑا تھا اور ماریہ کھلا منہ کی طرف بڑھا رہی تھی۔

”ریکس کی جگہ اب جمال نے لے لی۔“ عدن نے ٹانگ پر ٹانگ جمانی اور جیسے باپ بیٹی ٹانگ بلایا کرتے تھے۔ ویسے ہی اپنی ٹانگ ہلانی شروع کر دی۔ مطلب ہش۔۔۔ ہش۔۔۔

”میرے شوہر۔۔۔“ ماریہ کے انداز میں فرق نہیں آیا تھا۔

”اس وقت پوگنڈا میں ہیں ورنہ تم ضرور جمال سے مل کر خوش ہوتے۔“

”شوہر۔۔۔“ اس نے بلند آواز میں بلند قہقہہ لگایا۔

”تم شوہر پالنے کا ترڈ کیوں کرتی ہو ماریہ؟“

ماریہ کا رنگ فق ہو گیا۔ عدن نے خوب مزا لیا اور ہاتھ بڑھا کر فریش جوس کا گلاس اٹھایا اور منہ سے لگایا۔

”شادی کرنے کا ترڈ تو میں نے تم سے کیا تھا۔ شوہر تو مجھے اب ملا ہے۔ بیوی تو مجھے اب بنایا گیا ہے۔“

”اے کب تک چلتا کرو گی ماریہ؟“ عدن پھر سے ہنسنے لگا۔

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ٹوٹے تعلقات ہیں۔۔۔ محبت نہیں۔“

اس بات پر وہ اتنی دیر تک ہنسا کہ تھک کر بے دم ہو گیا۔

”محبت۔۔۔ ماریہ! محبت۔۔۔ تم محبت لائق چیز نہیں ہو۔ تم ناچنے گانے۔۔۔ لڑکھڑانے تک ہی

ٹھیک ہو۔“

وہ اٹھی اور جمال کی تصویر کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ”جمال کا کہنا ہے میں وہ صبح ہوں جو زندگی کے لیے کی گئی۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔ اور تم بہل گئیں۔“

”میں ایمان لے آئی۔“ وہ بھرپور سنجیدگی سے بولی۔ ”اے دیکھ چکی تھی۔۔۔ اے سن چکی تھی۔“

اس لیے ایمان لے آئی۔“

عدن تمسخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے مذاق اڑا رہا ہو۔ جیسے کامیڈی ڈراما سمجھ کر ابھی تالیاں بجائے گا۔

”ہالی ووڈ کی کس فلم کا ہیرو ہے تمہارا یہ موجودہ شوہر۔“

ماریہ اس کے انداز پر چٹکی۔۔۔ پھر اس نے سمجھا اور جانا کہ وہ کس حد تک جمال کی ہنک کرنے والا ہے۔

”امریکا کے بڑے بزنس ٹانگیوں کا بیٹا ہے، جمال۔ اس وقت ٹائیجیریا میں ہے۔ وہاں جلدی امراض کی ایک وباء پھوٹی ہے اور وہ ہر صورت وہاں رہنا چاہتا تھا۔“

”اسے بھی تمہاری طرح شہرت کا شوق ہے؟“

”وہ چھوٹ کی بیماریوں کے مریضوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے زخم صاف کرتا ہے۔ وہ تکلیف سے کراہتے بچوں کو اپنی آغوش میں رکھتا ہے۔ وہ ان کے وہ وہ کام کرتا ہے، جو تم سے قابل ذاکر کرنے سے پہلے ناک ڈھانپ لیتے ہیں۔ مجھ سے غیر انسانی لوگ منہ موڑ لیتے ہیں۔ وہ ناک نہیں ڈھانپتا، ہاتھ نہیں غنچتا۔ تیسری دنیا کا ایک چھوٹا موٹا شہر خرید لینے کی استطاعت رکھنے والا جمال یہ سب کرتا ہے عدن۔۔۔! شاید یہیں اندازہ ہو گیا ہوگا میری خوش قسمتی کا۔۔۔ ایسی قسمت کہ جمال میرا شوہر ہوتا۔ ہاتھ جوڑ کر یہ خوش قسمتی میں نے خدا سے مانگی تھی۔ زخم زخم صاف کرنے والے کی میں نے جا کر منت کی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کر لے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے بھی بیمار، لاچار ہی سمجھ لے اور میرا زخم، زخم صاف کر دے۔ صرف اتنا ہی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھ لے۔ میں نے خدا سے پہلی بار دعا کی کہ وہ مجھے جمال دے دے۔“

نٹے میں بدست ہو کر ہر بات پر گالی نکالنے والی خدا کا نام لے رہی تھی۔ دعا کرنا سیکھ گئی تھی۔ عدن پھر ہنسا۔ اس بار اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس پر ہنسا۔ وہ اس کے گھر میں بیٹھا تھا۔ جس کی آرائش کو اسی دے رہی تھی کہ یہاں ایک خاندان آباد ہے۔ یہاں کچھ لوگ محبت سے رہتے ہیں۔ گھر خوب صورت تھا۔ سجا ہوا تھا۔ لیکن وہ نمائش کی کوئی دکان نہیں لگ رہا تھا۔ بات ختم کر کے ماریہ خاموشی سے عدن کو دیکھنے لگی۔

”نچ تیار ہے عدن۔۔۔!“

وہ چونکا۔ وہ انکار کر کے اٹھ جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ سر ہلا کر اٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر اور اس گھر میں گزارنا چاہتا تھا۔

ماریہ، ابراہیم کو کھلاتی رہی۔ وہ اتنے خخرے کر رہا تھا کہ عدن کا جی چاہا، اس کی کرسی الٹ دے۔ وہ اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔

”انہیں کہاں سے اٹھایا ہے؟“ عدن نے انگلیں میں اتنی بے رحمی سے کہا کہ ابراہیم ایک دم چپ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ غصے سے ماریہ کا منہ سرخ ہو گیا۔

”مہیں اس انداز میں بات نہیں کرنی چاہیے۔“

”کیا یہ سچ نہیں۔۔۔ جگہ جگہ سے اٹھا کر انہیں گھر میں لا رکھا ہے؟“

ماریہ نے ایک نظر ابراہیم کی طرف دیکھا اور اس کے گال چومے۔

”یہ ہمارے بچے ہیں صرف۔۔۔ یہ ہمیں خدا کی خاص رحمت سے ملے۔۔۔ وہ توفیق، جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اسی سے۔۔۔“

اتنے کرارے جواب پر عدن بد مزہ ہو گیا۔

”تو اب چیریٹی کر کے سکون حاصل کرتی ہو؟“

”جمال مجھے مل چکا ہے۔ سکون کی تلاش نہیں ہے مجھے۔۔۔ سکون کی تلاش چند سال پہلے تھی۔ اسی

تلاش کا انعام ہے جمال۔۔۔ تم کب کر رہے ہو سکون کی تلاش؟“

”میرے پاس بہت سکون ہے۔“ نینکن سے ہونٹ صاف کیے۔
 ”کیا یہ سچ ہے؟“ اس نے دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکا دیں اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ عدن اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا۔

”مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟“
 وہ اس پر تھوکنے کے لیے ملنا چاہتا تھا۔ ایک آخری دھتکار کے لیے۔ عدن کا جی چاہا، اپنی حسرت پوری کر رہی لے۔ ڈرگزر کا کیز اب کیسے بن ٹھن کر گواں کر رہا تھا۔

”اپنے لیے سکون کی تلاش جلد ہی کر لو۔۔۔“
 ”عالم بھی بن گئی ہو یا نہ۔۔۔ مجھے تو ٹھیک سے تمہارے مذہب کا بھی نہیں معلوم۔“ یہ بات وہ کہہ رہا تھا، جسے ٹھیک سے اپنے مذہب کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

”رب العالمین سے اپنے لیے دعا کرو۔۔۔“
 ”خدا کے نام بھی سیکھ لیے ہیں؟“
 ”نماز پڑھا کرو۔۔۔“

”نیک چھی ہو گئی ہو۔۔۔ اتنا حیران مت کرو۔۔۔“
 ”لوگوں پر رحم کیا کرو۔۔۔“
 ”تم تو فرشتہ بن گئی ہو۔۔۔“

”اپنے کنا ہوں پر توبہ نہیں کر سکتے تو شرمندہ ہونا ہی سیکھ لو۔۔۔“
 ”شیخ اور رئیس کے علاوہ کتنوں کا نام لے کر توبہ کی بھی تم نے؟“
 ”توبہ کرو تو اس یقین کے ساتھ کرو کہ وہ تمہیں معاف کر دے گا۔“

”تم تو حیران کر رہی ہو، ہسکی، شراب کے ذائقے بھول گئی ہو؟“
 ”حرام سے ہر حال میں بچ کر رہنا۔۔۔ خدا سے معافی مانگو۔۔۔ وہ سب دیتا ہے۔ تیونس کے خیراتی اسپتال کے غلیظ سے اسٹور روم میں روتے بھی اس نے مجھے سن لیا۔ ہر طرح کے حرام کو چکھ چکی میری زبان کو بلکتے اس نے مجھے سنا۔ یقین جانو، ایسا ہوا۔“

”بند کرو اپنا یہ وعظ۔۔۔“ عدن اٹھ کھڑا۔
 ”میں اپنا فرض ادا کر رہی ہوں۔ میرے لیے یہ فرض کبھی کسی اور نے ادا کیا تھا۔ افریقہ کے صحراؤں میں۔۔۔ تمہارے لیے میں ادا کر رہی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔ ”مشفق سی وہ عدن کو بہت پیاری لگی۔

وہ اس گھر سے جا رہا تھا۔ جانا ہی تھا اور وہ جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے دل میں آئی کہ وہ یہیں ماریہ کے سامنے بچھ جائے اور رونے لگے۔ التجا کرے کہ ماریہ اسے کہیں چھپالے۔ ایسی باتیں کرتی وہ کتنی انہونی لگ رہی تھی۔ اریہ غیرے کے نگلے سے جھول جانے والی۔

وہ ماریہ کے قریب آیا اور ہاتھ اس کے گال کی طرف بڑھایا، ماریہ دو قدم پیچھے ہوتی حیران ہوئی۔
 ”مجھ سے دور رہو۔۔۔“
 ”تم میرے لیے ایسی کیوں نہ بنیں ماریہ؟“

”تم جمال کیوں نہ بنے؟ تم خریدنے والوں میں سے نہیں ہو۔۔۔ صرف محبت ہی ایک مکمل انسان کو خریدنے کا ہنر رکھتی ہے۔ تم نے یہ ہنر سیکھا ہی نہیں۔“

عدن اکڑ کر چلتا ہوا ماریہ کے پاس گیا تھا۔ وہ خود کو گھسیٹتا ہوا وہاں سے نکلا۔ سو میٹر کی دوڑ میں ریکارڈ بنانے والے سے اب کوئی پوچھے۔ پیچھے رہ جانا، ہار جانا کسے کہتے ہیں؟

اس نے اگلی کئی راتیں بارش میں گزاری۔ کئی طرح کے افسوس آگے تھے اسے۔ لیکن وہ ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ باتیں، یہ وعظ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ الکل کو اپنے اندر اٹھیلے ہوئے اس نے سب ہار دیا۔

افتق کو کیسے ہار جاتا؟

خالی ہاتھ رہ جانے والا افتق کو کیسے جانے دیتا؟

”ماریہ۔۔۔ آخ تھو۔۔۔ محبت۔۔۔ جمال۔۔۔ تھو۔۔۔ وہ بچہ کیا جانے محبت کیا ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے۔۔۔ بنگلے میں رہتے ہیں نے ایک معمولی لڑکی سے محبت کی۔۔۔ ہے کسی میں یہ حوصلہ۔۔۔ میں نے کی۔۔۔ ڈاکٹر عدن نے۔۔۔ جس کے پیچھے ایک عالم یا گل تھا۔“ وہ بڑبڑاتا رہا۔

”ایسے کیسے افتق کو چھوڑ دوں۔“ کتنا ہی گر جائے کتنا ہی جھٹک لے۔ افتق کو کیوں چھوڑے وہ؟

”خدا کو مجھے امان دینا ہی ہوگا۔“ افتق بہت بار اسے کہہ چکی تھی۔

”تم خدا کو میرے لیے اتنا تنگ کرتی ہو؟“

”میں تو التجا کرتی ہوں۔“

”جو ہوتا ہے۔ اچھا ہی ہوتا ہے۔“ اس نے انگریزی میں مثل بیان کی۔

”کیا مطلب ہوا، اس بات کا؟“

وہ دل کھول کر ہنسا۔ وہ تو اسے تنگ کر رہا تھا۔

”یعنی کہا اگر تمہارے کہنے پر بھی خدا مجھے نہیں نہ دے۔۔۔ تو۔۔۔“

”اتنی بڑی بات۔۔۔ اتنی بدشگونی۔۔۔“ وہ رونے لگی۔

”تو تمہیں کوئی اور مل جائے گا۔ کوئی رکشہ، ٹیکسی چلانے والا۔۔۔“

”ایسی منحوس بات۔۔۔ ایسی۔۔۔“ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔

وہ بدشگونی تو اس کے لیے ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا۔ رونا تو اسے چاہیے تھا۔۔۔ کاش! وہ ایسی بات نہ کرتا۔۔۔ یہ سب اسی منحوس ساعت کی وجہ سے ہوا۔

”پاپا! کوئی لڑکی ہے؟“ چلتے چلتے اس نے فون نکال کر پاکستان کال کی۔

”لڑکی۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟ تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ اس کی آواز اور انداز پر گھبرا گئے۔

”اب آپ کس سے میری شادی کریں گے؟“

”تم پہلے پاکستان تو آؤ۔۔۔ بہت لڑکیاں ہیں۔“

”کیا واقعی بہت ہیں؟ ابھی بھی بہت ہیں؟ کیا ان میں کوئی ایک افتق جیسی ہے۔۔۔ یاد آئی آپ کو افتق۔۔۔ وہی افتق جسے۔۔۔“

غلام علی نے فون بند کر دیا۔ ”بد ذات۔۔۔“

بند فون کو وہ کان سے لگائے رہا۔

”جانتے ہیں آپ، وہ کتنی بڑے دھوکے باز نکلی۔ کہتی ہے، مجھ پر ایک نظر ڈالنا نہیں چاہتی۔ کہتی ہے مجھ پر محبت واجب نہیں ہوئی۔ اس بات کا کیا مطلب ہے پاپا۔۔۔! ماریہ بھی یہی کہتی ہے۔۔۔۔۔ کچھ ایسا ہی۔ آپ نے مجھے اس بارے میں بتایا ہی نہیں۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے۔ میں تو ہمیشہ شان سے جیتا ہوں نا۔ اب کیسے میں ٹیل ہو گیا۔ صرف اسی ایک کھیل میں کیوں۔۔۔ میں نے تو جم کر کھیلا تھا۔ پہلے تو افق میری ہر بات کا یقین کر لیتی تھی۔ اب کیوں نہیں کرتی۔ میں نے کتنی بار اسے کہا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اسے کھونا نہیں چاہتا۔ پاپا! اسے فرق ہی نہیں پڑا۔ کیا اوقات پیے فرزام کی میرے سامنے۔۔۔ اندھی ہوئی ہے افق۔۔۔ مجھے سننا نہیں چاہتی۔ ایسی بہری پہلے تو نہیں تھی۔۔۔ ایسی بہری وہ کب سے ہو گئی؟ وہ نہیں مان رہی۔ فرزام کو چھوڑنے کے لیے وہ نہیں مان رہی۔ میں فرزام کو مجبور کر دوں گا۔ وہ اسے چھوڑ دے گا۔ پھر وہ میرے ہی پاس آئے گی۔ فرزام اسے چھوڑ ہی چکا ہے۔“

سڑک پر چلتے وہ بہت دیر تک فون سے باتیں کرتا رہا۔۔۔ اور پھر ایک بار میں بیٹھ کر بڑبڑانے لگا۔

”میں ہر طریقہ آزمائوں گا۔ میں بہت ذہین ہوں، میرے پاس بہت سے راستے ہیں۔“

اس کی بلند بڑبڑاہٹ پر ایک دوا سے اچنبھے سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اتنے بھی حیران نہیں تھے۔ ایسی فلمیں وہاں ہزاروں بار چل چکی تھیں۔

عبادت گاہوں میں بڑبڑانے والوں کو عقیدت کی نظریں نصیب ہو ہی جاتی ہیں۔ انہیں پاگل بھی سمجھا جاتا ہے تو خاص رتبے کا پاگل سمجھتے ہیں۔

ایسی جگہوں پر بڑبڑانے والوں کو لوگ مزے سے گالیاں دے جاتے ہیں۔ ٹھوکریں مار جاتے ہیں۔ یہی ان کا رتبہ ہے۔

وہ حلق تک شراب انڈیل چکا تھا۔ نشہ تھا کہ آکر نہیں دے رہا تھا۔ ایک ہی نشہ تھا۔ جا کر نہیں دے رہا تھا۔۔۔ افق کے انداز کا۔۔۔ وہ ماریہ کو گالیاں بک رہا تھا۔ فرزام کی شان بیان کر رہا تھا۔ لیکن افق کی شان میں کوئی گستاخی نہ کر سکا۔

ٹھیک ہے، اگر افق چاہتی ہے تو یہی سہی۔ اگر وہ اس کی راہ میں بچھ جائے۔۔۔ تو وہ آئے گی اس کے پاس۔۔۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔۔۔ وہ پہلی محبت ہے افق کی۔۔۔ وہ پہلا مرد جس کے لیے اس نے اپنی ذات کے دروازے کھولے۔ افق یہ کیوں بھول رہی ہے کہ امان سے ہی اس کی محبت کی ابتداء ہوئی۔۔۔ انتہا بھی امان پر ہی ہوئی چاہیے۔۔۔ ایک مشرقی لڑکی ہے وہ۔۔۔ اس میں رد و بدل کس طرح کر سکتی ہے۔ ایسی محبت کر کے وہ امر ہو جاتی۔ کسی اور کی زندگی میں جا کر اس نے یہ کڑی کیوں توڑی؟ افق کو تو سزا ملنی چاہیے۔ اسے یہ حق کس نے دیا کہ وہ کسی اور سے محبت کرے؟ اگر اسے یہ حق استعمال کرنا ہی تھا تو پور پور اسے امان میں نہیں اترنا چاہیے تھا۔ سارا قصور افق کا ہے۔

فرزام نامی تعلق کو وہ آگ لگا آیا تھا۔ دنیا کو وہ آگ لگا دے گا۔

اس کی ٹانگ پر بھاری جوتے کی ضرب لگی اور ڈوبتی ابھرتی ایک آواز سنائی دی۔

”تم یہاں سے دفعان کیوں نہیں ہو جاتے؟“

کون تھا، جو اس کے کان کے پاس غرار ہا تھا۔ عدن نے ہوا میں کے لہرائے اس کے جڑے پر ایک زوردار گھونسا پڑا۔ اس نے اٹھنا چاہا اور وہ گر گیا۔ جھٹکا کے کی آواز آئی۔ شاید بہت کچھ گرا۔۔۔ اس کے پیٹ میں لاتوں کی بارش ہو گئی۔ وہ بھی ہاتھ پیر ہلاتا رہا تھا۔ ابھی اس میں ہمت تھی۔ وہ مار سکتا تھا۔ وہ ہاتھ لہرا رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا۔ لیکن اٹھ کر ہر بار وہی گر رہا تھا۔ اس میں بہت بہت تھی ابھی بھی۔۔۔

وہ مار کھا رہا تھا۔ اسے پینا جا رہا تھا۔ اس کے کپڑے مخلول سے گیلے ہو چکے تھے۔ جانے کیا کیا کچھ گر گیا تھا اس پر۔ وہ چلا رہا تھا اور جیسے جیسے اس کے چلانے کی آواز بلند ہوئی تھی۔ ویسے ویسے اس کے منہ پر۔۔۔ پیٹ میں۔۔۔ کمر میں آگھکھونے لگتے تھے۔ اسے کئی بار گریبان سے پکڑ کر گردن میں ہاتھ ڈال کر کھڑا کیا گیا۔ کھیٹا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرتا ہی جا رہا تھا اسے خفیہ جیل خانہ یاد آ گیا۔ وہ حلق پھاڑ کر چلانے لگا۔ ”چھوڑ دو مجھے۔۔۔ نہیں ہوں میں دہشت گرد۔۔۔ میں۔۔۔ پانی دو مجھے۔۔۔ چھوڑ دو کتوں مجھے۔۔۔“ اسے چٹا گیا۔

”میں دہشت گرد نہیں ہوں خبیثوں۔۔۔“ اس کا سر کسی وزنی چیز سے ٹکرایا۔ جلتی بجتی لائٹس اس کے آگے چھتے رقص کرنے لگیں۔ وہ کہاں پڑا ہے؟ فٹ پاتھ پر۔۔۔ سڑک پر۔۔۔ یا کسی گندی سی گلی کی غلیظ سی جگہ پر؟ اور پھر اس کی پروا کسے تھی۔ پروا کرنے والے عدن جیسے نہیں ہوتے۔ وہ عدن کی طرح نہیں ہو جاتے۔ اس کی جیب میں رکھا فون بج رہا تھا۔ اس کا باپ اسے فون کر رہا تھا۔ شاید اب وہ عدن کو کوئی نئی راہ دکھالے۔ زندگی گزارنے کا کوئی نیا گر۔۔۔ نئی مشق۔ اب وہ اسے کسی اور میدان کا رنگ ماسٹر بننے کے لیے کہے گا۔ شاید اب وہ کتے، بلیوں سے اوپر کا کوئی اور جانور نما انسان اسے سدھارنے کے لیے اکسائے۔ وہ عدن کو بتائے کہ اس کا باپ وہ ہے۔۔۔ غلام علی غلام۔۔۔ عدن اس کا باپ نہیں ہے۔

اس کے سر کے پھیلے حصے سے خون کی ایک پتلی لکیر کپٹی سے ہوتی ہوئی بدبودار جگہ میں جذب ہو رہی تھی۔ ایسی ہی ایک لکیر اس کے منہ سے نکل کر اس کے گریبان تک جا رہی تھی۔ اس میں اٹھ کر چلنے کی سکت نہیں اور وہ فرزام کو مار دینا چاہتا تھا۔ شراب پی کر وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور افق کے ساتھ جینا چاہتا تھا۔۔۔ امریکی عدالت میں اس کا مقدمہ چل رہا تھا اور وہ ابھی بھی بہت سوں کو پیروں تلے مسل دینا چاہتا تھا۔ اس کے باپ نے اسے بھی ہارنا نہیں سکھایا تھا۔ وہ سکندر اعظم بنا اور نہ منہ پڑا تھا۔ جن انسانوں کو وہ پچھاڑنے گیا تھا۔ ان سے وہ پچھاڑ آیا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ مگر مان نہیں رہا تھا۔ ”افق میری ہے۔۔۔ فرزام اسے چھوڑ دے گا۔“ وہ بڑبڑاتا رہا۔ وہ ضدی ہے۔۔۔؟ نہیں۔

وہ بد نصیب ہے۔۔۔ نہیں۔ وہ قفل زدہ ہے۔۔۔ وہ قفل جو بے ہدایتیوں پر لگتا ہے۔۔۔ وہی قفل، جسے وہ توڑنا ہی نہیں چاہتے۔

فرزام گھر آیا تو تیزی سے بلڈنگ کی سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آیا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ اسے خوشی ہوئی۔ انجانی خوشی۔۔۔ رات کے اس پہر۔۔۔ اس آخری پہر یہ دروازہ ایسے ہی نہیں کھلا۔ سارا گھر روشن تھا۔ جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ ویسا ہی۔۔۔ وہ دیا بھی نہیں تھا۔ جس عورت کو وہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھی اور گھر تک آتے جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اسے دروازے پر نظریں گاڑے ہی ملے گی، وہ وہاں نہیں تھی۔

اس نے سارا گھر دیکھ لیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے بار بار دیکھا۔ حد تو یہ کہ اس نے کپڑوں کی الماری تک کھول کھول کر دیکھی۔

یہ جو وقت گزر گیا۔۔۔ یہ صرف ایک وقت نہیں تھا۔ یہ ایک پیمانہ تھا۔ جو انہیں بتا گیا تھا کہ ان کی محبتیں اس پیمانے میں کہاں ہیں۔۔۔ کس درجے پر ہیں۔

فرزام نے وہ درجہ دیکھ لیا تھا۔

یہ صرف ایک رات نہیں تھی۔۔۔ گھب رات۔۔۔ یہ ایک حساب کتاب کی رات تھی۔۔۔ وہ اس میں موجود محبت کا حساب کمال انداز سے کر چکی تھی۔

اسے افسوس ہوا۔ وہ واپس کیوں آیا۔ افق تو جا چکی تھی۔

وہ عدن کے پاس گئی ہے۔۔۔ یادہ اس سے ناراض ہو کر گئی ہے۔

اس نے خود سے بھی چمپا کر دیا کہ وہ ناراض ہو کر ہی گئی ہو۔ اس کے سارے اعتراضات ابھی بھی اس پر وہی تھے۔ لیکن ایک یہ دل ہے۔ جو اپنے ہی حکم صادر کرتا ہے۔ الگ ہی کھڑا ہوتا ہے۔

فرزام کے پاس افق کے لیے وہی دل تھا۔۔۔ وہی دل جو افق ڈھال گئی تھی اپنی طرز پر۔ وہ بار بار اس کے راستے میں کھڑا ہونے کے لیے تیار تھا۔

وہ بار بار اس کی منت کرنے۔۔۔ گڑ گڑانے کے لیے تیار تھا۔

یہ دل جو الگ ہی مقام پر کھڑا ہوتا ہے۔

پلٹ کر۔۔۔ لپک کر۔۔۔ افق سے لپٹ جانے کے لیے تیار تھا۔

اعتراضات۔۔۔ شکوک و شبہات۔۔۔ غصہ، نفرت، بے گامگی۔۔۔ سب ابھی بھی وہیں تھے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ دل بہت تیز ہوتا ہے۔ بہت پھر تپتا۔۔۔ وہ اس جنگ میں فاتح رہا۔

بہت دیر گزری۔ فرزام نے سراٹھایا۔ اسے آہٹ سنائی دی تھی۔ اسے ایسی ہی آہٹ پہلے بھی بہت بار سنائی دی تھی۔ سنگ ایڑیاں فلور کشن پر بیٹھے میز پر سر ٹکائے فرزام نے آنکھوں کو اٹھایا۔

وہاں سامنے افق کھڑی تھی۔ دروازے میں۔

گہرے پاتال سے وہ اوپر آیا۔ یک دم جھٹ سے۔

اسے کے سارے یقین سچے تھے۔

اس کے سارے شکوک جھوٹے تھے۔

سب دیپ جل اٹھے۔ دپک راگ آب و تاب سے گونجنے لگا۔

”کہاں تھیں تم۔۔۔؟“ اٹھ کر بھاگ کر اس سے لپٹنے سے پہلے اس نے یہ پوچھا۔ اسے جواب چاہیے۔ ٹھیک وہی، جوان دونوں کو بچا سکے۔ وہی جواب چاہیے۔
 ”تمہیں ڈھونڈنے۔۔۔“ اس پر نظر پڑتے ہی وہ شانت ہو گئی اور فرش پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اتنے بڑے شہر میں وہ اسے ڈھونڈنے نکلی تھی۔ جبکہ جانتی تھی اسے ڈھونڈ نہیں سکتی۔ جو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ وہ ایسے ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ پھر بھی وہ اسے ڈھونڈنے نکلی تھی۔
 ”میں تمہیں ڈھونڈنے نکلی تھی۔“
 ”یہ مجھے ڈھونڈنے نکلی تھی۔۔۔“

ایک نیا لوگ گیت محبت کے لیے لکھا جا رہا تھا۔
 فرزام چل کر اس کے پاس آیا اور اس کے بالکل پاس نیچے بیٹھ گیا۔
 ”میں ہر سانس کے ساتھ تمہاری منت کروں گی۔ آنسوؤں کا ہر رنگ لیے روؤں گی۔۔۔ فرزام!
 میں تمہیں خود کو چھوڑنے نہیں دوں گی۔۔۔“
 فرزام نے بڑھ کر اسے خود میں سمیٹ لیا۔
 لوگ گیت لکھا گیا۔



اپنی ہیروئن کا ہیرو بننے کے لیے وہ دریائے سین (پیرس) کے آس پاس ٹہل رہا تھا۔ اسے وہاں کسی کا انتظار نہیں تھا۔ یہ نوبت نہیں آتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ غضب کا موسم تھا۔ اچھی ہوا چل رہی تھی۔ دراصل کافی رومان پرورد ہوا تھی۔ کیا پیرس میں ایسی ہی ہوا چلتی ہے، شاید یہ صرف محبت کرنے والوں کے لیے ہی چلتی ہو۔ ان ہی پر اثر کرتی ہو۔

اس کی ہیروئن ایک بہت بڑی آکس کینڈی کھا رہی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ اکیلی ہی کھا رہی تھی۔ وہ اسے دینا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کا دایاں ہاتھ کوٹ کی بائیں جب میں پھنس چکا تھا۔ نکل ہی نہیں رہا تھا وہاں سے۔۔۔ جب تک وہ ہاتھ باہر نہیں آئے گا وہ بے رحم ہی بنی رہے گی اس کے ساتھ۔ وہ آس پاس دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس کوشش میں ناکام ہو رہی تھی۔ اس کی نظریں اسی پر لگی تھیں۔

اور وہ ہنس رہا تھا۔ ہاتھ برآمد نہیں کر رہا تھا۔ لطف اندوز ہو رہا تھا۔
 وہ تب بھی ہنسا تھا اور عدن کے تاثرات پر لطف اندوز ہوا تھا۔ جب بہت سے شراب خانوں میں سے اسے ڈھونڈ ڈھاؤ اس نے ایک گھونسا بڑا اٹھا۔

”میں افق کو ضرور چھوڑ دیتا۔۔۔ اگر میں عدن ہوتا۔“ اس نے کہا تھا۔ عدن پر جیسے سب ہی آسانی جلیاں آگریں۔ اس کی شکل بتا رہی تھی، ایسا ہوا ہے۔ وہ بری طرح سے پٹ چکا ہے۔
 افق کو آکس کینڈی بالکل مزا نہیں دے رہی تھی۔ اسے فرزام پر غصہ بھی آرہا تھا۔
 گٹار لیے ایک بے حد خوب صورت لڑکے Jeff Beck (گلوکار) کو گارہا تھا۔ یقیناً وہ اپنے

سامنے بیٹھی لڑکی پر اپنا جادو جگانا چاہتا تھا اور یقیناً وہ اسے کچھ اور بتانا چاہ رہا تھا۔

"I am in love

Oh i am in love"

کوٹ سے ہاتھ برآمد ہو چکا تھا۔۔۔ ہاتھ مٹھی بند تھا۔۔۔ یقیناً اس میں بہت کچھ خاص بند تھا۔

I am all shock up

well my kness are shaking...

my hands are getting weak...

and

to stand on my own two...

Can't seem

مسرت کی ایک تیز لہرائی میں جاگی۔۔۔ بند مٹھی کے ساتھ فرزام گھٹنوں کے بل جھکا۔
پیار کے پہلے شہر میں رہنے والے ایسے مناظر پر جشن مناتے ہیں۔ آس پاس ارد گرد پھیلے ہوئے
لوگ فوراً متوجہ ہوئے۔۔۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ کچھ صرف گردنیں موڑ کر دیکھنے لگے۔۔۔ وہ جانتے
تھے انہیں کیا کرنا ہے۔

I fear...

I am in Love.... oh

I am in Love....

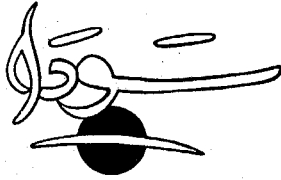
اس نے بند مٹھی کھولی۔ انگوٹھی کو دو انگلیوں میں لیا۔ گتاف انگل کے ٹاور نے ذرا سا جھانک کر دیکھا۔
روایت زندہ کی جارہی تھی۔ محبت کے اظہار کی رسم نبھائی جارہی تھی۔ صدیوں پہلے کی۔۔۔
صدیوں بعد کی۔۔۔ صرف یہی ایک رسم زندہ جاوید کر دینے کے لیے کافی ہے۔
نامحسوس طور پر نوجوان لڑکے لڑکیوں کا۔۔۔ بوڑھوں کا۔۔۔ بچوں کا ایک دائرہ بن گیا۔۔۔ سب
زیر لب مسکرا رہے تھے۔ وہ اس بدیسی کے کچھ بولنے کے انتظار میں تھے۔ وہ اس کے سامنے کھڑی لڑکی
کی شرمیلیں مسکراہٹ کے انتظار میں تھے۔
”یہ انگوٹھی تمہاری ہے۔۔۔ اس انگوٹھی کو تھامنے والا ہاتھ تمہارا ہے۔ اس ہاتھ کے مالک کا دل
تمہارا ہے۔۔۔ کیا یہ دل ہمیشہ کے لیے تمہارا ہی رہ سکتا ہے۔۔۔؟“

اتنی نے ایک بلند قہقہہ فضا میں پھوڑا۔

”ہاں۔۔۔“ وہ ذرا سا چلائی۔ انگوٹھی سے اس کا ہاتھ دکنے لگا۔۔۔ اور انگوٹھی پر اتنی نے اپنے
ہونٹ رکھ دیے۔ دائرے کی صورت کھینچنے لوگوں نے دل کھول کر تالیاں بجائیں، Jeff Beck کا
”آئی ایم ان لو۔۔۔ آئی ایم ان لو“ تیز ہو گیا۔

محبت کی رسم نبھادی گئی۔۔۔ اور۔۔۔ محبت مقدس ٹھہری۔





او میری میا۔۔۔ مجھے معاف رکھو بیجوے تو یہ رہے۔۔۔“ اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور دونوں ہاتھ اس کے عین منہ کے سامنے لا کر زور سے تالی بجائی۔
 ڈھول بجایا جا رہا تھا۔ تینوں آوازیں ڈوب ابھر رہی تھیں۔
 وہ بت بنی کھڑی تھی۔ سرخ رنگی سوٹ میں گہرا میک اپ تھوپے بالوں کو کھولے دوپٹے کو دور پرے پھینکے وہ تالی پیٹ رہا تھا، ایک پیر کو اٹھائے ناچ ناچ کر اس کے گرد گول گول گھوم رہا تھا۔
 وہ چلانے کی وہ ناچتا ہی رہا، تالی کی آواز نے زور پکڑ لیا، ڈھول اور زور سے بجنے لگا۔ اگلے سیدھے بال، گہرا میک اپ گڈنڈ ہونے لگے، گول گول گھومتی زمین بھی اسی کے ساتھ پیر اٹھائے ناچنے لگی۔

نوری اور زیادہ چلانے لگی، چلاتی ہوئی ہی ہڑبڑا کر اٹھی۔
 یہ گرو اس کی جان لے گا، اس کی نیندوں میں آجاتا۔ اسی ڈر سے وہ سوتی نہیں تھی۔ آدھی جان نوری کی نکل چکی تھی۔ اب پوری لے کر ہی وہ ٹلے گا، رات کا پہلا پہر ہی گزرا تھا وہ ایسے ہانپ رہی تھی جیسے اپنی پیدائش کے دن سے بھاگی پھر رہی ہو۔ کائنات کے سارے حشرات اس کے پیچھے اسے نوچ کھانے کے لیے لگے ہوں۔ وہ اٹھ کر باہر بھاگی۔ چھوٹے سے لان میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ ٹھنڈے گھاس پر پتے پیر رکھے جاڑے کی راتوں میں وہ بنا شمال سوئیٹر کے بجتی تالیوں اور بازگشتوں سے کانپ رہی تھی۔

میری میا۔۔۔

اس نے سر تھام لیا اور کانپتی رہی۔

”نوری“ کوئی اسے جھٹکے دے رہا تھا وہ ہڑبڑائی کہ وہی آگیا۔

”جا جا کر اندر سو۔“ وہ جھنجھلایا ہوا کہہ کر چلا گیا، اس نے خوف سے اندر کی طرف دیکھا۔

”وہ آیا کہ آیا“ اپنے کمرے میں وہ نہ جاسکی۔ بس کمرے میں جس میں ساٹھ ہزار کا بیڈ چالیں ہزار کی دو کرسیاں اور بارہ ہزار والا میز رکھا تھا۔ بائیس ہزار کا قالین تھا جو ذرا سے حصے میں بچھا تھا۔ سفید چمکتے ماربل پر گہرا سبز قالین، بہت کچھ تھا کمرے میں اس کی الماری میں۔ اس سارے گھر میں کچن کی

الماریوں میں فریق کے خانوں میں، بہت جمع کیا تھا ان دونوں نے گھر بھر میں بہت کچھ تھا۔ بہت کچھ ان کے پیٹ میں جا چکا تھا۔ پیٹ سے سارے جسم کی نالیوں میں خون بن کر پہنچا تھا، انہوں نے بہت کچھ کھایا تھا، بہت پیتا تھا، وہ کس کمرے میں جائے اور سو جائے؟ اس میں یا اس میں یا اور پر والے یا کسی بھی کمرے میں چلی جائے؟ نہیں وہ ہر جگہ ہے جہاں جہاں وہ سوئی یہ اگر وہ اڑ کر آسمان پر بھی جاسوئی تو وہ وہاں بھی ضرور آئے گا انہیں بھجوا کہنے والا۔

دن کا اجالا پھیل رہا تھا وہ اندر آئی اور دونوں بچیوں کے بیڈ پر جگہ بنا کر لیٹ گئی۔ دونوں کے ہاتھوں کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔

بچے فرشتے ہوتے ہیں نا شاید کوئی فرشتہ اسے بچالے، کس سے؟ نوری کو نوری سے نوری کو نوری کے ہی شرسے۔

دونوں بہت سالوں پہلے اپنے گاؤں سے بھاگ آئے تھے۔ ذات پات، برادری، غیر برادری کا مسئلہ نوری کا ابا رشتہ کہیں پکا کر رہا تھا۔ اس نے رات سے دن نہ ہونے دیا۔ بھٹک پڑے ہی جاوید کے کان بھرے اور دونوں شہر بھاگ آئے۔ چھ سات ماہ درباروں کے مہمان خانوں میں سوتے جاگتے رہے۔ جاوید کام کرنے چلا جاتا۔ رات کو وہیں آ جاتا، دونوں نے نکاح کیا اور پہلی بچی ہوئی۔ دونوں ایک کمرے کے خستہ حال گھر میں رہنے لگے۔ کمر اتنا چھوٹا کہ ہاتھ لگاؤ تو چھت چھو لو۔ بیٹھے بیٹھے چاروں دیواروں کو پکڑ لو بارش ہو تو کمرے سے ہی پانی بھرو۔ گندی نالیوں اور کٹر کا سارا پانی اندر آ جاتا۔ دونوں نوالے گن گن کر کھاتے، محبت کے لیے قربانی دے رہے تھے۔ ایک وقت کا کھاتے تو اگلے تین چار وقت بھوکے رہتے۔ گاؤں کا فقیر شہر کے غریب سے بھلا ہوتا ہے۔ گاؤں میں بھوکوں مرنے کی نوبت نہیں آتی، رحمت ہے اللہ کی گاؤں والوں کے ساتھ، شہر والوں کی طرح اناج کے دانے نہیں گنتے۔ جاوید اور نوری نے ایسے دنوں کا بھی نہیں سوچا تھا۔ جاوید چار چار پر اٹھے کھانے والا سوکھی روٹی سے بھی گیا۔ دیکھی مرغیاں کھانے والے قربانی کے موقع پر عید کے گوشت سے بھی گئے۔ غربت بہت بری ہوتی ہے۔ شیطان پر سارے الزام ایسے ہی دھرے جاتے ہیں، شیطان کا اگلا نام غربت ہے یہ جو انسانیت کی معراج کے قصبے لکھنے والے ہیں نا وہ غریب نہیں ہوتے ورنہ وہ طے کرتے کہ غربت میں شیطانیت معراج ہی ہوتی ہے۔

جاوید سبزی کی ریڑھی لگانے لگا۔ گلی، محلے، کالونیوں، سوسائٹیوں میں جاتا، ایک دن ایک زمانہ سا آدی گھر لے آیا۔

”بھابھی سلام۔“ اس کا انداز بھی زمانہ تھا۔

”رشید ہے۔ یہ۔“ جاوید بلاوجہ مسکرائے جا رہا تھا۔

”رشید۔۔ کون رشید؟“

”رشید عرف چاند، رشید ولد شیش ولد لاپتہ۔“ بس رشید کا تعارف یہ ہی تھا۔

”اتنی سی ہے یہ۔“ اسے دیکھ کر رشید نے چٹکی بنائی۔

”تیرے پاس دو پیسے نہیں کے اسے کھلا دے۔“ وہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔ جاوید اپنے پیلے دانتوں

سے ہنسنے لگا۔

”چل تجھے منڈی لے کر چلوں۔“

جاوید رشید کے ساتھ جھٹ منڈی چلا گیا۔ واپس آیا تو تازہ پھلوں کے کریٹ ساتھ تھے، دونوں اس پر ٹوٹ پڑے۔ سیر ہو گئے دونوں۔

”چند دن گزرے تو وہ پھر سے آیا۔“

”ہاں اب ٹھیک ہے۔“ پھر جاوید کے کان میں سرگوشی کی۔

”پکی ہے نائیہ۔“ جاوید نے صرف سر ہلایا۔

”فکر نہ کر ٹوٹو باپ ضرور بنے گا، میں تجھے باپ ضرور بناؤں گا۔“

”بچی۔۔۔“ رشید چاند نے جاوید کا ہاتھ چوم لیا۔ کندھے پر ہمہ وقت دھرے چیک کے رومال سے آنکھیں صاف کیں۔ داڑھی نہیں مٹی لیکن شیوہ بھی ہوئی دکھائی دیتی۔ سفیدی مائل بال ایک ہاتھ کو سینے کے پاس رکھتا تھا۔ لٹکا ہوا سا اور ایک ہاتھ سے اشارے کرتا بات کے دوران چال زنانہ نہ تھی۔ بس انداز میں ہی کچھ جھلک دکھائی دیتی تھی۔

چند سال ہوئے وہ اپنی بنیاد چھوڑ چکا تھا۔ پہلے گا ہک ڈھونڈتا تھا اب خود گا ہوں کی صف میں آکھڑا ہوا تھا، کرائے کے گھر میں رہتا تھا، شاذ ہی گھر سے باہر نکلتا تھا۔ جاوید سے مڈ بھیر ہو گئی۔

جاوید وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھا تھا۔ یہ سب کرنے کے لیے۔

چند ہفتے جاوید نے رات دن نوری کو بکری کا گوشت کھلایا، پھل، دودھ پلایا، خشک میوے لاکر دیے۔ نوری رات دن اسی طرح کھائے جاتی کہ پھر شاید طے یا نہ طے۔ اس رات نوری بکرے کے گوشت کی ہڈیاں، بوٹیاں چبا رہی تھی کہ جاوید نے کہا کہ۔

”رشید کو ایک بچہ چاہیے۔“ وہ خود بھی گوشت کو دانتوں سے نونچ نونچ کر کھا رہا تھا کہ آج بکرے کی ہر نسل ختم کر کے ہی اٹھے گا۔ اتنی اہم بات اس نے اور ایسے بول دی جیسے سبزیوں کی قیمتیں بتا رہا ہو کہ منڈی میں یہ بھاد چڑھ گیا ہے۔

”میں نے کہا میں تجھے باپ ضرور بناؤں گا۔“ اس نے انگلی سے دانت میں پھنسی ہوئی نکال کر دوبارہ چبائی۔

”تو کیسے۔۔۔؟“ نوری گوشت کھانے میں اتنی مگن نہ ہوتی تو ذرا حیران ہو لیتی۔

”یہ ہے نا۔۔۔“ جاوید نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ نوری نے نان کے ٹکڑے کو چٹمانہ میں دبی ہوئی تھوکی۔

”کتنی سمجھا ہے مجھے کہ بچے جتنی جاؤں اور تو اٹھا کر دے دے۔“

”نوری۔۔۔!“ جاوید ہاڑا۔

”تیرا ہے یہ بچہ بول۔۔۔ میرا ہے یہ بچہ میرا۔“

”تو اپنی کوکھ میں رکھتا تھا نا اپنا بچہ۔“

ایک پھپرڑا نوری کے گال پر، نوری نے سب برتن، گوشت، نان اٹھا کر پھینک دیے۔

”اگر تیرا باپ ڈھونڈتا آ گیا ہمیں تیرے وہ بھائی تو دیکھتے ہی مارویں گے ہمیں۔“

”تو۔۔۔؟“ نوری پھنکاری۔

”اری او پاگل! نہ سر چھپانے کے لیے جگہ ہے نہ جی داری کے لیے روپیہ، میں نے تیرا ساتھ نبھایا کہ نہیں۔ بھگالایا تجھے گاؤں سے تیرا باپ تو اس کتے کی شکل والے سے تیرا رشتہ کر رہا تھا۔“

”تو۔۔۔“ نوری کی آواز کے لیے وہی پرانی تھی۔
”تو کی بچی سمجھنا لی سے بھی گندے گھر میں سڑ رہے ہیں، گھر بدل لیں گے۔ بڑے شہر چلے جائیں گے۔ رشید پورے پانچ لاکھ دے رہا ہے۔“

تازہ تازہ بکرے کا گوشت کھانی نوری کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

”پانچ لاکھ۔۔۔؟“ اس کے انداز پر جاوید دلیر ہوا۔

”ہاں جی۔۔۔ پانچ لاکھ اور یہ سارے پھل فروٹ بھی وہی لا رہا ہے۔ یہ گوشت اور باڑے کا خالص دودھ، وہ ہی لاتا ہے۔“ نوری سوچ میں غرق ہو گئی۔

”وہ آدمی ٹھیک نہیں۔“ وہ بولی۔

”بڑا نیک ہے وہ۔“

رشید جاوید کو سب صاف صاف بتا چکا تھا۔ رہی نیک ہونے کی بات، تو وہ تھا یا نہیں لیکن پانچ لاکھ کے لیے اسے نیک بتانے میں جاوید کا کیا جاتا تھا۔

”بہت بھلا مانس ہے۔“

”میں کیوں دوں اپنا بچہ؟“

”اپنا کیلی کا نہ بول، میرا بھی ہے پگلی۔ بات سمجھتی ہی نہیں۔ بہت چکر لگائے اس نے یتیم خانوں کے۔ اسے تو یتیم خانے والے گھسنے بھی نہ دیں۔ بہت گھن چکر بنا بے چارہ۔ ایک تو پیسے لے کر بھاگ گئی۔ دو چار اور دھوکے ہوئے۔ کہتا ہے کسی ماں کی آپ نہیں نہیں لے گا۔ ہاں جو ماں خوشی سے اس کی گود میں ڈال دے ورنہ ہزار بچے نہ اٹھا لیتا، ہے کہ نہیں؟ بڑا دھکی ہے۔ بڑے دکھ سے بتا رہا تھا کہ نیک انسان بناؤں گا، اسے پڑھائے گا، سکھائے گا، ڈاکٹر بنائے گا، لڑکی نہیں مانگ رہا، لڑکا۔ پانی پانی جمع کر کے رکھی ہے اس کے لیے۔ گھر بند کیے روتا ترپتا رہتا ہے۔ بہت بھلا ہے مزاروں پر جاتا ہے، چادریں چڑھاتا ہے۔ اس دن اذان ہو رہی تھی بولا۔ ”جاوید اذان کے وقت نہیں بولتے“ اب خود دیکھ لے کتنا نیک ہے بڑا دلارا ہے قسم سے، کیا تو اور میں ایسے نیک ہیں؟ ٹوٹنے تو خود بھی نماز نہیں پڑھی، پھر پیسے والا ہے، اچھی طرح بچہ پالے گا۔ تڑپ اٹھتا ہوں میں اس کے دکھ سن کر۔ انسان ہوں میں بھی۔“

جس وقت رشید جاوید کے ہاتھوں نیک ثابت کیا جا رہا تھا ٹھیک اسی وقت رشید ہاتھ جوڑے دربار پر کھڑا تھا، پہلے اس نے جادر چڑھائی پھر پھول پھینکے۔ اس سے پہلے وہ تبرک بانٹ چکا تھا پھر ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ وہ کھٹنوں کھڑا رہتا۔

”میری بھی تو آس کو کھ خالی ہے۔“

ہر خواہش ایک کو کھ ہوتی ہے۔ صدیوں بانجھ رہنے والی عورت کی کو کھ جو زمین و آسمان ہلا دیتا چاہتی ہے لیکن کو کھ کو بھر لیتا چاہتی ہے۔ یہی کو کھ ہر انسان کے اندر اپنی اپنی شکل میں کروڑوں بار جنم لیتی ہے، سب کی اشکال جدا تو رشید کی شکل بھی جدا۔

”کورا کھ کھلا مرد ہوں تو کیا چاند ہوں تو کیا ٹیسس اٹھتی ہیں۔ ان ٹیسوں کو سرور دلانے کا من کرتا

ہے۔ سینے سے لگانے کا۔ میاں کی میں نہیں کرنے والا میری خدمت کون کرے گا۔ میری بھی کوئی نہ کرے لیکن۔۔۔“ وہ سسکتے لگا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔

اس کے پاس کوئی بڑی دلیل نہیں تھی خدا کو دینے کے لیے۔ ایسی دلیل جسے التجا میں شامل کیا جاتا ہے کہ التجا پر اثر بن جائے۔ اس نے ہر دلیل کو پرے پھینکا کچھ اور مانگا تو کالا کر کے چھتر لگا، مسجد بھیجوں گا اسے، ڈاڑھی رکھے گا، حاجی بنے گا قسم بیچ تن پاک کی، واسطہ ہے پیرو مرشد کا اسے اپنا راہ بتا رہا ہوں اسے اپنا راہ بتا رہا ہوں۔“

وقت گزر گیا رشید وہیں ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔ وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا، ہاتھ پھیلائے نہیں۔ وہ مانگ نہیں رہا تھا، التجا کر رہا تھا حق سے مانگنے اور التجا میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق بڑا خاص ہے۔ دعا بہت بڑا مان ہے، رشید نے خود کو اس مان کے قابل نہ سمجھا، گا کہوں کے بھاؤ تاؤ کرنے والے نے خود کو اس مان کے قابل نہ جانا۔ کوئی دیکھ لے اور پوچھ بیٹھے کہ اتنی دیر سے بت بنے کیا مانگ رہے ہو تو؟ رشید کیا بتائے کہ ”ماں اور باپ بننا چاہتا ہوں۔ دل کا ارمان ہے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ شادی کے قابل نہیں۔ باپ بن نہیں سکتا پھر بھی بچہ چاہتا ہوں۔“

چند سال ہوئے اس نے لاہوری کوٹھا چھوڑا تھا۔ بڑا گھاگ تھا رشید چاند۔ گا کہوں کو ایسے گھیرتا جیسے گڑا پو آپ کھیاں گھیر لیتا ہے۔ تازہ تازہ برزے نکالتے اس کے گلاس سے پانی پیتے، اس کے ہاتھ سے نمک چائے، نائیکہ بھر بھر بینک میں پیسے رکھوائی۔

اب رشید کے کانوں میں اسی نائیکہ کی بیٹھی بیٹھی آواز گونجتی تھی۔ گالیوں کی بھرمار اور ایسی باتیں جو وہ سن چکا تھا اور کہہ چکا تھا اور جو ان کے لیے کہنی سنی جائز اور باہر کی دنیا کے لیے غلط ترین گردانی جانی تھی اسے ہر پہل سنائی دیتی۔ ایسی ہر آواز سے دھیان ہٹانے کے لیے اسے کوئی چاہیے تھا۔ اتنا پاگل بھی نہیں ہو گیا تھا لیکن بہت کچھ ہو گیا تھا، بدل گیا تھا تو کسی اور ہی راہ سے بدل گیا تھا، زندگی بھر کام سے لگا رہا اب خواہش سے لگ گیا تھا جو کام نہیں کیا تھا اب وہ کرنا چاہتا تھا اولاد والا بننا چاہتا تھا۔ رات دن گھر میں بند رہتا۔ اٹھ جاتا تو متعلق ہو جاتا، سو جاتا تو کھو جاتا، ہوش میں آتا تو رونے لگتا اس کا حال بڑا تھا، برے حال سے ہی زندہ تھا۔

☆☆☆☆

رشید کے گھر کا دروازہ بچ رہا تھا، منہ اور آنکھوں کو صاف کر کے وہ اٹھا۔

”مان گئی بھابھی جی؟“ جاوید کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

”مان جائے گی فکر نہ کر۔ در نہ میں اسے گاؤں چھوڑاؤں گا۔“

”نہ ایسا نہ کرنا۔“ رشید کو برا لگا۔

”تیرے پاس پیسے ہیں بھی کہ نہیں۔“ جاوید کی آنکھیں سکڑیں۔

”چیک بک دکھاؤں؟“

”ہاں۔۔۔“ جاوید چیک بک دیکھ کر ہی ٹلا۔

☆☆☆☆

”بڑا پیسہ ہے نوری اس کے پاس۔ دو دو بینکوں میں پیسے رکھے ہیں۔“

”تو۔۔۔“ نوری کو کوئی اور سوال ہی نہیں کرنا آیا اب تک۔
 ”یہ تو۔۔۔ بار بار تو تو کسے سناتی ہے؟“ جاوید چپک بک دیکھ آیا تھا اب بھی نہ بھڑکتا۔
 ”تو کیا کروں؟“ وہ رونے لگی۔ ”میں دل مانتا۔ خراب آدمی ہے، نہ جانے اسے کیا سے کیا بنا دے گا پھر کیوں دوں اسے بچہ ضروری ہے کیا؟“
 ”پہلی ابھی تک نہیں سچی۔ ہمارے پاس کیا ہے؟ دوسرے بچے کو کیسے پالیں گے۔ یہ گڑیا کی طرف دیکھ شہر میں رہ کر بھی تجھے عقل نہیں آئی۔ یہ جو بارشوں میں کیڑے نکلتے ہیں ان جیسی ہے یہ اپنی گڑیا۔ شہریوں کے بچے دیکھے ہیں کبھی، میں دکان کھول لوں گا گروہی پر ایک اچھا گھر لے لیں گے یہ بچہ دن بدل دے گا وہ اسے پڑھائے گا لکھائے گا کیا ہم پڑھا سکیں گے۔ ہم تو کھلا بھی نہیں سکیں گے۔ خود بھی کھالیں گے وہ بھی پلٹا رہے گا۔“

نوری چپ ہی رہی۔ آج کل اسے کھانا نہیں پکانا پڑتا تھا۔ جاوید روز بازار سے ہی لے آتا تھا۔ ہر طرح کے گوشت ہی آرہے تھے۔ مچھلی، تنکے، کباب، گڑا ہی، کوئی نہ۔ ہزار قسمیں تھیں گوشت کے پکوانوں کی، وہ دن گئے جب دونوں کو نمک کے ساتھ روٹی کھانی پڑتی تھی۔ اب زیادہ نمک والا گوشت ایک طرف کر دیتے تھے کہ کڑوا ہے۔
 چند ہفتوں بعد بارش ہوئی تو آس پاس کے گٹر بھر کر ایلنے لگے، پانی ان جیسے گھروں میں گھس آیا، بدبو، مٹی سے نوری مرنے کے قریب ہو گئی۔

اب اس بدبو میں گزارا نہیں ہوتا تھا، پیٹ میں جو کچھ بھر کر ڈالا باہر آنے کو تھا۔
 رشید آیا، دیکھ کر چلا گیا، پھر آیا، سامان نکال کر باہر رکھا، سامان بھی کیا چند چیزیں، دونوں کو لے کر ایک خالی گھر آ گیا۔ دو کمروں کا صاف ستھرا گھر تھا۔ سامان وہاں لا کر جمایا۔
 ”خوش بھابھی جی؟“ پہلی بار نوری سے سیدھی بات کی تھی اس نے۔ نوری نے سر ہلا دیا۔ دو ”ضرورت مند“ اکٹھے ہو گئے، رشید اور جاوید۔

جاوید نے سبزی کی ریشمی ہی لگائی چھوڑ دی۔ رزق گھر بیٹھے مل رہا تھا باہر نکل کر کمانے کی کیا ضرورت تھی۔ تھا ہی نکما جاوید، اس کے بھائی گاؤں میں جانوروں کی طرح رات دن کام کرتے اور وہ ادھر ادھر تک جھانک میں رہتا۔ اب کہاں کا کام؟ رشید کھلا رہا تھا انہیں، شروع میں وہ چھوٹے سے ایک ہوٹل میں رات دن برتن دھونے پر لگا تھا پھر ٹیبل مین بن گیا۔
 ”شہر کے لوگ۔“ جاوید گالی دے کر کہتا۔ ”اتنا کام لیتے ہیں اور چند سکے پڑا دیتے ہیں۔“ اب ٹھیک تھا رشید اسے لاکھ تھا رہا تھا اب سب ٹھیک تھا۔

رشید جاتا تو نوری کو دیکھ کر خفا ہو جاتا۔
 ”پرے ہٹو۔“ جھاڑو چھین کے خود لگانے لگتا، برتن دھو جاتا، بستروں کی چادریں جھاڑتا، جاوید موڑھے پر پیٹھ دانٹوں میں تیلی پھیرتا رہتا اور مسکرا مسکرا کر نوری کو چڑھاتا۔
 رشید بھی جو سر لے آتا کہ تازہ تازہ رس نکال کر پو۔ نوری سے زیادہ جاوید پی جاتا۔ جگ بھر بھر کر۔ دودھ میں کیلا ڈالا اور پی جاتا۔ اس دن جاوید کے کان میں سرگوشی کی۔ ”بھابھی جی کے پاؤں دبا دے۔“ جاوید گلا پھاڑ کے ہنسا۔

”جاؤ دبا دے یہ کام بھی تو کر دے۔“ رشید کو سانپ سوگھ گیا۔ جیسے سانپ نے ڈس لیا۔ ”اب کہا تو زبان کھینچ لوں گا۔“ جاوید کچ کچ ڈر گیا۔

”بازاری تو میں ہوں پر لگتا ہے تو بھی نیا نہیں۔“ جاوید اندر تک بھڑک اٹھا۔ لیکن پانچ لاکھ کا سوچ کر چپ رہا ورنہ اتنی بڑی بات پر ہاتھ پٹو کر باہر کرنا کنڈی لگا کر آرام کرتا لیکن کمینی ہنسی ہنس کر چپ رہا۔

خالص دودھ، تازہ جوس اور ملک شیک پینے والی نوری پانی پیتی تو متلی ہوتی۔ دال روٹی کا سوچتی تو دل گھبرا جاتا۔ جاوید گھر ڈھونڈ رہا تھا تین لاکھ گروی پر سودا ہوا۔ رشید نے چھت تین لاکھ نکال کر پکڑا دیے۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر دانی کا انتظام کیا۔ جس کمرے میں نوری پڑی کراہ رہی تھی اسی کمرے کی چھت پر رشید ہاتھ جوڑے لڑکے کے لیے التجا کر رہا تھا۔ لڑکی اسے خود ہی نہیں لیتی تھی۔ وہ صرف ایک لڑکا ہی لے کر پال سکتا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا جاوید نے رشید کو آواز دی، رشید بھاگایہ نیچے آیا۔

”جانکل جا، دوبارہ بھی ہمیں اپنی شکل نہ دکھانا۔“

پاک ناموں کا ورد کرتے ہوئے رشید نے اپنے بازوؤں میں بچے کو تھام لیا اور سینے سے لگائے اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ وہ سارے انتظام پہلے ہی کر چکا تھا، بچہ ملتے ہی شہر سے نکل گیا۔ بے شک وہ گھر میں بند رہتا تھا پھر بھی بہت لوگ اسے جانتے تھے۔

☆☆☆☆

نوری کئی دن خاموش رہی، چلنے پھرنے لگی تو اسے جاوید بازار لے گیا۔ جس چیز پر ہاتھ رکھا وہ لے کر دی۔ فریج، ٹی وی، بیڈ، قالین سب مل گیا۔ اپنی سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل پر جاوید اسے لپے لیے گھوما، بازاروں میں، ہوٹلوں میں، پارکوں میں نئی نئی چیزیں کھلائیں۔ نوری نے بھی سمندری جھینگا نہیں کھایا تھا وہ تک کھلایا، نوری دنوں میں ہنسی کٹی ہوئی۔ روزینے نئے کپڑے پہن لیتی۔ رات کو چند بار رو لیتی پھر چپ کر جاتی، شاموں اور دوپہروں میں آہیں بھرتی جاتی اور سبب، کیلا کھائے جاتی اور جلدی جلدی جکنے فرش پر گلا پکڑا لگائے جاتی۔ آئینے کے سامنے بیٹھی آنکھوں کے گرد حلقے دیکھتی اور کوئی نا کوئی کریم اٹھا کر منہ پر لگاتی۔ رشید نے پانچ لاکھ کا کہا تھا پورے آٹھ لاکھ دے کر گیا تھا۔ اتنا مہنگا گوشت کا لوتھر آخر یہ کر لے گیا تھا۔

بچے کی پیدائش کے تین دن بعد ایک ٹولہ ان کے گھر آدھکا تھا۔ جاوید نے تو صاف انکار کیا کہ ان کے یہاں کوئی بچہ وچہ نہیں آیا۔ گرو نے زور سے تالی پیٹی۔

”ہائے میری میا میسے دھیلے پر سواہ ڈال بچے سے انکاری ہو رہا ہے۔ ہم بکے کام کرتے ہیں۔ خبر نہیں ثبوت کے ساتھ آتے ہیں۔ لاؤں کیا اس کو یہاں بول پھر بو لے گا کہے گا پھر کوئی بچہ وچہ نہیں۔ چل چھٹی تو شروع ہو۔ ذرا آواز نکال باہر کی طرف۔ آس پڑوس ہی اکٹھا کر لے۔ دادا، نانا تو یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا۔“

”میں نے کہا نکلو یہاں سے۔“ جاوید بھڑک اٹھا۔ ”کوئی بچہ نہیں ہے یہاں۔“ جاوید نے گھٹکر و باندھتی چھٹی کو دھکا دیا وہ فرش پر گر گئی۔

”اے۔۔۔“ چھٹکی نے گالی دی اور تیوری چڑھائی۔
 ”آئے ہائے۔۔۔“ گرو بھی بھڑک اٹھا۔ تال پر تالی بجانے لگا، چھٹکی بھی تالی بجانے لگی۔ ڈھولکی
 استاد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ سب زور زور سے تالی بجانے لگے۔ تالی کا یہ وہ انداز تھا جو وہ غصہ، غم، دکھ اور سوگ
 میں پیٹتے ہیں۔

”او میری میا بیٹھے بٹھائے بچہ نگل رہا ہے۔“ وہ صحن سے اندر کمرے میں جانے لگی۔ جاوید نے
 دھکا دیا ایک کو، چھٹکی پھر دیوار کے ساتھ جا چکی۔ دھکا کھا کر گرو الٹا جاوید کو دھکا دے کر اندر کمرے میں
 آ گیا۔ نوری چار پائی پر لیٹی تھی اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکی۔ تالیوں کی گونج کمرے میں پھیل گئی۔
 دروازے پر جاوید ڈھولکی استاد کے ساتھ الجھ رہا تھا۔
 ”اے چھٹکی یہ رہی زچہ، اے خدا مبارک کرے۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے نوری کی بلائیں

لی۔

”چاند کے کٹڑے کے درشن کرواؤ۔ آٹا، چینی، چادر، منے کا ہاتھ لگوا کر دے دیو۔ یہ تو بھڑکے چار ہا
 ہے ہمارا بھی حق ہوتا ہے۔ ناچ لیں گے، گالیں گے، ہزار پانچ سو لے کر پٹے جائیں گے۔ اے ہے چھٹکی
 چل شروع ہو، یہ رہی زچہ، لا بھی دے بچہ گود میں بٹھا کر ایسی لوری دوں گی سارے رونے بھول جائے
 گا۔ راج کرے گا راج۔“

”نہیں ہے مٹا۔“ نوری سے کہا ہی نہ گیا کہ مر گیا مٹا۔ نوری جس طرح چلائی، ایک پیر کو اٹھائے
 رقص کے انداز میں گھومتی چھٹکی ہاتھ پیر روک کر اسے دیکھنے لگی۔ گرو تو بھڑک اٹھا۔ نوری کا بستر ٹولا، گڑیا
 ڈر کر رونے لگی۔ جاوید گالیاں دے رہا تھا۔ ہاتھ پائی کر رہا تھا۔ نوری بستر میں دیکھی جا رہی تھی۔ اسے گرو
 سے ڈر لگ رہا تھا۔

”لوکا ہوا ہے، گھر سونا پڑا ہے، نہ کوئی دادی، دادا نہ نانی، ماموں۔ اتے بھی غریب نہیں لکتے۔“
 اس نے ہاتھ کھول کر چاروں طرف اشارہ کیا۔

”دو دن پہلے رات کو بچہ آیا پیارا سا چاند سا منا کہاں گیا، اے چھٹکی پتا کر کہاں گیا مٹا، کہاں چھاپا
 ہے چاند۔“ چھٹکی چار پائی کے نیچے جھک گئی۔

”یہاں تو نہیں۔“ چھٹکی نے دونوں کندھے منکائے، انگلی کو ٹھوڑی پر رکھا۔

”کہاں گیا۔“ گرو بار بار تالی بجا رہا تھا۔

”اے مٹے تو ہی بول کہاں چھپا ہے مٹے۔“ نوری کے کان پھنسنے کے قریب ہو گئے۔ پھر چھٹکی اور
 گرو ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”بچہ ضرور ہیں الو کے پٹھے نہیں۔“ گرو بولا۔ جس انداز سے وہ بولا جاوید ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ
 اندر آیا اور نرمی سے بولا۔

”اس کی بہن بے اولاد تھی وہ لے گئی۔“

”اور یہ اتنے دل گردے والی تھی کہ اپنا پہلا ہی بیٹا بہن کو تھما دیا۔“ تالی بجا کر تینوں منے۔
 ”دوسروں کو اولاد دینے والی بڑی دیکھی ہیں لیکن پہلا پھول کسی کو دیتے نہیں دیکھا۔ چلی آ اس کی بہن
 کے ہاں چلتے ہیں۔ وہاں سے بدھائی دلوا نہیں چل۔“ گرو نے جاوید کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

”چل آ۔۔۔“

”وہ دوسرے شہر رہتی ہے گوجرانوالہ۔“ جاوید ہکا گیا۔

”چل ٹھیک ہے۔ اپنی برادری وہاں بھی بہتری ہے تو پتا دے میری برادری والے بدھائی لے لیں گے۔“

”بہت پرہیزگار ہیں وہ۔ تمہیں گھسنے نہیں دیں گے۔“ اس بات پر وہ تینوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر بنے۔

”بدھائی دیتے کسی کو گناہ نہیں ہوتا۔ سارے گناہ ہم نے اپنے سر لے لیے ہیں۔ تو بے فکری رہ تو پتا دے۔“ اس نے ہاتھ آگے کیا۔

”دے چل۔“ جاوید پھر بھڑک اٹھا۔

”نکلو یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ وہ گالیاں دینے لگا۔ گرد تو اور بھڑک اٹھا۔ اپنی پاٹ دار آواز میں دہائیاں دینے لگا۔ تالیاں پیٹتا رہا۔ محن میں آگیا اور چلا چلا کر منامنا کرتا رہا۔

”کھا گئے، دبا گئے، دفنا گئے، جلا ڈالا یا بیچ ڈالا۔ کہاں گیا متا؟ او میری میا بیٹو تو ہم ہیں بدھائی کون لے اڑا۔ کون کھا گیا گوری کی بدھائی کس کے پیٹ میں گئی بدھائی۔“

استاد زمین پر بیٹھا ڈھولکی بجا رہا تھا۔ دونوں کھڑی ہو کر محن میں گول گول گھوم کر دہائیاں دے رہی تھیں۔ باہر محلے والے آ کر تماشا دیکھنے لگے۔ جاوید نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ بہت دیر تک تماشا ہوتا رہا۔ کچھ دیر بعد جاوید کو عقل آئی۔ کمرے سے نکل کر باہر کا دروازہ بند کیا۔ دو ہزار نکال کر ان کے ہاتھ میں دینے چاہے۔

”یہ لو اور جاؤ۔“

”بھیک لینی ہوتی تو بیٹو بڑے نہ بنتے۔“ گرد نے جاوید کا ہاتھ جھٹکا۔

”تیری دال میں بہت کچھ کالا ہے۔ گوری کو بہت سے لوگوں نے دھکار کر نکالا۔ لیکن بتانے کے ملنے والی یہ دھکار گوری ہمیشہ یاد رکھے گا۔ ان پیسوں کو اپنی اور اپنی جو رو کی گودی میں رکھ، منا تو رہا نہیں جسے تم گودی میں لیے لیے پھرو، اے منے تجھے آسمان لے اڑا یا زمین نکل گئی ارے منے تو کہاں گیا۔“

منا، منا کرتا وہ چلا گیا۔ رات گئے تک گھر میں منا منا ہوتی رہی۔ محلے والوں سے جان پہچان نہیں تھی۔ لیکن باری باری سب آئے جاوید نے سب کو نکال باہر کیا۔ پہلی فرصت میں گھر بدلا۔ وہ علاقہ ہی چھوڑ دیا۔ پر چون کی دکان کھول لی۔ دکان پر ایک لڑکا دن بھر بیٹھا رہتا اور خود ایک اسکول میں کینٹین کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ اچھا خاصا بڑا اسکول تھا۔ دنوں میں ہی اچھا منافع ہونے لگا تھا۔ رات گھر آتا تو کھانے سے پہلے پیسے گنتا۔ نہانے سے پہلے کل آنے والے پیسوں کا حساب کرتا اور سونے سے پہلے آچکے اور آنے والوں کا اچھی طرح پھر سے حساب کر کے سوتا۔

وہ کوہنے بناتی یا کھیر۔ جاوید کو ہر چیز میں پیسوں کا ہی مزا آتا۔ اس کا ہاتھ پڑتا جیسے سونے کے پہاڑ کی ڈلی مٹی میں لے لی ہو۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہتے تھے۔ اچھا کاروبار بن گیا۔ پیٹ تین وقت سے زیادہ بار بار بھرنے لگا۔ منے نے جہاں جانا تھا وہ تو چلا گیا نا، پہلا سودا ٹھکانے لگا۔

تھوڑا منافع ہوا تو اس نے ایک اچھے علاقے کے بڑے اسکول کا ٹھیکہ لے لیا۔ گھاگ تو وہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کینٹین روم سے اسٹاف روم تک گھسنے لگا۔ بلاوجہ کی علیک سلیک بڑھانے لگا۔ سارا وقت اپنے آپ میں ہی غم رہتا۔ بھاگ دوڑ میں لگا رہتا۔ دراصل اسے پیسہ کمانا آ گیا تھا۔ ہوشوں میں برتن دھوتے، ٹیبل مین بنے، گلی گلی سبزی کی ریڑھی گھاتے اس کی زبان کو پر لگ گئے تھے۔ لیکن بولتا بھی دیکھ بھال کے تھا اور کس سے بولتا ہے یہ تو ضرور ہی دیکھ لیتا تھا۔ آئے دن کھانا کھاتے اسٹاف کی میڈمیں کی باتیں کرتا۔ اس کی سنا، اُس کی سنا۔ چھ سال ہو گئے میڈم کی شادی کو، پہلی رات کی بات، یہ اوچی بسی گوری جیٹی۔ آنے والے دنوں کی بات امریکہ تک گئی علاج کروانے بڑی نازک مزاج ہیں۔ چائے کی پیالی سے ایک قطرہ بھی جھلک جائے تو چائے نہیں پیتی۔ پرے کھسکا دیتی ہیں۔ نہ جانے سب کے سانسوں سے رچی اس ہوا میں کیسے سانس لیتی ہیں۔“ وہ بلاوجہ نہیا۔

”میڈم کی چائے ٹو بناتا ہے؟“ نوری اُٹی ہی بات پکڑتی تھی۔ ”میں کیوں بنانے لگا، اسکول کا باورچی بن رہا تھا۔“

”تو اس سے میڈم کی باتیں پوچھتا رہتا ہے۔“

”نہیں پاگل۔“ وہ جڑ گیا۔ ”مجھے معلوم ہو جاتا ہے بہت کچھ آپ ہی۔“ وہ پھر نہیا۔

”تو کیوں معلوم کرتا پھر تا ہے اس کے بارے میں۔“ جاوید نے نوالہ پلیٹ میں پٹا۔

”کیا سنے گی مجھ سے؟“

”کتنے پیسے دے رہی ہے وہ؟“ نوری جم کر بولی۔ جاوید نے نوالہ اٹھالیا۔ سوچا کھا کر بات کرے منہ کھول کر نوالہ اندر کیا، آرام سے چبایا۔

اتنی جلدی کہاں کی ہے۔

”نوری ایسے چار سال تک چھپا چھپا کر اپنے گھر کے گودام میں لاتی رہی تھی، وہ تو اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ اب یہ سوال کیسے نہ پوچھتی۔“

”کہتی ہے فشن اقبال میں تین مرلے کا ایک پلاٹ ہے۔“ جاوید کوئی ڈرتا تھا نوری سے، اسے تو بیچنے کے سبھی گرا آنے لگے تھے، محبت کا اندازہ ہو چکا تھا پیسے سے عشق ہو گیا تھا۔

کہیں دور پہاڑوں پر، گاؤں، قصیوں میں اور دور صحراؤں میں رہنے والے بڑا سمندر سمندر کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں نلے سمندر کو دیکھیں گے تو کیا لطف آئے گا، پانی سے پیر بھیگیں گے تو کیا لگے گا۔ وہ رات دن سمندر سمندر کرتے پھرتے ہیں۔ خواب دیکھتے آہیں بھرتے ہیں۔ تنگ دو دو کرتے، آنے جانے والوں سے سمندر کا احوال پوچھتے پھر جب وہ خود سمندر کے کنارے تک آ جاتے ہیں تو خوف کھا جاتے ہیں۔ مٹی ہوئے لگتی ہے، سمندر ہوا بری لگنے لگتی ہے۔ سمندر منہ کھول کر نگل لینے والا نظر آنے لگتا ہے۔

اور کچھ جو سمندر سے خوف کھائے ہوتے ہیں وہ پانی میں ڈبکی پر ڈبکی لگا رہے ہوتے ہیں تو یہی کچھ انسان ہے جب تک دور ہے تب تک پتا نہیں ہے کہ وہ کیا ہے۔ سمندر جو کہ وقت، زمانہ، حالات، خواہشات ہیں۔ قریب آنے پر ہی پتا دیتا ہے کہ انسان کا اصل ہے کیا۔

جاوید گاؤں کا تھا ہوٹل میں برتن دھوتا تھا۔ سبزی لگاتا تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا ہے رشید کے

ملنے ہی وہ نقل سے اصل ہو گیا۔ بہرہ روپ سے روپ میں آ گیا، اصل سمندر میں ڈکی لگائی تو سب دھل کر صاف ہو گیا۔ رشید کے بعد نوری کو بتائے بغیر وہ ایک اور گاہک کی تاک میں تھا ایسے ہی۔ اسکول کے ملازموں سے پوچھتا پھرتا تھا۔ میڈم گوہر کی بے اولادی کا پتا چلا تو اس نے میڈم گوہر پر باقاعدہ نظر رکھنی شروع کر دی۔ میڈم گوہر سے علیک سلیک بڑھائی۔ عادت کی اچھی سچی وہ، اسکول میں واکس پرنسپل تھی، جوان بھی، خوب صورت تھی۔ اگر کہا جائے کہ بھولی بھی تھی تو غلط نہیں ہوگا۔

”بیٹیم خانے سے کیوں نہیں لیتی۔“ نوری نے پوچھا۔

”کہا تو ہے گند میں ہاتھ نہیں ڈالتی۔ حلال کا چاہیے اسے۔“ جاوید آرام سے دل لگا کر کھانا کھانے لگا۔ وہی بکرے کا گوشت اور فرائی مچھلی۔ کتنے آرام سے وہ کاروباری باتیں کر رہا تھا۔ نوری کب سے اپنا کھانا چھوڑ چکی تھی۔

”مجھے شرم نہیں آتی۔“ نوری کو کچھ شرم آگئی۔

”کہاں کی شرم۔۔۔ منہ میں زبان ڈال در نہ مجھے ڈالنی آتی ہے۔“

”ایک کا سودا کر تو لیا اب ہر ایک کا کرے گا۔“

”ہاں! ہر ایک کا کروں گا بھلے کا کام ہے ضرور کروں گا۔ بھلا کرتا ہوں لوگوں کا، دل تڑپتا ہے ان کے دکھوں پر۔“

”بھلے کے نام پر پیسے کیوں لیتا ہے۔“ نوری تڑخی۔

”خوشی سے دیتے ہیں وہ، مکینہ نہیں ہوں میں۔“ تو کیا جانے بے اولادی کا دکھ، تیری تو ہر سال کوکھ بھر جاتی ہے۔“

”ابڑ بھی جاتی ہے۔“ نوری کو مना یاد آ ہی گیا۔

”کہاں کا ابڑ نا۔۔۔ عیش نہیں کر رہی۔“

”وہی تو کہہ رہی ہوں۔ عیش کر رہے ہیں نا۔ گاؤں سے نکلے تو چار چار وقت روٹی نہیں ملتی تھی۔ اب چار مہینے کا سامان رکھا ہے باورچی خانے میں پکانے کو۔ گھر بھر اپڑا ہے۔“

”یہ سب میری محنت سے آیا ہے۔“

”بچہ میں نے جتنا تھا۔“ دونوں مقابلہ کرنا چاہتے تھے کہ دراصل یہ سب جو عیش ہے یہ کس کی وجہ سے ہے۔

”ہاں تو میں جن لیتا۔“ جاوید چلایا۔ ”کس پر اترا ہی ہے پیچھے سے لائی ہے یہ بچے۔“

”پیچھے سے لائی تو تجھے سودا کرنے دیتی۔“ جاوید نے لپک کر اس کی چوٹی پکڑ لی۔ چار پانچ گالیاں دیں اسے اور پیچ کر چلا گیا۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد آیا اسے اٹھایا، بٹھایا، آنکھیں اور منہ صاف کیا۔

”تو میری نوری نہیں۔“

جب دونوں میں پیار کی پیٹنگیں بڑھنی شروع ہوئی تھیں تو جاوید اسے نہ جانے کے لیے ہاتھ پکڑنے کے لیے، پاس بٹھانے کے لیے اور ایسے ہی بہت سے ڈھکے چھپے کام کروانے کے لیے لاڈ سے کہا کرتا تھا اور نوری فوراً اتر کر کہتی تھی۔ ”نہیں، مطلب ہاں، کچی ہاں، عورت بھی جلدی مان جاتی تھی۔“

”میری محبت پر شک ہے تجھے۔ بے چاری میڈم کے دکھ کا سوچ، محبت کی شادی کی تھی، دوسری بیوی ہے اپنے صاحب کی، شوہر خود اولاد والا ہے۔ یہ اکیلی تڑپتی ہے کہہ رہی تھی کہ بچہ مل جائے تو اسے لے کر اپنے ماں باپ کے پاس کینیڈا چلی جاؤں گی۔ خود سوچ کینیڈا میں کتنے عیش سے رہے گا وہ۔ گاڑی، گھر ہمارے پاس نہ سہی، اس کے پاس تو ہوگا۔ اتنی بے چاری نہ بن۔ اس عورت کا بھی سوچ تو بھلا کر دے گی اس کا تو تیرا کیا جائے گا۔“

نوری ہستی رہی اٹھ کر نہ گئی۔ جاوید نے اس کے گرد ہاتھوں کا حلقہ مضبوط کیا، نوری اس حلقے میں اندر تک مدغم ہو گئی۔

”مجھ سے تو میڈم کا دکھ دیکھا نہیں جاتا ورنہ یہ گڑیا تین کی ہوئی ہے نا ابھی اسی کی بات کر لیتا۔“
نوری نے فوری ہاتھ بڑھا کر جاوید کا منہ بند کر دیا۔
”گڑیا کا نام نہ لیتا۔“

”چل پھر تو اس کی تیاری کر، دل سے سمجھ لے تو نے کسی اور کا قرض دینا ہے۔“

”کس کا؟“ نوری نے اتنا بڑا طنز کیا کہ جاوید کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔

”دیکھ نوری مجھے ایسے طیش نہ دلاؤ۔ قسم خدا پاک کی، میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ دکان اور کاروبار ہیں میرے پاس، کہاں جائے گی تو۔ بہتری عورتیں مجھے اور نہیں تو یہ فٹ ہاتھوں پر بخار نہیں جھولتی پھرتی ہیں، انہی میں سے ایک کو گھر لا بٹھاؤں گا۔ مجھے سکھ کھلتا ہے، دکھ تجھے بھلے۔ باہر نکل کر گلی گلی جا کر کمانا پڑے گا تو تجھے پتا چلے یہاں گھر بیٹھی تو سارا دن بیوی دیکھتی ہے تو اس پیٹ کو قرض سمجھ لے جسے تجھے چکانا ہے۔ بھولی بھلی۔“ جاوید نے ہاتھ بڑھا کر اسے سینے سے لگا لیا۔

”یاد نہیں گاؤں کی حاجن بی۔ اوپر تلے کے اپنے دو بیٹے دیے تھے ایک تو ساتھ والی پڑوسن کو دیا تھا جو ہر وقت حاجن بی سے لڑتی رہتی تھی، روٹی پیتی رہتی تھی۔ رات دن بین کرتی رہتی تھی کیسے پھر گڑ والے چاول پکا پکا کر بٹائیا کرتی تھی۔ یہ سامنے کا گھر ہی تھا نا حاجن بی کا تو کیا سانپ لوٹتے ہوں گے ان کے سینے پر، کیسی راضی تھیں وہ، کیسا نور برستا تھا گاؤں بھر نے تعریف کی تھی تو کیا وہ بچہ دینے سے بری بن گئی، ہم کہاں کے برے۔ دوسروں کی آس مراد ہم سے پوری ہو رہی ہے تو میں ایسی میں راضی بارضا ہوں۔“

نوری بمشکل سترہ سال کی تھی جب جاوید کے ساتھ گاؤں سے بھاگی تھی۔ جاوید ہٹا کٹائیں بانیں کا ہوگا گر لگتا چھ سات سال بڑا ہی تھا اصل عمر سے۔ گاؤں میں ان کا چکر بہت دیر رہا بہت جگہوں پر ملے جاوید تو کہتا تھا سارے گاؤں کو آگ لگا دے گا اگر نوری کے گھر کوئی اور بارات لایا۔ بارات تو خیر کسی کی نہ آئی، دونوں اپنی بارات لے کر شہر آ گئے۔

جس رات جاوید نے اسے کہا کہ شہر بھاگ چلتے ہیں اسی رات کے پچھلے پہر دونوں بھاگ گئے۔ سوچنا کیسا، سورج کے اشارے پر جس طرح دن نکلتا ہے ایسے ہی نوری جاوید کے اشارے پر چلتی تھی۔ گاؤں میں اس نے اپنی کچی سہیلی گھومی ہوانہ لگنے دی کہ اس کا جاوید کے ساتھ چکر ہے۔ اتنے سال اس کے گھر والے اسے چپ چپیتی گائے سمجھتے رہے۔ وہ دودھ کھٹے جاوید کے ساتھ گزرا آتی۔ اماں بے فکر رہتی، ہوگی دس بارہ سہیلیوں میں سے کسی کے پاس۔ اماں اسے پچھلے پہر اپنی دونوں آنکھوں سے بھاگتے ہوئے دیکھ لیتی تو بھی یقین نہ کرتی کہ یہ نور فاطمہ نوری بھاگی جا رہی ہے۔ سارا دن زبان منہ میں دیے

بھیڑ بکریوں کی طرح کام کرنے والی نوری خاندان کے ہر چھوٹے بڑے لڑکے کو بڑھ بڑھ کر بھرا جی، بھرا جی کہنے والی کسی چھوکرے کے ساتھ رات گئے بھاگ رہی ہے۔
 نوری کے لیے تو جاوید ہی ناخدا تھا، جی جان لگا کر اس کی پرستش کرتی۔ جاوید تو خیر کیا ڈرتا اسے ضرور ڈرا کر رکھتا۔ اس کے باپ اور بھائیوں کے ہاتھوں مر جانے سے، وہ اسے کہتا کہ وہ تو بھاگ جائے گا گروں تو نوری کی جکڑی جائے گی اور پھر منہ کھول کر پرانے انجن کی سی آواز لیے ہنسنے لگتا۔ نوری واقعی ڈر جاتی، سو سو بار اس سے پوچھتی، قسمیں لیتی۔
 ”تو مجھے چھوڑ کر بھاگے گا تو نہیں، بتا بول نا۔“

اور وہ انجن چلائے ہی جاتا۔ جب وہ رونے لگتی تو وہ اسے اپنے ساتھ لٹائے لیتا۔
 ”اگر تیرے بھائیوں نے میری گردن دبوچ لی تو۔۔۔ تو بھاگ جائے گی؟“ نوری فوراً سر نفی میں ہلا دیتی۔ ساتھ جیسے مرنے کی قسمیں ابھی یاد تھیں۔

”پھر میں کیسے بھاگ سکتا ہوں؟ تو میری نوری میں تیرا نور۔ بات ختم۔“ جاوید نوری کو سینے میں چھپائے پیار کی لوری سنارہا تھا۔ جو عورت محبت میں غرق ہو جاتی ہے وہ غلط درست سے تو پرے ہی ہو جاتی ہے نا، وہ محبت ہی کیسے جانی ہے۔ محبت ہی کیسے جانی ہے۔ کسی کام کی نہیں رہتی۔ اسی لیے کوئی ڈھنک کا کام نہیں کر پاتی۔ اب یہ نہیں تھا کہ جاوید ہی بے غیرت تھا، نوری اپنی سہیلیوں کی نظر سے بھٹکا کر بندے، ہار جانے والی، بھابھی ذرا ادھر ادھر ہوتی اور ان کے میکے سے آئے مرے منہ میں بھر لیتی۔ دور پرے رہنے والی پھوپھی یا خالہ کے ہاں جانی تو چھوٹی بڑی ہزاروں چیزیں اٹھالانی۔ حاجن بی قرآن خوانی کروا تیں تو سستی کی ماری ایک، ایک، دو، دو صفے چھوڑ کر سپارہ پڑھتی اور باقی کا سارا وقت ہونٹ بلا وجہ ہلاتے اور ہنسی رہتی۔ اماں کہتی نوری ابالے پر ایلا آجائے دودھ اچھی طرح سے کڑھ جائے تو ہی اتارنا۔“ وہ ایک ہی بار دودھ ابال ایک طرف رکھ پھر قسمیں کھائے کہ اتنا تو کڑھ گیا تھا جب ہی اتارا۔

نوری میں بڑے چور در تھے۔ ایسے ہی نہیں اماں کے فرشتوں کو بھی سلا کر وہ جاوید سے کئی کئی بار مل آتی۔ صحن میں بھائی سو رہے ہوتے اور وہ سامنے کے ہی دروازے سے جاوید کو لا کر گودام تک لے جاتی۔ بور یوں کے پیچھے گھپاسی بنا رکھی تھی وہیں جاوید چھپا بیٹھا ہوتا۔ پچھلے پہر جاوید چلا جاتا اور بحال ہے کہ کوئی اتنا سا بھی دعو کر دے کہ رات کون اٹھ کر چل دیا تھا یا باتیں کر رہا تھا یا فلاں کھڑک ہوا۔

بڑی بھابھی ذرا تیز تھیں، ادھر ادھر نظر رکھتی تھیں۔ انہیں بھی اندھا کے بیٹھی تھی نوری۔ گودام کی گھپا میں وہ جاوید کے ساتھ لپٹی رہتی، اسے کھلاتی، پیار کی لوری سناتی، دونوں باہم تھے، مشترک تھے، بڑے سیانے تھے، کیا اچھا ہے کیا برا ہے اس کی کسے بڑی تھی، کیا چاہیے اور کیا نہیں وہ اس کی عقل رکھتے تھے، ماں باپ کو بے وفو بنا رہے تھے، انہیں گالیاں دیتے تھے، نوری اپنی اماں تک کی برائیاں جاوید سے کرتی جیسے صرف وہ اور جاوید ہی آسمان سے ایک ساتھ اتارے گئے تھے باقی سب گند بلا تھے۔

جاوید ادھر ادھر ہاتھ صاف کرتا رہتا تھا۔ فخر سے نوری کو چوری کا مال دکھاتا یا اتنے کا ہے کہ اتنے کا ہے، مال کو میت نوری کو بتاتا اور پھر اس مال سے سگریٹ لیتا، میٹھ کرتا دونوں میں بہت نا کارہ عادتیں تھیں، دونوں ایک دوسرے کے لیے درست تھے، ٹھیک کرتے تھے، ٹھیک سوچتے تھے۔ نوری کا جی چاہتا جاوید کا تعویذ بنا کر پہن لے۔ جلد سے جلد شادی ہو جائے لیکن اس کے بھائی اسے ماردیتے لیکن

غیر برادری میں رشک نہ دیتے اور دے بھی دیتے شاید۔۔۔۔۔ لیکن دونوں الگ دنیا بنانے کا ہی سوچے بیٹھے تھے۔

☆☆☆☆

ساتواں مہینہ آیا تو جاوید سارے کام دھندے چھوڑ چھاڑ کر اسے لیے لیے پھرتا۔ یہاں کھلا، وہاں کھلا یہاں گھوما وہاں گھوما، نوری گلاب کی طرح کھلی رہتی۔ دونوں نے اپنے اپنے ذاتی فلسفوں سے ماں اور باپ کو سلادیا تھا اب دونوں انسان بنے پھرتے تھے۔ وہ انسان نہیں جس کے نام پر کائنات بنی۔۔۔ شاید وہ انسان جس کے لیے دوزخ بنانے کے بارے میں سوچا گیا۔ جاوید رات گئے چند ہی آنکھوں سے نوری کو سوتے دیکھتا۔ دن گنتا۔۔۔ پیسے، ضرب۔۔۔ جمع اور تفریق کرتا۔ اس کا جی نہ بھرتا بار بار ضرب جمع کیے جاتا۔

دو چور، دو ڈاکو، دو ڈیرے، نوری جاوید۔

☆☆☆☆

نوری نے دیکھا کہ جاوید بڑا پھنے خان بنتا ہے نا بچے وہ بنے اور وڈا وہ بنے۔ اس نے جاوید کو آڑے ہاتھوں لیا۔

”کتنے کا ہو گا وہ تین مرلے کا پلاٹ؟“

”قیمت نہیں لگوائی میں نے۔“ جاوید کو غصہ آ گیا۔

”تو لگوا جا کر میں نے کیا یہاں اتوار بازار رکھول رکھا ہے۔ ٹھیلے پر بیٹھی ہوں کیا آؤ جی آؤ لیتے

جاؤ جو جی چاہے دیتے جاؤ۔“

”اوپکی جانتی ہے تین مرلے کتنے ہوتے ہیں؟“

”بھتا ہمارا گودام تھا۔“ نوری سب جانتی تھی۔

”اپنے اس پنڈ کے گودام کی دو کوڑیاں لے لے مجھ سے۔ پتا ہے یہاں زمین کا بھاؤ۔“

”مجھے اس زمین کے بھاؤ کا پتا ہے۔“ اس نے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ پلاٹ کی طرف میں ہی لایا اسے۔۔۔ سودا نہیں کر رہی وہ۔ میں نے کہا ایک بچی ہے، بے گھر

ہوں۔۔۔۔۔ یہ ہوں وہ ہوں۔ کتنے جھوٹ سچ بولے افسوس ہی کرتی رہی بے چاری، اس لائن پر تو میں

لایا اسے، اب جیسے بھاؤ تاؤ کر لوں۔ بس ٹھیک ہے جو ہے۔“

پرائیویٹ کلینک کے ویننگ روم میں جاوید نے میڈم کے ہاتھوں میں بچی تھمائی جسے گود میں لیتے

ہی وہ رونے لگی، چونے لگی، افسوس کرنے لگی۔ جاوید اسے اب ملا پہلے کہیں مل جاتا تو اتنا عرصہ اکیلے نہ

گزارتی، اگلے دن جاوید اس کے گھر بچی واپس لینے گیا۔ ساری رات تو میڈم کو ہر بچی سارہ کو گود میں

لیے بیٹھی رہی تھی اس کی تصویریں بناتی رہی تھی۔ اب جاوید آ گیا تھا واپس لینے۔۔۔ کیوں؟

اب ٹھیک وقت آیا تھا بھاؤ تاؤ کرنے کا۔ واپسی کا ہی سن کر گوہر کا دم نکل گیا۔ ایک ہی رات میں وہ

اس کی سچ بچ کی ماں بن گئی تھی۔ اپنا آپ دار کر بھی اس سے الگ نہ ہوئی، اس کا شوہر اس کے اس اقدام

سے خوش نہیں تھا اور ایک عرصے سے دونوں کے درمیان یہی چپقلش چل رہی تھی۔ اب گوہر نے اکیلے ہی

یہ فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔ اکیلے کیا۔۔۔ جاوید ملا اس نے راستہ دکھایا کہ شریفوں کا بچہ ملنا کون سا مشکل ہے،

چھوڑے شوہر کو۔ وہ خود تو اولاد والا ہے آپ کا دکھ کبھی نہیں جانے گا اور نہ ہی کچھ کرنے دے گا، بچوں کے اخراجات سے بچتے ہیں، اب آپ خوب صورت ہیں، جوان ہیں سوچتے ہوں گے ایسے ہی ٹھیک ہے بچوں کی دم کیوں لگانی ساتھ۔ اصل بیوی سے اولاد پر نخر کرتے ہوں گے۔ گوہر تو اب بھی سارہ واپس نہ دیتی ایک ہی رات میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ زندگی کیسے بدل جاتی ہے۔

جاوید پر غصہ تو آیا لیکن اب وہ کیا کرتی، سارہ کے لیے اس نے اسے پلاٹ اور چند لاکھ اور دے دیے اور جھٹ کا غذات بنوا کر کینڈا چلی گئی۔

جاوید نے پلاٹ بیچ دیا، دکان خالی کی اور لاہور آ گیا پہلے وہ فیصل آباد میں تھا، کرائے کا گھر لیا اور اچھے علاقے میں اسٹور کھول لیا۔

نوری چند دن روئی، دل موس کر رہ گئی لیکن میوؤں والے منہ کے ساتھ چپکی رہی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ بچے بچنے والی تھی۔ تو بے۔ بس وہ بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے ایسا کر رہی تھی، بے اولادوں کی مدد کر رہی تھی۔ بچے خوش تو بچوں کے ماں باپ خوش۔ بڑے فلسفے تھے نوری کے پاس اب تو۔ باتیں گڑھنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ جتنی چاہے اپنی مرضی کی کشید کے جاؤ۔ اپنی ہی مرضی ہے جہاں جا ہے چلاؤ۔

جاوید نے اسٹور کھولا تو تازہ ڈبل روئی، انڈوں، مکھن کی روزج ترسیل کا کام بھی شروع کر دیا، کالونی کی کوکھیوں سے فون آ جاتا کتنا کیا کیا چاہیے۔ کوکھی نمبر، لین نمبر اور سب ان کے گھر پہنچ جاتا۔ صبح صبح وہ یہی کام کرتا۔ بانی کا دن کام والے دولڑکے اسٹور دیکھتے۔ وہ ادھر ادھر کی ایسے کام کا پتا کرتا پھرتا جس میں وہ دو پیسے لگا سکے اور منافع زیادہ ہو جائے۔ بہت علیک سلیک ہو گئی تھی اس کی کالونی کی بیگمات کے ساتھ، آتے جاتے ان کے حسن اور طریقے سلیتے کے قصیدے پڑھتا رہتا۔ ان کے گھروں کو دیکھتا رہتا۔ گاڑیوں کو گنتا رہتا۔ ایک پستول بھی خرید لیا تھا اس نے۔ پاس رکھتا، نوری کو ڈراتا، اب خود ڈرنے لگا تھا نوری کے گھر والوں سے، مگر وہ جوان تھا پہلے تو کبھی ایسے نہیں ڈراتا تھا، کہتا تھا دو پیسے آجائیں تو ڈرنا ہی پڑتا ہے، کوئی میری جان فضول میں کیوں لے گا، دولت کے لیے ہی ماریے گا۔

نوری سارا سارا دن چرتی رہتی۔ کھا کھا کے گائے بن رہی تھی، کہتی تھی گھر جاؤں گی اپنے ٹھاٹ دکھاؤں گی انہیں۔

”ہونہہ کتنی لڑائی کی تھی یہاں بھی نہ کہ میرے ٹرنکوں میں گھس کر میری چیزیں کھا جاتی ہے، منہ پر مار آؤں گی وہ ساری چیزیں کھاتی پھرے گی سارا سال۔“

جاوید سوچ میں پڑ گیا۔
”ہاں اگر انہیں دکھا آئے اپنے ٹھاٹ تو ڈر بھی جاتا رہے، پستول رکھی کھلی الماری کو بھی تالا لگا دے گا وہ پھر۔“

جاوید نے کرائے پر ایک کارلی اور نوری گڑیا کو بٹھا کر گاؤں لے آیا، پہلے اپنے گھر گیا، ماں نے بٹھایا، ماں تھا جو، اگر گڑیا کو گود میں بٹھایا، نوری کو منہ بھی نہ لگایا۔ بھابھیں آئیں چار باتیں دونوں کو سنا کر چلتی بنیں۔ بھائی گھر ہی نہ آئے، باپ ایک طرف بیٹھا حقہ پیتا رہا جیسے گھر میں کوئی آیا ہی نہیں۔ جاوید نے پیسے نکال کر اماں کو دیے انہوں نے پٹو سے باندھ لیے اور پھر جاتے وقت گڑیا کے ہاتھ میں دے دیے۔
”تو نے دیے میں نے رکھ لیے اب میری طرف سے یہ گڑیا کے لیے۔“ جاوید کا منہ بگڑ گیا۔ کیا

ضرورت تھی اسے آنے کی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ابانے منہ اندر کی طرف کر کے اماں کو کہا تھا کہ آنے جانے والوں کو گلی تنگ پڑ رہی ہے وہ ڈبّا ایک طرف کروا ہمیں تو اس گاؤں میں رہنا ہے، گاؤں والوں کی راہ کیوں ڈنگا کریں۔ جاوید اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے ٹھاٹ بھاٹ وہیں راہ رکھ ہو گئے، منہ اتر گیا۔ پیسہ جیب میں ہی پڑا رہ گیا۔ کارگدھا گاڑی سے بدتر لگنے لگی۔

جاوید نے نوری کے گھر کی طرف کار کی، دروازے پر بڑا تالا لگا تھا، گاؤں میں نیا پرندہ بھی اڑ کر جاتا تھا تو سب کو خبر ہو جاتی تھی ان کے آنے کی خبر نہ ہوئی ہوگی؟ مرگوں میں بھی جاتے تو ایک کو گھر چھوڑ جاتے کہ منہ تو قبروں کے بند ہوتے ہیں نہ واہ نہ در۔ گھروں کے در کھلے ہی رکھتے چاہئیں۔ کار کی ڈنگی میں رکھے شہری کپڑے، براندے، شیشے کے گلاس، سیب کے مربے اور مٹھائی کا بڑا ڈبّا قہقہے لگا رہا ہوگا۔ نوری کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ جاوید کو کار میں ہی چھوڑ کر وہ حاجن بی کے گھر آئی۔ انہوں نے پیار سے بٹھایا، پانی کا پوچھا۔ اس نے گھر والوں کا پوچھا۔ وہ مسکرائیں۔

”ٹھیک ہیں سب۔“

”کہاں گئے ہیں سب؟“

وہ سچ بول کر اسے دکھی نہیں کرنا چاہتی تھیں شاید۔

”جاوید اندر کیوں نہیں آیا۔“ نوری اٹھ کھڑی ہوئی، کار میں پیسہ کر بلا وجہ گڑیا کو مارا۔

”اب نہیں لاؤں گا تجھے۔ عزت سواہ کر دی میری ابا کو دیکھا تھا گوبر کے پاس بیٹھا رہا گند میں، حقہ گڑا تار ہا۔“ مٹی پچھر کی بھنھنا ہٹ سننا رہا۔“ جاوید سارے راستے بکنا رہا۔ نوری چپ ہی رہی اس کے گھر والوں کو بھی گالیاں دیتا رہا۔ نوری نے کام والی کو ساری چیزیں دے دیں۔ اسے منہ کھول کر حیرت کے اظہار کا سلیقہ بھی نہ آیا۔ جھٹ چیزیں اٹھا کر نکل گئی کہ باجی ٹھیا گئی ہے کہیں عقل ہی نہ پکڑ لے۔

گاؤں کا اپنا راستہ نوری بھاگ کر بند کر آئی تھی تا اس پر لگا تالا بھی کل دیکھ آئی۔ تسلی ہو گئی۔

جاوید نے پستول والی الماری کو تالا لگا دیا وہ تو گھر کو ہی تالا لگا کر بھاگ لیے تھے، اس کے پیچھے کیا خاک آئیں گے۔ نوری کا خیال تھا کہ اس کے بھائی گاؤں گاؤں پھرے ہوں گے اسے ڈھونڈنے ریلوے اسٹیشن، لاری اڈے، جانے کہاں کہاں مہینوں بھپتے رہے ہوں گے، نوری مل جائے گی، کہیں نوری مل جائے مارنا ہی ہے لیکن پکڑ میں تو آئے، اسے لگا انہوں نے تو اسے اتنی وقعت بھی نہ دی کہ ڈھونڈ کر ماری ڈالیں۔ انہوں نے زمین پر تھوکا ہوگا۔

”تھو۔۔۔ اماں سمجھ لے وہ کبھی اس گھر میں رہی ہی نہیں، پیدا ہی نہیں ہوئی، بھاگ گئی ہے تو اولاد والی ہوگی تو اولاد اس سے بھاگے گی اور وہ اولاد سے۔ بار بار بھاگے گی ایک بار کی بھاگی بار بار بھاگتی ہے۔ ٹھکانے بدلتی ہے کبھی دل کے اور کبھی جسم کے۔“

بھائیوں نے ٹرنک میں سے اس کے کپڑے نکال کر آگ لگا دی ہوگی۔ ہر نشان مٹا دیا ہوگا جو کوئی پوچھنے آتا ہوگا اسے صاف کہتے ہوں گے۔

”کون نوری؟ ہم تو نہیں جانتے۔ ہم سے نہ پوچھو۔“

اماں نے جھیز کا سامان نکال نکال تا مین یا چمارن کو دے دیا ہوگا اور ابا، اس نے دوبار زمین پر

چیل ماری ہوگی۔

”لے یہ گئی اب سب اس پر تھوکتا۔“ ابا کی جب کسی سے لڑائی ہوتی تو وہ زمین پر دو بار چلیں مارتا اور دو چار گالیاں دے کر کہتا ”لو یہ بڑا ہے کر لو جو کرتا ہے۔“ تو اب ان سب کے لیے وہ گند ہوئی۔ اس کا ابا کتنی جلدی اس کی اصلیت کو جان گیا۔ خود نوری کے جاننے سے بھی پہلے۔ وہ جان گیا کہ ایسے لوگ کیا ہوتے ہیں۔ شہری زبان میں وہ غلاظت ہوتے ہیں۔ ایسی غلاظت جسے ڈھیر پانی سے بہا دیا جاتا ہے گھروں میں گھسنے نہیں دیا جاتا۔

☆☆☆☆

نوری ایک بیٹی کی ماں بن گئی اس میں رنج بس گئی۔ بیٹے کے لیے آپں بھرتی مانو کی جگہ بیٹا ہوتا تو اس کا دل خوش ہو جاتا۔ گڑیا اسکول جانے لگی۔ مہینے میں ایک بار وہ پارلر چلی جاتی، بال بھی رنگوا لیے تھے، کئی بار جاوید نے گھر آ کر اسے بتایا کہ بیگمات کیسے چلتی ہیں، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر ایسے جیسے ہوا میں ہلکورے لے رہی ہوں، تو بھی ایسے چلا کر، وہ دیسے تو خاک چلتی ہاں کچھ قریب قریب ضرور ہو گئی تھی۔ باہر نکلتی تو چال کو قاف میں رکھتی اور گھر آتے ہی گم کیسے سانس کی طرح ایک دم سے چال کو کھلا چھوڑ دیتی۔ بہت سی چیزوں کا مغویہ بن گئی تھی، بال رنگوانے ہیں کٹوانے نہیں، برقع پہننا ہے، نقاب نہیں کرنا، فرائی جھونکا کھانا ہے اور پیٹ بھرنے کے لیے الگ سے نان کباب کھانے ہیں۔ جھینگے سے زبان بھرتی ہے پیٹ نہیں، بے شک زبان بھرنے والے کھانوں سے پیٹ گلے کی آنت تک آ جاتا۔

کام والی کام کر جاتی تو اس کی چندی آنکھوں کو گند نظر آنے لگتا۔ پانی کا پائپ لگا کر دھونے بیٹھ جاتی، دل کرتا تھا کھانا گھر پکا لیتی پھر چلتی تو اچھا نہ لگتا اور اگلے دن کام والی لے جاتی۔ جاوید کو فون کر کے بازار سے ہی منگواتی۔ جاوید سپدہا سادہ ہی رہا گھر آتا نان کباب، مچھلی، گوشت، سلاد، کھیر، گاجر کا حلوہ، دس بندوں جتنا لے آتا۔ خوب شمس ٹھسا کر کھاتا۔ دو گلاس پانی اوپر سے پیتا، پیٹ پر ہاتھ پھیرنا ڈکار لیتا اور پیسوں کا حساب کتاب کرتا اور سو جاتا۔ وہ روز کاروڑ ایک ہی رہا۔ صبح کام والی آئی تو میز پر رات کا بچا کھانا اٹھا کر شاپر میں ڈال کر جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے جاتی۔

اکثر رات کو نوری اٹھ بیٹھتی، نہ جانے کس احساس کو لیے رونے لگتی، کبھی ایک بار بھی نہیں ہوا تھا کہ جاوید نے آنکھ کھول کر اسے دیکھا ہو اور اسے سو جانے کے لیے کہا ہو وہ گڑیا کے بستر پر آ جاتی اسی کے ساتھ سو جاتی، مانو سادھوسی بچی تھی، بمشکل ہی روتی، بھوکی ہو کر بھی نہ مچلی۔ پڑے پڑے خود سے ہی سو جاتی۔

گڑیا ناک پر ہاتھ رکھ کر کہتی۔

”اماں بد ہو۔۔۔ نہاتی نہیں ہو کیا۔“ نئی نئی اسکول جا رہی تھی تو نئی نئی باتیں کرنے لگی تھی۔ نوری خود کو ملی دیتی نہاتی تھی۔ صاف کپڑے پہنتی تھی کہاں کی بد ہو۔

”اماں تمہارے دانتوں میں خون جما ہے۔“ ایک آدھ میں کیڑا لگا تھا۔ گڑیا کو خون نظر آ رہا تھا۔ جاوید گدھے کی سی ہچکوں ہچکوں ہنسی میں ہنسنے لگا۔

”ہاں خون ہی ہے گڑیا، تیری ماں خون پیتی ہے، چڑیل ہے یہ بڑے لوگوں کو مار کھائی ہے۔“ ہچکوں، ہچکوں۔

”میں اکیلی تو نہیں مار کھائی۔“ نوری پھنکاری۔

جاوید نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

”اب بول نا۔۔۔ کہہ کہ ہم سب اودھ بلائیں ہیں مل کر کھا رہے ہیں۔“ جاوید غصے سے اٹھ کر چلا گیا۔ لیکن نوری کو منہ اور منہ یاد آ گئے۔ ایسے وقت وہ بی وی کی آواز اونچی کر دیتی پاپرس اٹھا کر بازار چلی جاتی۔ کپڑے جوتے خریدی۔ دکان داروں سے بلاوجہ بحث کرنی اٹھ کر چلی جاتی۔ پھر واپس آ کر وہی کپڑے لے جاتی۔ گھر آئے تک منامنی بھول چکی ہوتی۔ کپڑے ساتھ لگا لگا کر دیکھتی۔ جوتے جیولری پہن پہن کر شیشے کے آگے کھڑی رہتی۔ نوری عورت بنی رہی۔ کھانے پینے والی گڑیا۔ بیاہ بیاہ رہ جانے والی گڑیا۔ سبھی کھیل کھیلنے والی گڑیا۔

اب نوری کو جلد سے جلد بیٹا چاہیے تھا۔ بیٹے کی پیاس لگ گئی تھی اسے۔ بیٹا بیٹا کرتی رہتی تھی ہر وقت۔۔۔ امید سے تھی بہت خوش رہتی تھی۔ جاوید بہت چپ چپ رہتا تھا۔ کام کرتے اسے گنگناتے دیکھ لیتا تھا تو بلاوجہ چڑھ جاتا تھا۔

”بندر کر اپنے یہ سر۔“ وہ ڈر کر اپنے سر بند کر لیتی۔ پھر بھی خوش ہی رہتی۔ جی بھر کر خریداری کر رہی تھی۔ جاوید کو ایک دن دکھانے بیٹھ گئی خریداری۔ جاوید نے سارے شاپراٹھا کر الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ وہ منہ کھول کر اسے دیکھنے لگی۔

”تالا کیوں لگایا؟“

”ابھی انہیں تالے میں ہی رہنے دے۔ دیکھیں گے کب باہر نکالنا ہے۔“ جاوید ایک سگریٹ سلگا

کر چلا گیا۔ اس کی رگ رگ سے واقف تھی نوری۔۔۔ ایک اور گاہک۔۔۔ وہ بت بنی بہت دیر وہیں بیٹھی رہی۔ جاوید گھر سے بھی جا چکا تھا، کیسے دل لگا کر کام کرتا تھا جاوید۔ وقت کے ساتھ بدل ڈالا تھا خود کو۔ اس کے ابا اسے ایک ہی گالی دیا کرتا تھا کہ ”وہ ذات کا کمینہ ہے اور خواص کا شیطان۔“ بالائی بالا وہ گندم کی کئی بوریاں بیچ کر کھا گیا تھا۔ اس کے باپ کو پتا لگ ہی گیا کہ گودام میں سے گندم جا کہاں رہی ہے۔ اپنی ماں کی سونے کی بالیاں بڑی چھوٹی بیٹی میں رکھے پیتل، تانے کے بڑے بڑے پٹیلے۔ گھر والے کسی شادی، مرگ میں چلے جاتے اور وہ کچھ نہ کچھ بیچ کر پیسے کھا جاتا، گھر کا کٹھ کباز تو وہ سب کے سامنے ہی سائیکل پر لاد لاد کر کبڑے کے پاس لے جاتا، باقی سب ادھر ادھر ہوتے تو بہت کچھ نکال کر لے جاتا۔ اماں کا چاندی کا لوٹا تھا، کبھی کبھار وضو کے لیے استعمال کر لیتی۔ ایک دن وہ لے اڑا، وہ ہر چیز پر نظر رکھتا کہ کیا کیا بک سکتا ہے۔ کہتے ہیں اگر کوئی بیوپاری بن جائے تو اپنے سونے کا بستر اور پہننے کے کپڑے بھی بیچ دیتا ہے۔ مول کھرے کرنے کا ایسا نشہ ہے کہ پیسہ بے شک زمین میں دبا دے لیکن مول کھرے کرنے کے نشے سے جان نہ چھڑوا سکے نہ چھڑوانا چاہے۔ اپنے گاؤں کے گھر میں ایک ایک چیز پر نظر رکھ کر دل ہی دل میں اس کا مول رکھنے والے جاوید نے اب ایک ہی زمین پر نظر رکھ پھوڑی تھی۔ مول بھی اسے معلوم تھا اور تول بھی۔ وہ قیمت بھی جانتا تھا اور اسے نکلوانا بھی۔ ذات کا کمینہ، خواص کا شیطان۔

جاوید نے ایک اور گاہک ڈھونڈ لیا۔ کوئی بیگم تھیں جن کے بنگلے پر جاوید انڈے، ڈبل روٹی کی ترسیل کے لیے جاتا تھا۔ جانتا تو وہ ہر بنگلے کی ہر بیگم کو تھا آنکھیں جو تراش لی تھیں اس نے۔ اب سب پر

کر لاپتا ہو گیا تھا۔ سالوں بعد بڑی بہن سے رابطہ کر لیتا ڈراہی رہتا کہ کوئی رابطہ اسے لے ہی نہ ڈوے۔ ساری جائیدادوں پر قبضہ ہو چکا تھا۔ سب کی جانیں جا چکی تھیں۔ عورت وکیل فاخرہ کا شوہر بھی اسی دشمنی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اسی شوہر کے قتل کا مقدمہ بھی لڑی رہی، پریکٹس تھوڑی بہت چل رہی تھی۔ ایک بار خود کشی کی کوشش بھی کر چکی تھی۔ جاوید کا آنا جانا تھا اس کی اجازت کبھی میں کبھی بکھار۔ جاوید نے ہی اسے سمجھایا کہ وہ اپنی اجازت زندگی کو آباد کر لے کوئی بچہ لے کر پال لے۔

”ایک بار گئی تھی ایک ادارے میں انہوں نے میری خاندانی تاریخ کا سن کر مجھے مشورہ دیا کہ میں انہیں بچے کی سیکورٹی کی ضمانت دے دوں۔ میری اپنی جان کی ضمانت نہیں ہے چونکہ ار آئے دن بھاگ جاتے ہیں۔ بھائی ملکوں ملکوں بھاگ رہا ہے۔ میرا تو ایسے منہ چھپا کر بھاگے پھرنے کو جی نہیں چاہتا۔ شوہر کے گھر کو چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں۔ موت تو جب آئے گی کسی بھی جگہ آ جائے گی۔“

اس اکیلی، دکھاری، بیوہ عورت کو جاوید نے اپنی بیٹی دے دی تاکہ اس کی زندگی میں بہار آجائے۔ امیر دیوالیہ بھی ہو جائے تو فقیر نہیں بنتا۔ وہ بھی فقیر نہیں تھی اپنی طرف سے کچھ نہیں دیا تھا لیکن گھر کی ہر چھوٹی بڑی چیز بیچ آنے والے کے لیے وہ بہت۔ بہت تھا۔

شہر سے دور اس کی ایک کینال کی فیکٹری تھی جس پر اب قبضہ ہو چکا تھا۔ اصل کاغذات اس کے پاس تھے پروہ قبضہ نہیں لے سکی قبضہ گروپ سے۔ کاغذات جاوید کے ہاتھ میں دیے کہ جو قبضہ لے سکو تو فیکٹری تمہاری۔

پلاسٹک کے برتن بنانے والی فیکٹری تھی فی الحال بند تھی، جاوید نے چپکے سے جا کر فیکٹری کا جائزہ لیا۔ جاوید کا حلقہ احباب اب کم نہیں تھا وہ تو عورت تھی۔ کیا قبضہ چھڑوائی یہ تو مردوں کے کام ہوتے ہیں۔ جاوید ہٹا کٹا گھاگ عیار اور دلالت اس کے تو بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

پیسے اور عقل سے سب ہو جاتا ہے۔ اصل کاغذات لے کر جاوید گڈو کے پاس چلا گیا۔ گڈو لاہور کا مانا ہوا بد معاش تھا۔ یہ مردوں کے کرنے کے کام ہوتے ہیں۔ عورتیں کیا جانیں۔ گڈو نے کاغذات دیکھے، فیکٹری دیکھی اور فیکٹری کے آدھے مالکانہ قبضے پر راضی ہو گیا یعنی بعد ازاں فیکٹری کا آدھا مالک وہ بھی ہوگا۔ سودا یہ بھی کھانے کا نہیں تھا۔ بے کار سے مفت بھلا اور مفت سے آدھا، چھ مہینے کے اندر اندر گڈو نے فیکٹری کا قبضہ لے لیا۔ بد معاش وہاں قبضہ کیے بیٹھے تھے بد معاشوں نے ہی قبضہ چھڑوا لیا۔

اس ساری رات جاوید سو نہیں سکا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ کبھی وہ ایک سائیکل کا ہی مالک بن جائے گا۔ آج وہ ایک فیکٹری کا مالک بن چکا تھا۔ پلاسٹک کے گھریلو برتن بنانے کا پلانٹ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے وہی کام شروع کر دیا۔ فیکٹری شروع کرنے میں جو لاگت آئی تھی وہ لاگت گڈو نے اٹھائی اور وہ تین حصے کا مالک بن گیا۔ یہ تو ہونا ہی تھا بد معاشوں کی بد معاشی سے کوئی نہیں بچتا۔ جاوید اندر ہی اندر کھولتا رہا لیکن کیا کرتا چوں چاں کرتا تو قتل ہو جاتا۔ اب جو تھا بہت تھا۔ نوری نے جو وائی تباہی مچا رکھی تھی اس کا انجام تھا یہ، گھر آ کر جاوید نے نوری کی دل لگا کر دھلائی کی کہ اس کی خواست سب کچھ نکلتی جا رہی ہے۔ سب کچھ ہاتھ سے جا رہا تھا، پوری فیکٹری کا مالک اب تیسرے حصے کا حق دار رہ گیا تھا، سب اس کی خواست کی وجہ سے تھا۔

”تیرا باپ بہت بیمار ہے۔“ شام کو جاوید کو یک دم جیسے اسے بتانا یاد آ گیا۔ اس کا رابطہ تھا گاؤں

کے یار دوستوں کے ساتھ۔ اسے اطلاع دے کر سو گیا، آدھی رات میں پھر اٹھا اسے اٹھایا، وہ منہ دیکھنے لگی۔

”جلدی کر، بی بی تیرا پوچھ گیا۔“ وہ دوبار اسے اٹھا کر جا چکا تھا پر وہ پھر خراٹے لینے لگی۔ اس کے ہوش و حواس میں آنے کا انتظار ترک کر کے جاوید نے اسے جھنجھوڑا اور کہا۔ نوری بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

”اٹھے گی یا منہ بھی نہیں دیکھے گی۔“ اپنے باپ کا مرانہ دیکھنے کے لیے وہ اٹھ بیٹھی۔

☆☆☆☆

شامیانے میں وہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ کسی ایک نے بھی اسے پلٹ کر دیکھا نہ منہ لگایا۔ بڑی چیز تھے وہ سب ایسے ظاہر کر رہے تھے جیسے نوری وہاں بیٹھی ہی نہیں۔ دو عورتیں اس سے الجھ کر گریں جیسے اس سے نہیں کسی اینٹ پھر سے الجھ کر گری ہوں، ہونہ۔ جاوید مردانے میں تھا۔ اس کی بھابیوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا اور دونوں بہنوں نے بھی، کیسے نہ اٹھاتیں یہ وہی باپ تھا نا جس نے بہوؤں کا غصہ بیٹیوں پر اتار لیا اور بیٹیوں کا غصہ بیوی پر۔ لیکن انہیں کچھ نہ کہا بھی۔ نوری نے لعنت بھیجی جاوید پر، جس کی محبت میں اندھی ہو کر وہ گھر سے نکل گئی ورنہ آج وہ بھی دل کھول کر بن ڈالتی، بال کھول مٹی سواہ ڈالتی۔ بڑی بوڑھیوں کے گلے لگتی، کوئی اسے سلی دیتا بہنوں کے ماں کے گلے لگتی۔

اس کا دل جلتے تیل کی کڑائی میں ہر آن ابل رہا تھا وہ چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ اماں نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر اسے نہ دیکھا، آپا کی طرح اس کا بھی جی چاہا کہ بار بار لپک کر اپنے باپ کی پیشانی چومے، ہاتھوں کو گالوں سے لگائے اور نہیں تو قریب بیٹھ کر چپکے سے معافی ہی مانگ لے۔ اب اتنا تو چل مارنے سے رہا لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ قریب گئی نہیں کہ سب نے چیلوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑنا ہے۔

”آگئی باپ کو پلید کرنے۔“

”چل پرے ہٹ۔“

وہ پرے ہی بیٹھی رہی۔ بہانے سے گڑیا کو آگے کیا کہ نانا کو پہلی اور آخری بار دیکھ لے وہ آگے ہوئی نہیں کہ آپا نے ہاتھ بڑھا کر اسے پرے کر دیا۔

جنازہ اٹھا تو حاجن بی بی اس کے پاس آئیں، صبر کا کہا اور یہ بھی کہ اب وہ چلی جائے وہ ڈھیٹ بن کر بیٹھی رہی، چلی جائے گی اتنی جلدی کیا ہے۔ اس نے سوچا ذرا نظر بچا کر اماں کے ٹرنک سے اس کا ایک آدھ کپڑا ساتھ لے جائے۔ جب وہ بھاگ رہی تھی تو اپنے کپڑے لے کر گئی تھی اور ساتھ باپ کی عزت، اب اسے مرے ہوئے کا ایک کپڑا چاہیے تھا جسے سینے سے لگا کر وہ اب کی خوشبو سونگھ سکے اور اسے یاد رہے کہ اس کا کوئی باپ بھی تھا، ایسا باپ جس پر بھاگتے ہوئے نظر نہیں ڈالتی تھی اور مرے ہوئے کو مسلسل دیکھ رہی تھی، جس کی کھلی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی اور اب بند آنکھوں کو چومنا چاہتی تھی۔

ابا کے کمرے کی طرف نظر رکھے وہ موقع کی تاک میں تھی لیکن اندر باہر سو کو ارجع تھے وہ کیسے ابا والے کمرے میں چلی جاتی۔ رات کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ رشتے داروں کا رش ذرا چھٹا تو اماں اس کے قریب آکر بیٹھی۔

”کس دھندے سے لگی ہے تو نوری! وہاں۔“ نوری ہکا بکا رہ گئی۔ مرگ والے گھر میں اماں کیا

لے کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے گلے سے نہ لگاتی، تسلی نہ دیتی اتنی بڑی گالی تو نہ دیتی، بیوہ نہ ہوئی ہوتی اماں تو ضرور نوری کو پلٹ کر کھری کھری سناتی۔

”تہجد پڑھ کر سوتی ہوں تو تیرے ہاتھ پاؤں، منہ ناک، کان سے پھنسی پھوڑوں ساخون نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ کس گند سے لگی ہے نوری! غنڈ غنڈ کس کا خون پیتی ہے۔“

نوری کو لگا ابھی اسی کی میت اٹھ گئی ہے۔ وہی مرگئی ہے قبر میں بھی وہی پڑی ہے۔ بال کھولے اور مٹی پھانکے۔

”تیرا باپ قبر میں پڑا ہے نا مجھے بھی جانا ہے۔ اولاد کے لیے بھی جواب دینا ہوگا ہمیں۔ کچھ رحم کر اپنے مرے باپ پر۔ اپنی پوچھ پڑاں کا بوجھ اس پر نہ ڈال۔ نماز روزہ کیا کر۔ باقی تجھے ہم معاف کر چکے ہیں۔ اپنی دنیا میں بس، یہاں نہ آیا کر۔“

نوری نے چار بندوں کا انتظار کیا کہ آئیں اور اسے کندھا دے کر میت اٹھا کر لے جائیں۔ اس سے اپنی لاش کا بوجھ اب کہاں اٹھایا جائے گا۔ گاؤں میں رہنے والی اس کی ماں نے کتنی باتیں جان لی تھیں۔ کیا مائیں دلی ہوتی ہیں؟

اماں نے زندگی بھر ایک تہجد نہ چھوڑی اور نوری نے ایک بھی فرض نہ پکڑا۔ دیواریں تھام کر نوری اٹھی، باہر نکلی۔ اس کے اتنے بڑے خاندان میں صرف جاوید ہی سیٹھ لگ رہا تھا اور وہ اکیلی سیٹھانی، بھابھیاں، خاندان کی دوسری سب اس کے سامنے چوڑی چھاری لگ رہی تھیں۔ ایک وہی مہارانی تھی ان میں۔ مہارانی چپکے سے اپنے محل میں واپس آگئی۔

☆☆☆☆

چاند نے شامی محلے میں ہی آنکھ کھولی تھی۔ چلنے پھرنے لگا تو وہاں سبھی اندر کے کام کرنے لگا۔ خدمت گزار بن گیا۔ دو اور اس جیسے لڑکے تھے، لڑکیاں بھی تھیں اسی کی عمر کی لیکن انہیں سنبھال سنبھال کر رکھا جاتا۔ سبھاؤ سے طریقے سے باقیوں میں سے کوئی ایک اس کی ماں بھی کون تھی وہ نہیں جانتا تھا۔ کوئی بھگ کر بچی بچے کو سینے سے لگا کر نہ کہتی کہ میں ہوں تیری ماں دنیا میں لے آنے سے ہی تو کوئی ماں باپ نہیں بن جاتا نا۔

آہستہ آہستہ اس نے شعور کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ بازار میں گامک گھیرتا رہا۔ انداز زمانہ سا تھا لیکن کسی کی مجال نہیں تھی کہ اسے نچا دکھا جائے۔ نیم زمانہ انداز میں بات گوچ دار کرتا۔ کچھ عرصے سے ایک آدمی وقفے وقفے سے وہاں آ رہا تھا۔ وہاں اس جیسے آدمی کا آنا بنتا تو نہیں تھا لیکن وہ ایسی جگہ تھی کہ وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا، نورتن بانی سے آ کر ملتا، اس سے گالیاں سنتا اور چلا جاتا۔ اس دن چاند نے نورتن سے پوچھ ہی لیا کہ یہ بار بار یہاں گالیاں کھانے کیوں آتا ہے۔

بولی۔ ”بچہ ڈھونڈتا پھرتا ہے یہاں اپنا۔“

”کون سا بچہ یہاں تو اب کوئی بچہ نہیں؟“

”پہلے بھی تھا۔ یہاں والیاں ناسیدھی سیدھی انسان دکھتی ہیں اور کھوپڑی الٹی رکھتی ہیں۔ ایک کی کھوپڑی الٹ گئی تھی بچہ لے کر بھاگ گئی جس کا تھا اسی کے پاس۔ دو دن بعد ہی واپس آگئی، ناک کان سو جا کر، ہڈیاں تڑوا کر۔“

چاند کو ہنسی آگئی۔ ”گئی کیوں تھی؟“
 ”پھنکار پڑی تھی دل پر روڑی پر گند پھینکنے سب ہی جاتے ہیں۔ کسی کو لاتے دیکھا ہے، اب آیا ہے وہی گندا ٹھانے۔ میں نے کہا پیسہ دو لے جاؤ۔“

”کیا کہتا ہے؟“

”کرکال ہے؟“

”ہے کون؟ کس بچے کا باپ ہے؟“

”تجھے کیا تو اپنا کام کر دو بارہ مت پوچھو۔“

چاند نے دوبارہ نہ پوچھا، نئی باتیں نہیں تھیں یہ سب، آئے دن کے قصے تھے۔ ایک دن پھر آیا ساٹھ ہزار لایا اور بیروں پر گر گیا۔ اپنی لمبی داڑھی کے واسطے دیے۔ نہ جانے کیا کیا بکتا رہا۔ چاند اور اس جیسے چار کو نورتن نے بلالیا۔ آگے وہ جانتے تھے انہیں کیا کرتا ہے۔ چھوٹی بڑی گالیاں دے کر اسے ایک سرنگ نما اندھیرے کمرے میں لے گئے اور خوب لاتوں گھونسوں سے اسے مارا۔ وہ بے چارہ ضعیف آدمی مار کھاتا رہا چلاتا رہا۔

”مارڈالو، تم میں سے کوئی تو جانتا ہوگا، میرے پاس ساٹھ ہزار ہیں لے لو صرف اتنا بتا دو گلابی مرگئی ہے یا کہیں چلی گئی ہے۔“

رشید عرف چاند زندگی میں پہلی بار اندر کہیں اٹھنے والی ایک ٹیس سے آشنا ہوا۔ گلابی اس کی ماں تھی اور یہ داڑھی والا مسجدی ٹوپی والا کندھے پر دھرے صافنے والا ضعیف کمزور لاغر دھنسی آنکھیں۔ آنسوؤں سے تھکے گال یہ کس بچے کا پتا کرتا پھر رہا تھا۔ کون تھا اس کا بچہ۔۔۔
 گلابی کا ایک ہی بچہ تھا چاند۔

چاند کے اندر جو تیس اٹھی وہ بڑھتی ہی چلی گئی وہ وہاں سے بھاگ گیا۔ چھوٹی چھوٹی تنگ گلیوں کو پار کرنے لگا۔ چوباروں کے نیچے سے اندھیروں کے اوپر سے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دور نکل گیا۔ بہت دیر تک بھاگتے رہنے کے بعد ایک جگہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ جھٹکی، کالیا اسے ڈھونڈتے آئے اٹھا کر ساتھ لے گئے، رات گئے اسے ہوش آیا تو اس سرنگ نما کمرے کی طرف بھاگا وہ تو جا چکا تھا جانا ہی تھا۔

گاہوں پر نظر رکھے رکھے چاند نے ان میں انسانوں کو تلاشنا شروع کر دیا۔ الٹا سیدھا سا ہو گیا دماغ کو ٹھٹھے سے پرے ہوتا گیا، وہ کیا ہے کیا ہوتا گیا اسے خبر نہیں تھی۔

ایک دن پھر آ گیا وہ چڑے کا جھوٹا سائیک بٹل میں دبائے۔ شاید زیادہ رقم کا انتظام کر لیا تھا اس نے۔ چاند کو اپنی اصل قیمت کا ابھی ابھی اندازہ ہوا۔ آج کوئی اس پر بھی لٹانے آیا تھا، اس کے لیے دام لایا تھا، ”کیا چاہیے؟“ جھٹکی اور کالیا کو ایک طرف کر کے چاند آگے بڑھا۔ کالیا تو پھر سے چائے مارنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

”بچے ایک آخری بار نورتن سے ملنے دوا سے کچھ لاکھ بیس ہزار لایا ہوں۔“

”کسے بیچ کر لائے ہو؟“ چاند کی آواز سپاٹ تھی۔

”اب کچھ نہیں بچا تو بیچنا کیسا؟ اچھے وقتوں کا ایک دوست تھا، اس نے مدد کی ہے۔“ وہ بہت خوش

تھا۔

”تو بھی تو یہاں ہے، تجھے پتا ہوگا گلابی کا، یہ سارے پیسے تو رکھ لے۔“ اس نے چڑے کا بیک نکال کر ہاتھ میں پکڑا۔

”مرگئی ہے وہ۔“ چاند نے اسے گھور کر دیکھا۔

”یہ تو نورتن بھی کئی بار کہہ چکی ہے۔ کہیں اور ہوگی گلابی یہاں رہنے والوں سی نہیں تھی۔“

”پھر رکھنا تھا اسے اپنے پاس۔“

”کیسے رکھ لیتا۔ رکھ لیتا تو اب یہ دھکے جوتے کیسے کھاتا، بچے تو نہیں سمجھ گا۔ تب میں۔۔۔ تب

میں شیطان تھا۔“

اس نے سرگوشی کی۔ ”یہاں گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا، بہت پیسوں والا تھا یہاں آتا جاتا رہتا تھا یاروں کے ساتھ۔ گلابی کو اپنے پیچھے لگا لیا، عین میری شادی سے مہینہ پہلے بچے کو گود میں لیے آگئی میرے پیچھے۔ مجھے تو اس وقت پتا چلا میں کون ہوں، دودن رکھ کر اباجی نے خوب پٹوایا اسے، بھوک پیاس سے بچ بھی دودن بلکتا رہا۔ اب اس عمر میں اس کا بلک بلک کر رونا کان کے پردے پھاڑ دیتا ہے، تو نہیں سمجھ گا بچے، اب کیا کیا گزرتی ہے مجھ پر اد پر تلے کے تین بیٹے جوان ہو کر جائیداد کے لیے قتل ہو گئے۔ بیوی بیماری سے چل بسی۔ بیٹی جل کر مر گئی۔ آل اولاد گئی، مال اسباب گیا تجھے نہیں پتا، بچے یہ سب کیوں ہوا۔ مجھے جب معلوم ہوا تو ایک مومن پرہیزگار کے پیچھے بھاگا۔ سب کہہ سنایا انہیں، اسی بندہ مومن نے مجھے یہاں کی راہ دکھائی، کہتے ہیں جاؤ جا کر سمیٹ لو دودنوں کو، جہاں ملیں، میں آ گیا ہوں انہیں سمیٹے۔ اپنے گناہ سمیٹنے، پیروں پر سر رکھنے۔“

وہ بول رہا تھا۔ چاند چلتے پھرتے لوگوں کے دھول ہو رہا تھا۔

”گلابی مر گئی ہے سنا تھا اس کا ایک بچہ تھا، بیمار رہ کر وہ کب کا مر چکا۔ سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔“

داڑھی والے کو ایک زوردار جھٹکا سا لگا۔ کھڑے کھڑے ڈگمگا گیا۔

بہت دیر تک وہ ڈگمگائے انداز سے ہی کھڑا رہا۔

”قبروں کا ہی اتنا پتا دے دو۔“

”کسی بھی قبر پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھ لو۔“

”فاتحہ کسے پڑھنی ہے، مغفرت تو انہیں میری کرنی ہے۔“ صاف سے آنکھیں صاف کرتا وہ

بولا۔

سرکار کہتے ہیں جتنوں کو اپنا سکوتا تباہی اچھا، بچے تو چل میرے ساتھ، اللہ کی راہ بھلی، سرکار کا نام

بھلا۔ چل نکل جا یہاں سے۔ چھ لاکھ لے لے مجھ سے، کاروبار کر، بیوی بچے کر۔“

اس بار چاند پھٹکی ہنسی ہنسا۔

”ہر انسان اپنی مرضی والا، میں نے کر دیکھی اپنی مرضی اب سرکار کی مرضی مجھے پیاری، بہت دیر کر

دی پر تو دیر نہ کر، راستہ بدل لے۔ تو بھلا مانس لگتا ہے مجھے، ہم سب ہی بھٹلے مانس ہوتے ہیں بس یہ جو

ادھر ادھر اپنی اپنی کرتے ہیں یہ بُرا ہے، میرے ساتھ چل شادی کر گھر بنانا یہاں سے کوئی ایک نکال کر

لے جا۔ اپنے ساتھ خدا خوش ہوگا، باپ بنے گا تو قدر آ جائے گی خدائی کی، پتا لگنے لگے گا تجھے کہ خدا

بندے سے کیا چاہتا ہے۔ باپ بن کے دیکھ بچے کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سکھا، پڑھا اور پھر اسے سینے سے لگا کر تھوڑا آجائے گا۔ چل میرے بچے تو میرے ساتھ چل۔ میں تجھے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سکھاتا ہوں۔ پڑھاتا ہوں، بندہ مومن کہتا ہے کہ اطاعت میں بھی دیری نہیں، علم میں کوئی شرم نہیں، اللہ کے بندوں میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں، چل آ میرے ساتھ۔“ چاند کے کندھے پر رکھا ہاتھ جو چاند نے جھٹک دیا۔

”تم جیسے دیر نہیں بہت دیر کر دیتے ہو میری تو اپنی جوانی جا چکی اور کتنی دیر ہوگی۔ خدا کے یہاں دیری نہیں ہوتی۔ اس معاشرے میں بہت دیر ہوگئی، جنم کا اگلا ہی پل بہت دیری کر دیتا ہے۔“

میاں وہیں کھڑا رہا، چاند وہاں سے بھاگ گیا پھر بھی نہ آیا۔ میاں وہاں چاند کو پاش پاش کر گیا۔ اس کے سوراخ ٹھوک گیا، دھڑ دھڑائی دے رہا گیا۔ میاں اسے برباد کر گیا تھا۔ علم سے لاعلمی بھلی، درباروں میں جا جا فقیروں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھا رہتا۔

نورتن نکالنے کو تیار، وہ نکل بھاگنے کو، بہت جمع پونجی تھی اس کے پاس۔ لیکن اب وہ اس سے وہ نہیں خرید سکتا جو میاں کو چاہیے تھا۔ شہروں شہروں حکومتا، کہیں مہینہ نہیں سال نہیں ایک دن۔

اس کے اندر ایسی بچہ بچہ ہوتی کہ اسے ساری دنیا اپنی طرح بنانے کے نظر آنے لگی۔ اسے لگتا کہ کبھی کچھ مانگا نہیں اب مانگا ہے تو آسمان والا ضرور ہی بچہ آسمان سے پکادے گا۔ وہ اس کا باپ بنے گا، ماں بنے گا۔ اس کے دلدار کرے گا۔ بچہ کی خواہش اس میں آن بسی، اب جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

وہ میاں کی مغفرت کا باعث نہیں بن سکا، اس کا بچہ ضرور بنے گا، پارکوں میں بیٹھا بچوں کو دیکھتا رہتا، چند ایک نرسوں کی اس نے منت کی، ایک دو غریب عورتوں سے انہوں نے بات کی، عین وقت پر ایک عورت نے پیسے واپس کر دیے کہ نہیں دینا بچہ۔

انسان کے اتار چڑھاؤ انسان ہی جانے، چاند تو چاند نہ رہا بچے کے اماں ابابن گیا۔ ماں کو یاد کر کے روتا، میاں کو یاد کرتا، اسے معاف کر دیا تھا۔ اپنی معافی کے لیے تڑپتا تھا اب ڈھلتی عمر میں، کیا سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ ڈھلتی عمر میں سوچ کے اتنے در کیوں کھل جاتے ہیں۔ بچھتاوے کیوں جاگنے لگتے ہیں۔ گناہوں کی سمجھ کیوں آنے لگتی ہے۔ ہنسی ٹھٹھول گناہ کیوں لگتے ہیں۔ یہ عموں کا آخر انسانی خاتمہ یہ ایک اختتام کا آغاز یہ اتنی قیامت کیوں لاتا ہے؟

اس کے اندر دونوں سمندر بیک وقت ٹھاٹھیں مارنے لگے، پدرانہ و مادرانہ پل پل وہ پاگل ہونے لگا۔ جیسے بن چاہی دلہن پل پل مرنی ہے، رشید کو لگتا کہ اس کی شادی کو عشرے بیت گئے ہیں۔ اب گود بھرنے کا انتظار اور نہیں ہوتا یا انگارے بھر دیا گود بھر دو، وہ بانجھ پن کا بوجھ اٹھائے سیاہ پڑنی عورت کی طرح باؤلا ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر وں اور حکیموں کے پاس جاتی ہے، یہ مزاروں اور بچہ دینے اور دل لانے والوں کے یہاں جانے لگا، ورنہ کیا تھا کسی بھی اٹھائی گیر کو پیسے دیتا اور کسی کا بھی بچہ اٹھالیتا لیکن وہ ذات کا بے ذات ہو سکتا تھا خصال میں اچھے اثرات باقی تھے۔

بچی ذات وہ رکھ نہیں سکتا تھا پھر اس کی شادی کا مسئلہ ہوتا، لڑکا کوئی دیتا نہیں تھا، ایک بچی کو مفت دے رہی تھی اس نے ہاتھ جوڑ کر انکار کیا، رشید جب چاند بنا تو خوب بنا، اب باپ بنا چاہتا تھا تو خوب تڑپ رہا تھا، اس نے ہر سوانگ بہت دل سے اور جم کر رچایا تھا۔

رشید نے داڑھی رکھ لی تھی۔ سرحد کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی طرف چلا گیا تھا، ہر اس امکان سے دور جہاں اسے پہچان لیا جائے، رات دن محنت ضرور کرتا تھا، اچھے لوگوں میں تھا، اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ جتنے پیسے تھے وہ اس نے امین کے نام بینک میں رکھوا دیے تھے۔ فی الحال وہ ایسے اپنی کمائی ہی کھلا رہا تھا، راستے کی ایک مسجد کے مولوی صاحب سے اس کے کان میں اذان دلوائی تھی اور نام بھی۔ انہوں نے ہی بتایا تھا۔ امین چاند کا چاند تھا اسے بہت پیارا تھا۔

جب امین چلنے لگا تو وہ اسے پانچ وقت مسجد لے جاتا۔ بولنے لگا تو اسے مدرسے کے استاد کے پاس چھوڑ آیا۔ اس گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ مسجد کے ساتھ ہی چھوٹا سا مدرسہ تھا جہاں ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی، رشید امین کو نہ ملتا، کھلاتا اور رات کو اسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا درود سکھا کر سلا دیتا۔ درود کی لوری سناتا، اسی سے اٹھتا، رشید خوش تھا اب اپنی زندگی سے اسے وہ مل گیا تھا جو اس نے کبھی نہیں چاہا تھا اور جب چاہا تو ویسا ہی ہو گیا۔

سب سے دور کرائے کے چھوٹے سے گھر میں وہ دونوں خوش تھے، سوچا کہ آنے والے وقت میں وہ امین کو اس کے ماں باپ بہن بھائیوں سے ملوادیے گا۔ دونوں ملتے رہیں گے، رشید جانتا تھا کہ امین اس سے اتنا پیار کرتا ہے کہ اسے کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ وہ اسے سب سچ سچ بتا دے گا کہ رشید کا ماضی کیا تھا، کہاں رہا اور امین کو کیسے لیا۔ وہ اس کا لے پا لک باپ ضرور تھا لیکن محبت کی ہر حد سے زیادہ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ امین کے دونوں ہاتھ دعا کی صورت اٹھوا کر میاں اور گلابی کے لیے دعا کروانا، امین ایک اچھا بچہ تھا پیارا اور من موہنا۔

☆☆☆☆

گوہر سارہ کو لے کر کینیڈا اپنے والدین کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ بچی بہت خوب صورت تھی۔ اس کے گھر والوں نے اس کے فیصلے کا ٹھکے دل سے خیر مقدم کیا تھا۔ گوہر سارہ سے پہلے سکون آور گولیاں کھاتی تھی۔ اس عادت سے چھٹکارا ملا، نفسیاتی مریض بننے لگی تھی، سارہ اس کی زندگی میں انقلاب لے آئی تھی، کینیڈا میں اس نے اپنا گھر سیٹ کیا، جاب کرنے لگی۔ سارہ کو لے کر گھومتی، رات کو اس کے ساتھ باتیں کرتے کرتے سو جاتی، گوہر کے والدین، بھائی، بہن سب ہی سارہ سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ سب گوہر کی خوشی میں خوش تھے۔ سالوں وہ سب آپس میں ناراض رہے تھے۔ ان سب کے درمیان گوہر کی اپنی مرضی کی شادی نے غلط پیدا کر دی تھی۔ گوہر کو ثاقب کے ساتھ طوفانی محبت ہو گئی تھی، سانس نہیں آیا ہاتھ ثاقب کے بغیر۔ وہ شادی شدہ تھا، کینیڈا میں ہونے والی ایک کانفرنس میں دونوں کی ملاقات ہوئی تھی، گوہر ثاقب کے پیچھے پاکستان تک گئی، اپنے گھر والوں کو ناراض کر کے نہ صرف گئی بلکہ شادی بھی کی۔ اتنے سال اس کے لیے پاکستان میں رہی، ثاقب کو اولاد کی پروا نہیں تھی کیونکہ وہ خود اولاد والا تھا۔ دو بیٹے تھے اس کے۔ گوہر خود ہی علاج کرواتی رہی، امریکا بھی آ گئی تھی۔ اس کام کے لیے ثاقب کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ ایک اچھی کنسرکشن کمپنی کا مالک تھا۔ پیسے کی کمی نہیں تھی، وقت کی بہت کمی تھی۔

چند سالوں میں ہی گوہر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ کئی بار ثاقب سے لڑ کر طلاق کی بات بھی کی۔ پر ایسے موقع پر وہ اپنی شدید محبت کا اظہار کرنے لگتا اور وہ خود کو بے وقوف کہتی جو طلاق کی بات کی، ایک

دوبارہ وہ اس کے ساتھ چلا گیا چیک اپ کے لیے۔ پھر بھی گوہر ماں نہ بن سکی۔ دوبارہ کینیڈا گھروالوں سے ملنے بھی گئی لیکن پھر بھی وہ ناراض ہی رہے۔ انہیں ثاقب پسند نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بہت معصوم ہے لوگوں کی پہچان نہیں رہتی۔ ثاقب کو چھوڑ دے لیکن وہ ثاقب کو نہیں چھوڑ سکی۔ اولاد کے لیے تڑپتی رہی۔ ثاقب اسے بے بی لینے بھی نہیں دیتا تھا۔ سخت خلاف تھا وہ اس سوچ کے کہ کوئی بے بی لیا جائے۔ مشہور یہ تھا کہ وہ خود نازک مزاج ہے اور کسی کا بچہ نہیں رکھ سکتی۔

جاوید نے اسے بے بی دینے کا کہا تو وہ رہ نہ سکی اور خود سے ہی فیصلہ کر لیا۔ ثاقب نے صاف کہا کہ وہ اسے کسی کے بچے کے ساتھ گھر میں نہیں گھسنے دے گا۔ کچھ جاوید کا ڈر اور کچھ ثاقب سے اس کا اختلاف۔ وہ فوراً کینیڈا آگئی ہمیشہ کے لیے۔ سارہ کے لیے اس کے گھر والے خوش تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ثاقب سے طلاق لے لے لیکن یہی ایک فیصلہ وہ نہیں کر پار ہی تھی، سارہ آگئی تو وہ سب کچھ بھول کر اس میں لگ گئی۔

آٹھ ماہ بعد ثاقب اس سے ملنے آیا۔ یہ ٹھیک ہی تھا کہ وہ گوہر سے محبت کرتا تھا۔ اب وہ گوہر سے ملنے سال میں ایک بار آ جاتا۔ گوہر کے لیے یہی کافی تھا۔ سارہ اسکول جانے لگی تھی۔ وہ ابھی بھی سارہ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس پر ایک نظر ڈالتا اور بس، جن دنوں ثاقب آتا گوہر سارہ کو امی ابا کے یہاں چھوڑ دیتی۔ ثاقب شاذ و نادر ہی سارہ کو دیکھ پاتا۔ سارہ سات سال کی ہوئی تو ثاقب اس پر نظر ڈال کر ہٹانا بھول گیا۔

”دھر آؤ۔“ ثابت نے اسے پہلی بار بلایا۔ اپنے پاس بٹھایا۔ باتیں کی اس کے بال سہلانے لگا۔ گالوں پر چٹکی لی۔ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا رہا۔ گوہر بہت خوش ہوئی، سارہ بھی خوش نظر آنے لگی۔ بہت دیر تک نئے نئے پایا سے باتیں کرتی رہی۔ پایا اسے آکس کریم کھلانے لے گئے۔ ثاقب کی سارہ سے یہ ملاقات اتفاق تھی۔ سارہ تھوڑی دیر کے لیے گھر آئی تھی۔ اس کے نانا کو کہیں جانا تھا اور وہ اسے گوہر کے پاس چھوڑ گئے۔ ثاقب کو تو کوئی پسند ہی نہیں کرتا تھا وہ آتا چند ہفتے صرف گوہر کے پاس ہی رہ کر چلا جاتا۔

سارہ کو ثاقب نے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ وہ اسے گھمانے لے جاتا۔ گوہر جاب پر چلی جاتی وہی اسے اسکول چھوڑ دیتا۔ لے بھی آتا۔ سارہ پایا کو پسند کرنے لگی۔ پایا جو اس کا نہیں تھا لیکن بنا ضرور تھا۔ ثاقب کے اس بدلے انداز پر گوہر نے جاب سے ایک ماہ کی چھٹی لے لی اور وہ سب مل کر گھومنے امریکا چلے گئے۔ ثاقب پاکستان واپس چلا گیا۔ چند ماہ میں ہی پھر آ گیا۔ پہلے ثاقب ایک لمبے وقفے کے بعد آتا تھا۔ گوہر چٹنی لے لیتی تھی۔ اب اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا، لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ وہ وقت سے ذرا پہلے آگئی۔ سارہ کو اسکول لینے گئی، پتا چلا ثاقب اسے لے کر جا چکا تھا جبکہ ثاقب نے اسے کہا تھا کہ آج اسے کسی ضروری کام سے جانا تھا۔

وہ گھر آئی، بیل دیتی رہی۔ اگر ثاقب گھر آ چکا تھا سارہ کو لے کر تو وہ گھر لاک کیوں تھا۔ اس نے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ فون نکال کر ثاقب کو فون کیا اس کا فون آف تھا۔ چار بجنے والے تھے۔ اس نے دو گھنٹے دونوں کا انتظار کیا کہ شاید سارہ کو کہیں گھمانے لے گیا ہو۔ گوہر کو تشویش ہوئی وہ فون پر فون کرتی رہی ثاقب کو، اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ ثاقب کا فون چار جنگ نہ ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا ہو۔

انتظار کرتے کرتے تین گھنٹے اور گزر گئے وہ کھانا پکاتی رہی، رات ہونے لگی اس نے پاپا کو کال کی وہ بھاگے آئے۔

”سارہ کو تم نے اس کے ساتھ کیوں جانے دیا؟“ وہ آتے ہی چلانے لگے۔

”وہ اسے اکثر گھمانے لے جاتا ہے پاپا!“

”کیوں جانے دیتی ہو ثاقب کے ساتھ۔ تمہیں کتنی بار منع کیا میں نے۔“ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ انہوں نے بہت بار گوہر کو منع کیا تھا کہ وہ ثاقب کے ساتھ سارہ کو اکیلا نہ چھوڑا کرے۔ ثاقب کے ساتھ رہتے گوہر یہ سب باتیں بھول جاتی تھی۔ اس کی شخصیت کا جادو گوہر کے سر چڑھ کر اسے مدھوش رکھتا تھا۔ وہ اس کی باتوں کے سحر میں ڈوبی رہتی۔ ثاقب سارہ کو پسند کرنے لگا تھا اور گوہر اس پر بہت خوش تھی۔ باقی وہ سب بھول گئی تھی، پاپا نے پہلی فرصت میں پولیس کو فون کیا۔ گوہر حیران رہ گئی۔

”پولیس کیوں پاپا!“ پاپا نے صرف اسے گھورا۔

”مہمیں وہ ہمیشہ اچھا لگا اور مجھے ہمیشہ برا۔ تمہاری آنکھوں پر محبت کی پٹی تھی اور میری پر تجربے کی۔ تم نے کبھی میری نہیں سنی گوہر! سوچا تھا ماں بن کر ضرور سمجھنے لگو گی۔ لیکن جانچ پرکھ والی آنکھ ہی تم نے بند کر رکھی ہے۔“

پولیس آگئی۔ گوہر کا بھائی، بہن اور بہنوئی بھی آگئے۔ دونوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ رات گزرنے لگی۔ گوہر بے ہوش ہو کر اسپتال پہنچ گئی۔ ایئر پورٹ سے کنفرم ہو چکا تھا ثاقب نامی پاکستانی آدمی رات نو بجے کی فلائٹ سے جا چکا تھا، سارہ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ سارہ گم شدہ تھی پولیس ڈھونڈ رہی تھی۔ رات گزر رہی تھی، گوہر بار بار ہوش میں آ کر سارہ کا پوچھ کر بے ہوش ہوتی رہی۔ رات بھر پولیس سارہ کو ڈھونڈتی رہی۔ گوہر کے پاپا بھائی رات بھر دوڑ دھوپ کرتے رہے۔

دن چڑھے شہر سے دور آبادی سے دور ویرانے میں جنگل کی طرف کرائے کی ایک کار کی پچھلی سیٹ پر سارہ نیم مردہ حالت میں ملی۔ کوئی ہوش والا اس کی حالت کو دیکھ کر ہوش میں نہیں رہ سکتا تھا۔ گوہر کی سارہ، نوری کی سارہ، جاوید کا سودا۔

ٹھیک اسی رات پہلی بار وہ گرد نوری کے خواب میں آیا تھا۔ نوری ڈر کر سارے گھر میں بھاگتی پھری، چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا۔

”میرا دل پھٹا جا رہا ہے جاوید۔“ وہ زمین پر لڑھک گئی۔ جاوید کے لیے مشکل ہو گیا اسے سنہالنا۔ کانوں پر ہاتھ رکھے فرش پر پھیلتے اس نے ایک دل خراش چیخ ماری۔ پھر بھاگ کر سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔ ٹیسری سیڑھی سے گر گئی اور منہ سے خون نکلنے لگا۔ جاوید نے رکھ کر دو طمانچے مارے منہ پر۔

”پاگل ہو گئی ہے کیا ہوا؟ کیا موت پڑی ہے کسے دیکھ لیا خواب میں؟“ خواب تو وہ بھول گئی، نہ جانے کیا کیا یاد آ رہا تھا اور یاد بھی نہیں آ رہا تھا۔ جاوید نے اس کا منہ صاف کیا۔ ساتھ لے کر آیا، بیڈ پر سلا یا۔

”نوری! یہ حرکتیں چھوڑ دے مجھے غصہ نہ دلایا کر در نہ گھر سے نکال باہر کر دوں گا۔“ جاوید نے الماری میں سے نکال کر دو نیند کی گولیاں اسے دیں اور لائٹ بجھا کر خود سو گیا۔ نوری ”جانے نہ جانے“

میں حلق سوتی جاگتی رہی۔

جس حمل سے اب نوری تھی اس بچے کے دماغ میں پانی تھا۔ ڈاکٹروں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پیدا ہوا بھی تو نہیں بچے گا اور پیدا ہونے سے پہلے ایک بھی مر سکتا ہے اور دونوں بھی۔ نوری نے جھمپنے تکلیف سے چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھائے رکھا۔ دھرتی ہلائے رکھی۔ پر بچے کو پیٹ میں ہی رکھا۔ ساتویں مہینے دنیا میں آیا۔ اسپتال میں رہا۔ نوری پندرہ دن بعد گھر آگئی اور پورے نو ماہ کا ہو کر بچہ مردہ ہو کر گھر آگیا۔ نوری نے جاوید کا گریبان پلڑا لیا۔

”بچہ دے میرا، بچہ نکال جاوید بچہ چاہیے مجھے۔“ اس کی میت کے پاس وہ یہ کہتی رہی۔ ”نکال میرے بچے دے میرے بچے۔“ اٹھتے بیٹھتے وہ یہ کہنے لگی، ایک دو بار تو جاوید نے برداشت کر لیا، پھر رکھ رکھ کر مارنے لگا، گالیاں دیتا رہتا۔ جب حمل نہیں ٹھہرا تھا تو نوری حزاروں پردے چلاتی، جمعاتوں کی پابند ہوگئی تھی۔ صبح و شام درباروں میں گزارتی، ایک بار پہلے بھی وہ درباروں کی ہوگئی تھی جب اسے جاوید سے شادی کرنی تھی۔ اماں کہا کرتی نوری نماز پڑھ لے نماز پڑھ لے اور وہ دربار جا کر منمت کے نقل پر ہتی رہتی۔ وہ دو بیٹیوں کی ماں تھی، لیکن اب اسے صرف ایک لڑکا اور چاہیے تھا۔ لڑکا اسے اس شدت سے چاہیے تھا جیسے وہ صدائے بے اولاد ہے، بانجھ ہے اولاد والی ہوئی ہی نہیں۔ ماں بننے کا مزہ چکھا ہی نہیں۔ ابا کے مرنے کے بعد اسے لڑکی ذات سے نفرت ہوگئی۔ اس رات وہ گھر آ کر سو نہیں سکی تھی۔ پہلی بار بہت واضح خلل آیا تھا اس کی ذات میں۔ اس کی اماں نے کس دھڑلے سے اس کی ٹوٹی کھول دی تھی۔ نوری کو بد دعا لگ گئی تھی کس کی؟ کس کس کی نہیں لگی ہوگی۔ ابا کی قبر میں پہلی رات اس کی اپنی پہلی رات بن گئی۔ اس کا حساب کتاب شروع ہو گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ ایسی کپکپاہٹ جو نظر نہیں آتی، جو ہستی بھی نہیں۔ اس نے ڈھیروں ڈھیر چیزیں منگوا کر بچوں میں بانٹنی شروع کر دیں۔ گاؤں میں جس جس کا جب کبھی دل پریشان ہوتا وہ یہی کرتا۔ نوری کا دل پھر بھی ویسا ہی رہا۔ اسکول سے گڑیا مانو آ جاتیں، انہیں سلا کر وہ دربار آ جاتی۔ جاوید فون کرتا۔ ”گھر آنا ہے کہ نہیں؟“ وہ دیکھتی رات ہوگئی۔ کتنی اذانیں، جماعتیں کھڑی ہو چکیں اور وہ ہیں ایک طرف کی ایک طرف بیٹھی رہی۔ وہ دعا کرتی کہ وہ منحوس بچہ امر جائے۔ اس کی جان لے کر ہی تلے گا کیا۔ بدھائی میری بدھائی۔ بتا کے کھلائی میری بدھائی؟ کون کھا گیا میری بدھائی۔

ایک دن سڑک کے پاس بیٹھے فقیر کے کالے سکول میں اس نے چند سکے اور پیسے ڈالے۔ دو ہی قدم چلی تھی کہ سکے کو اس نے اپنے پیروں کے پاس آتے دیکھا۔ سکے کی کھنک کی آواز اتنی گونج دار تھی نوری رک گئی۔۔۔ پلٹی۔۔۔ کبھی کسی نے کہا تھا کہ جو پلٹتا ہے پتھر کا بن جاتا ہے۔ ٹھیک کہا تھا، قیامت اور حشر کا پتھر ہو جاتا جب پاؤں زمین میں ہی دھسنے رہیں گے اور دل دہل کر پھل جائیں گے۔ جب ارواح بین کریں گی۔ آہ وہ بکا کریں گی اور کہیں گی ”یہ کیا کیا تو نے ہمارے ساتھ، ہمیں رسوا کیوں کیا؟“ فقیر سکول کو سڑک پر الٹ چکا تھا۔ اس نے فقیر کی طرف دیکھا اور فقیر نے اس کی طرف۔۔۔ اور بس۔۔۔ اور نوری کی روح کی آہ وہ بکا شروع ہوگئی۔ ”کیوں لے ڈوئی مجھے یہ کیا کر دیا میری لگا میں نفس کے ہاتھ میں دے دیں۔ انے نوری تجھے خدا پوچھے۔“ نوری بے نور ہوگئی۔ سکے کی گونج سے اس کے کان پھٹنے کے قریب ہو گئے۔ اس کی سائیں اندر جا کر گرم ہو رہی تھیں۔ باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا انہیں،

سکے اور پیسے سرک پر بکھرے ہوئے تھے۔ لوگ آچار بے تھے۔ پوں پاں کرتی گاڑیاں، رکشے، بسیں گزر رہی تھیں۔ وہاں کھڑی ایک ذات جامد اور ساکت تھی۔ ”نوری“ فقیر کشکول کو خالی کیے بیٹھا تھا۔۔۔ اس کا کشکول کہہ رہا تھا ”ہونہہ“ فقیر اس کشکول کو تھامے بیٹھا تھا اور نوری کو دھتکار چکا تھا۔

”کن کے لیے دیے چلانے آئی ہو۔۔۔ کیا چاہیے اب۔۔۔ یہ جو کشکول انسانوں نے تھام رکھے ہیں ناپہ بھی نہیں بھرتے کبھی نہیں۔۔۔ بچے بچ کھائی ہو۔ ایمان بھی بچ کھاؤ گی۔۔۔ اپنی کھال کے اندر کا سودا کر ہی بیٹھی ہونا توبہ کرنے نہیں آتی اور، اور مانگنے آ جاتی ہو اور کتنا چاہیے کب تک چاہیے۔ اے انسان تُو انسان کب بنے گا۔ انسان نہیں بننا توبہ لگام نفس پرورد بھی نہ بن۔ تجھے بھوک دیتی ہو۔ آ میرے ساتھ تُو بھی بیٹھ جا۔ کورا پڑ لے۔ صدائیں لگا، معتبر رہے گی، بچی رہے گی، صدالگا کر مانگ، التجا سے مانگ چل آ بیٹھ جا میرے ساتھ۔“

ایک رشید والا، ایک بیگم گوہر کا، ایک بیگم کی سہیلی کا، ایک وکیل عورت کا، اس نے سب کے ناموں کے سکے پیسے بار بار چنے اپنے بٹوے میں رکھے، رکشالیا اور گھر آگئی۔ وہ سکے اور پیسے لا کر اس نے جاوید کے منہ پر دے مارے۔ ”میری تیری کمائی“ وہ دھاڑی۔

”کمینی۔“ وہ اس کی طرف لپکا۔

”سودے باز۔“ وہ اس سے زیادہ چیخنی اور گالیاں دیتی رہی۔ نوری کے دن پورے ہو رہے تھے۔ اسے پیٹ کے وہ دن یاد آ رہے تھے جن میں بچے آ کر ٹھہرے تھے۔ اس کے جسم میں ہر ہر بچے کا لمس جاگنے لگا۔ اس پر ہر بچے کی ابتدا ہونے لگی، منہ کے راستے وہ بہت کچھ پیٹ میں ڈال چکی تھی جو کوکھ میں پلے تھے انہی کی وجہ سے پیٹ بھرا تھا۔ انسان کی ازلی بھوک جو کبھی ختم نہیں ہوتی، شیطان کے ہاتھوں سارا ایمان بچ کر رہی۔ اب یہ بھوک کوکھ میں اٹھنے لگی تھی۔ ایک در بند ہونا تو دوسرا منہ کھول لیتا۔ ایسے ہی ایک بھوک ختم ہوئی تو دوسری بے دار ہونے لگی۔ نوری عورت سے بیوی سے انسان سے ماں بننے لگی۔ اب اسے اجنبی زبانیں سنائی دیتیں۔ وہ جو اس کے چار بچوں کی تھیں۔ اجنبی زبانوں میں اسے خواب آتے۔ اجنبی لوگ اسے نہ جانے کیا کیا کہتے رہتے۔ جانے کہاں کی مخلوق تھی جو آتی اور اسے دھتکار کر سنا کر چلی جاگی۔ نوری نوری نہ رہی وہ ماں بننے لگی۔

اس دن پہلی بار۔ جاوید سفید ماربل کے فرش پر رکھے اسی ہزار کے ڈریسنگ ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھا روٹ کھا رہا تھا۔ بونی بونی توڑ رہا تھا، نوری نے اپنا بچہ مارا اور اس کے دانتوں میں دبلی ہوئی بونی بچنے کر باہر نکالی۔ جاوید، گڑیا، مانو تینوں بیک وقت ڈر کر اسے دیکھنے لگے۔ اس نے اپنی انگلیاں اس کے منہ میں گھسا دیں۔ ”نکال میرے بچے۔۔۔ میرے بچے نکال۔ نکال انہیں باہر۔“

کرسی گری۔۔۔ ٹیبل پر رکھے سب برتن گر گئے، جاوید نے اس کو دھکا دے کر خود سے الگ کیا۔ اس وقت تک وہ اچھی طرح اس کا منہ کھج چکی تھی۔ اس کے منہ میں سے خون نکلنے لگا۔

”اماں!“ گڑیا اس کی طرف لپکی۔ مانو ڈر کر رونے لگی اور اس کی طرف آنے لگی تو سالن سے پھسل کر گر گئی۔ سرفرش پر زور سے لگا۔ جاوید نے لپک کر مانو کو اٹھایا۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑے تھے۔ اسے صوفے پر لٹایا، پانی پلایا۔ نوری پلے فرش پر اپنا سر مار رہی تھی۔ خون نکل کر بہہ رہا تھا وہ دیوانی ہو گئی

تھی۔

”مجھے میرے بچے چاہئیں۔ مجھے میرے بچے دیے دے۔“

جاوید لپک کر اس کی طرف آیا۔ گڑیا الگ رو رہی تھی۔ بہت خون نکل رہا تھا۔ جاوید نے اسے قابو کرنا چاہا۔

”مجھ پر رحم کر۔“ وہ جلا نے لگی۔ ”میرے یہاں، یہاں، یہاں وہ ہیں۔“ اس نے نہ جانے کہاں کہاں اشارے کرنے شروع کر دیے۔ جاوید بے شکل اسے اٹھا کر کمرے میں لایا۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے انجکشن لگایا تو وہ سو گئی۔ لیکن وہ نہیں سوئی۔ وہ آنکھیں جو کسی کی تھیں لیکن اس کے وجود میں آگئی تھیں وہ کروڑوں دھڑکنیں، لامحدود سانس جو اس کی نہیں تھیں لیکن اسی میں تھیں اسے چین نہیں لینے دے رہی تھیں۔ نیند تو سکون والوں کو آتی ہے۔ اسے اب نیند کیسے آتی؟

ایسے دورے اسے آنے دن پڑنے لگے۔ جاوید فیکٹری اور اسٹور میں لگا رہتا۔ اس کے پاس اب وقت نہیں ہوتا تھا، وہ دیواروں سے ٹکریں مارتی، بھوکی پیاسی کسی کو نے میں بڑی رہتی۔ گڑیا گیارہ سال کی ہو چکی تھی۔ اتنی بڑی تو نہیں تھی پھر بھی تھوڑا بہت گھر کا خیال رکھ لیتی تھی۔ گھر میں دو کل وقتی ملازم بھی آگئے تھے۔ وہ اپنی لوٹ کھسوٹ میں لگے رہتے۔ جاوید آکر اسے باتیں بنا کر چلا جاتا۔

”میں دوسری شادی کر لوں گا نوری!“ ایک دن دھکی دینے لگا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے کھڑے اس نے اجڑی آنکھوں سے جاوید کو دیکھا۔ ”نئی فیکٹری لگانے لگا ہے۔“ نوری نے دانت کچکچائے۔ جاوید نے اٹلے ہاتھ کا ایک چائنا لگایا۔

”کس چیز کے طعنے دیتی ہے مجھے تو بھی میرے ساتھ تھی۔“

”وہی تو۔۔۔“

”اتنے بڑے بڑے گھروں میں گئے ہیں سب عیش کرتے ہوں گے۔“

”گھر تو یہ بھی بڑا ہے۔“

”یہ گھر اب بڑا ہوا ہے۔ تو سمجھتی کیوں نہیں۔“

”سمجھنے لگی ہوں اب۔“

”دماغ سے یہ خناس نکال، جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہے، گھر سنبھال، بچوں کا خیال کر۔ نوکروں پر گھر چھوڑ رکھا ہے سب پاگل کہتے ہیں تجھے۔“

”میں سمجھی کچھ اور کہتے ہوں گے۔“ مدہوش سوگوار سا انداز۔

”بچوں کا خیال کر نوری!“ جاوید اس کے قریب آیا۔

”کس کس بچے کا؟“ نوری کی آنکھیں اور ویران ہو گئیں۔ وجود میں دھڑکتی سب کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

”اپنی حالت بدل لے آخری بار کہہ رہا ہوں۔ دوسری ملنے میں مجھے دیر نہیں لگے گی اپنا گھر برباد نہ کر۔“

”بربادی کی اب کسے پڑی ہے۔“

”تو کیسی باتیں کرتی ہے۔“ وہ ہنسنے لگا کیونکہ وہ ہمیشہ سے سیدھا سادہ رہا تھا۔ اس لیے نوری

والی سوچ میں نہیں پڑا تھا۔ گھاک ہوا کاروبار کے لیے عیار ہوا، پیسے کے لیے مکار بنا، پیٹ کے لیے وہ سیدھا ہی رہا نہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر بیٹھتا نہ کبھی بے چین و بے قرار ہوا۔ کمانا، کھانا اور سو جاتا۔ گالیاں دیتا بھول جاتا۔ گالیاں سنتا وہ بھی بھول جاتا۔ پیسے گنتا تھا یا درکھتا تھا۔ خرچ کر کے بھول جاتا تھا۔ سیدھا سادا ہی تھا دکانوں پر بیٹھنے والے، کتنا مال گیا یا نہیں رکھتے کتنا مال بنایا یا درکھتے ہیں۔ رات گئے وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ بس ابھی آنکھ لگی تھی اس کی تو جاوید الماری کھنگال رہا تھا۔ بہت جلدی میں تھا۔

”نوری اٹھ جلدی کر تھوڑا سا مان رکھ جلدی اٹھ۔“ اسے اٹھتے دیکھ کر وہ اپنے کام کرتا جلدی جلدی بولا وہ اٹھ بیٹھی۔

”یہ بیگ پکڑ کر تھوڑے سے کپڑے رکھ لے، گڑیا کو اٹھا جا کر تیری مدد کروائے۔“
 ”کیا ہوا؟“ اس نے جاوید سے بھی پوچھا اور خود سے بھی کہ کیا ہوا تھا کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔
 ”جو کہا وہ کراٹھ بس تھوڑے دنوں کے لیے شہر سے باہر جانا ہے۔“ وہ نہیں اٹھی، جاوید کی طرف دیکھنے لگی۔

”اٹھ جا نوری!“ وہ پھر چلایا۔

”کون مرا ہے؟“ اس کے انداز پر جاوید اپنے کام سے ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔
 ”کوئی نہیں۔“

پٹ پٹ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ کیا خبر کیوں لیکن گرنے لگے۔ ترس آمیز نظروں سے جاوید نے اسے دیکھا، اس کے آنسو صاف کیے۔

”نوری! تجھے کیسے پتا چلا؟“ جاوید نری سے پوچھنے لگا۔

”کیا؟“ نوری کا ”کیا“ اتنا درد انگیز تھا کہ جاوید نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”کہ کوئی مر گیا۔“ وہ بولا۔

”کیا کوئی مر گیا؟“

”وکیل۔۔۔ اس کے گھر فائرنگ ہوئی ہے۔ نیگم فاخرہ۔۔۔“

”جو ہمارا بچہ لے گئی تھی نا۔۔۔ اسی کے گھر نا؟“ نوری ایسے پوچھ رہی تھی جیسے دکان دار سے کپڑے کی قیمت پوچھ رہی ہو۔ نوری خاموش بیٹھی رہی پھر بنا دوپٹے اور جونی کے گھر سے باہر بھاگی۔ رات تین بجے کا وقت تھا۔ وہ باہر کا دروازہ کھول کر سڑک پر نکل آئی۔ تیز تیز بھاگنے لگی، پیچھے ہی جاوید تھا۔ اس کے پیچھے آوازیں دیتا بھاگ رہا تھا لیکن وہ بڑی سڑک پر بھاگتی رہی۔ آنسو نکل نکل کر زمین پر گرتے رہے۔ جاوید نے اسے پیچھے سے چالیا۔

”نوری! خدا کے لیے مجھ پر رحم کر۔“

”خدا کے لیے مجھ پر رحم کر۔“ نوری سنسان سڑک پر چلنے لگی۔ ”چھوڑ مجھے۔ جانے دے وہاں

مجھے۔ میں جاؤں گی وہاں۔“ سنسان سڑک پر نوری کی آہ و بکا گونجنے لگی۔

”چل میرے ساتھ وہاں۔“ جاوید مان گیا۔ گڈو نے جاوید کو فون کر کے کہا تھا کہ وہ وہاں سے فی الحال چلا جائے، ہو سکتا ہے اس کے دشمن نے فیکٹری مالکان پر بھی غصہ نکالیں۔ یہ وہ لوگ بھی ہو سکتے تھے

جن سے ان دونوں نے قبضہ لیا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ منظر سے غائب ہو جانا ہی ٹھیک تھا۔ ارادہ بدل کر جاوید نے گڈو کو فون کیا اور اسے سب بتایا اور جاوید نوری کو ساتھ لے کر ڈنٹیس میں واقع اس کی کونٹی لے آیا۔ فارخہ کے گھر آدھے گھنٹے تک فائرنگ ہوتی رہی تھی۔ گھر چھلنی پڑا تھا۔ پولیس کی نفری موجود تھی۔ گھریل تھا۔ چوکیدار کی، کل وقتی ملازم کی، گھر کی مالکن کی اور مالکن کے گود کی بچی کی ہلاکت ہو چکی تھی۔ لاشیں اٹھائی جا چکی تھیں۔ وہ دونوں اسپتال آ گئے۔ وہاں چوکیدار اور ملازم کے خاندان کا مجمع اکٹھا تھا۔ عورت کی طرف سے کوئی نہیں تھا اور بچی کی ماں نوری بچی تھی وہاں۔ چوکیدار کے بیوی بچے رو رہے تھے، ملازم کی ماں بہنیں بین کر رہی تھیں اور نوری۔۔۔ وہ جاوید کے گلے سے جھول گئی۔

”ایک کا جنازہ تیار ہو گیا۔“ اس کی آواز وہاں موجود ہر زندہ اور مردہ وجود کو پار کر کے گئی۔ ”میری بچی میت بن گئی، ہم نے اسے مار دیا، ہم قاتل ہیں اس کے۔“ نوری گری اور بے ہوش ہو گئی۔

بچے کی حوالگی کے قانونی کاغذات پولیس کو دیکھائے اور جاوید بچے کا مردہ جسم لے کر گھر آ گیا۔ جسم ڈبے میں سیل بند تھا جسے کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسی لاشیں جو بری طرح مسخ ہو چکی ہوں انہیں ایسے ہی سیل بند کر کے دیا جاتا ہے۔ نوری تابوت سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ نوری اس بچی نیلم کی ماں اپنے گناہ کو کوس رہی تھی پر اب دیر ہو چکی تھی۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ فیکٹری کا مالک ابھی بھی جاوید ہی تھا۔ فائرنگ والے وہی لوگ تھے جو اس عورت کے خاندانی دشمن تھے۔ ماضی سے چلتی آ رہی تھی دشمنی۔ ساری جائیدادیں چھین لی تھیں، جائیں چھین لی تھیں۔ بھائی اسی ڈر سے بھاگ گیا تھا۔ جاوید اور گڈو نے فیکٹری پر قبضہ کیا تو ان کا پرانا غصہ اٹھ آیا۔ جائیدادیں انہیں بہت تھیں ایک عورت کا یہ منہ توڑ جواب انہیں اچھا نہیں لگا۔ باقی معاملہ بھی گڈو نے ہی سنبھالا۔ بالا ہی بالا ان سے معاملات طے کیے۔ ان دونوں کی ذاتی دشمنی تو تھی نہیں، بات صاف کی کہ عورت سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ دشمنی چلتی بنی ہاں فیکٹری ہاتھ سے نکل گئی۔

جاوید ایک عرصہ بیچ و تاب کھاتا رہا۔ اتنا گھائے کا سودا، نہ بچی نہ فیکٹری۔ وہ اور گڈو اب مل کر ایسی ہی دوسری فیکٹری لگا رہے تھے۔ اتنے پیسے تھے اب ان کے پاس، فیکٹری نے ان دو سالوں میں انہیں خوب منافع دیا تھا۔ جاوید پھر سے اپنی جمع تفریق میں لگ گیا۔ بچی تفریق ہو گئی۔ قلم اٹھا کر اس نے دیوالیے کے خانے میں بھی نیلم کا نام نہ لکھا۔

نیلم انسانوں سے مردوں میں شامل ہو گئی۔ صرف آدھ گھنٹہ نیلم کا تابوت نوری کے پاس رہا۔ صرف آدھ گھنٹہ وہ اس کے پاس رہی۔ نوری، نوری نہ رہی۔

وہ گاؤں بھاگی۔۔۔ رورو کر اس نے سارا گاؤں اکٹھا کر لیا، نہ وہ اس گھر سے نکلتی۔ نہ اس کی بچی مرنے۔ اس کی حالت پر گاؤں کی عورتیں جو اپنی چھتوں کے ساتھ لگی دیواروں پر کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں بلبلاتھیں۔ بھابھیوں نے بڑھ بڑھ کر سینے سے لگایا۔

”ماں میں اپنے بچے کھا گئی۔“ وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔
”سب کھا گئی۔ مال سمجھ کر کھا گئی، خون پی گئی۔“

بھائی سینے میں چھپائے بیٹھے رہے۔ لیکن اب اسے چین نہیں مل رہا تھا۔ اب اسے چین نہیں ملتا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ بھابھیاں ہاتھ پاؤں دبائے لگیں۔ وہ ایسی ہی گاؤں آ گئی تھی۔ منہ

اندھیرے ہی نکل آئی تھی۔ جب وہ بھجوا آیا تھا تب وہ تالی بجا رہا تھا۔ ٹھکے لگا رہا تھا۔ ناچ رہا تھا، گارہا تھا، نوری اونوری کر رہا تھا۔

”آچل کے بدھائیاں لے، آناچ لے گا لے خوشی منا۔“

اماں کے گلے سے لگ کر اس نے ایک ایک بات بتادی۔ اماں پھونکیں مارتی رہیں۔ حاجن بی کو بلوایا انہیں سب بتایا۔ نوری نے صاف صاف بتایا کہ وہ راضی بہ رضا تھی بچے بیچنے میں۔ اسے معصوم نہ سمجھو اسے بے گناہ انجان بھولا نہ سمجھو۔ وہ سب سودے جانتی تھی۔ وہ ہر سودے میں شریک تھی۔ وہ ماں کبھی نہیں بنی، وہ انسان بھی کبھی نہیں بنی۔ وہ گوشت کے لوٹھڑے سونے کے بھاؤ نیچتی رہی وہ سارے حساب کتاب کرنے والی تھی۔

اماں حاجن بی سن روتی رہیں کوئی اور ہوتا تو ضرور بار بار کانوں کو ہاتھ لگاتا، لعن طعن کرتا، تھوک دیتا۔ ماں بھی صبر کر کے بیٹھی رہی، توبہ استغفار کرتی رہیں۔

”مجھے معافی دے اماں!“ اماں نے بڑھ کر پیشانی چومی۔

”معافی دلوادے اماں!“ اس پر اماں خود ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئی۔ چھوٹی انگلی میں تسبیح تھی۔ وہ آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ”دعا کرو ان سب کے لیے وہ سب خوش رہیں۔“ حاجن بی نے کہا۔

”اولاد بنا کر لے کر گئے ہیں انہیں اولاد ہی بنا کر رکھیں گے۔“

چند دن گاؤں رہ کر نوری واپس آ گئی۔ گڑیا اور مانو پر توجہ کرنے لگی جو اس کے پاس تھیں۔ ان کا اسے خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اس کی ذات میں بدلاؤ آیا، ساتھ کرب اور تکلیف ہی لایا بس۔

☆☆☆☆

نیم مردہ حالت میں سارہ کو اسپتال لایا گیا تھا اور گوہر کو زبردستی اس کا بھائی گھر لے گیا تھا تا کہ وہ سارہ کو نہ دیکھ لے۔ گوہر کو ہسپتالی دورے پڑنے لگے۔ اس کی لاڈلی کے ساتھ یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ ثاقب نکل چکا تھا اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ یہ سب اسی شیطان کا کیا تھا، وہی شیطان جس سے اس کا باپ بار بار اسے خبردار کرتا رہا تھا۔ بچے والدین کے ہر تجربے کو جھٹلا کر اپنا تجربہ خود کرنا چاہتے ہیں۔ گوہر جیسی ضدی لڑکی نے اپنے خاندان کی ”نا“ کے باوجود ثاقب سے شادی کی۔ اتنے سال اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اسے پہچان نہ سکی۔ ٹھیک کہا تھا کسی نے کہ خوب صورتی کے پتلے کو وہ ساتھ رکھنے کے لیے لایا ہے بیوی اور ماں وہ پہلی بیوی کو بنا چکا ہے۔ وہ بس ماڈل بنی اس کے پہلو سے لگی رہے، دونوں مرد و عورت کا کھیل کھیلتے رہے۔ بس۔

وہ فوراً پاکستان آ کر اسے پکڑا نا چاہتی تھی، اس نے ایسا کیوں کیا، سوچا بھی کیسے۔ نام کی ہی سہی بیٹی تھی اس کی، واقعی گوہر بہت بھولی تھی۔ اس کی ماں نے تاسف سے اسے دیکھا ”یہاں سکے باپ پیچھے نہیں اور گوہر کو یہ دکھ کھائے جارہا تھا کہ ثاقب تو اس کا پاپا بن چکا تھا۔ پاپا بن جانے اور پاپا ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے، یہ فرق ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ فرق انسان مٹاتے ہیں شیطان نہیں۔“

ثاقب دو بیٹوں کا باپ تھا، بیٹی کا نہیں۔ خود سے بارہ سال چھوٹی لڑکی کا شوہر تھا۔ نہ جانے اپنے غیر ملکی دوروں پر کیا کیا کرتا ہوگا۔ گوہر نے زندگی میں ایک بار بھی یہ نہیں سوچا کہ اس کی فیملی آخر کیوں ثاقب کو پسند نہیں کرتی۔ صرف اس کا شادی شدہ ہونا ہی مسئلہ نہیں تھا۔ پہلی بار جب پاپا اس سے ملے تو

انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اس سے شادی کرنے کا سوچے بھی نہیں۔ آخر میں وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے ”اگر وہ برائے نہیں ہے تو اچھا بھی یقیناً نہیں ہے، ثبوت تو نہیں ہے میرے پاس ہاں چھٹی حس ضرور ہے۔“

چھٹی حس کس زمرے میں آتی ہے؟ محبت کے زمرے میں تو بالکل بھی نہیں۔ گو ہر اس کی محبت میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اب اس کی نفرت میں پاگل ہو رہی تھی۔ اتنے سال اس کے ساتھ رہتے اسے جان نہیں سکی۔ یہاں گو ہر ٹھیک تھی عشرے گزار کر انسان خود کو نہیں جان سکتا کسی کو کیا جانے گا۔

سب نے گو ہر کو سمجھایا کہ اب سارہ کو اس کی ضرورت ہے، پاکستان جیسے ملک میں جہاں ہزاروں ایسے واقعات ہوتے ہیں اور کوئی سنوائی نہیں وہاں وہ طاقت کو لکھے سزا دلوائے گی۔ وقت ہی ضائع ہوگا اور یہ وقت اب صرف سارہ کو چاہیے گو ہر سارہ کو دیکھ دیکھ کر رو رہی تھی، وہ زندہ بچ گئی تھی لیکن اب وہ صرف سارہ نہیں رہی تھی۔

جس کی چیخوں سے سناٹا مگوں خٹھا ہوا اب اس کی مسکراہٹوں سے زندگی کیسے مچکے گی۔

گو ہر نے اتنا ضرور کیا کہ پایا کے ساتھ ایک آخری بار پاکستان گئی۔ اس کی پہلی بیوی، دونوں بیٹوں کے سامنے ثاقب کا پول کھول کر رکھی۔ ثاقب نے صاف انکار کر دیا لٹا دھمکیاں دیتا رہا لیکن اسکول سے سارہ کو لے جاتے اسے بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا اور پھر خود سارہ کا بیان۔

ثاقب نے گو ہر کو طلاق دے دی۔ وہ اسے بیوی بنا کر رکھنا نہیں چاہتا تھا جو اپنے شریف شوہر پر کچھ اچھا نہیں رہی تھی۔ گو ہر ثاقب کی دی پر اپنی اس کے منہ پر مار آئی۔
دونوں میں سب کچھ شروع ہو کر ختم ہو چکا تھا اور سارہ۔۔۔؟ اس کی زندگی پر اتنے سوالیہ نشان لگ چکے تھے کہ انہیں مٹانے کے لیے کئی زندگیاں چاہیے تھیں پر یہ سوال نہیں منٹے بلکہ اور سے اور بننے چلے جاتے۔

☆☆☆☆

امین بڑا ہونے لگا تو رشید بیمار ہونے لگا۔ مسافروں کے اڈے پر چائے کے ایک ہوٹل میں کام کرتا تھا وہ قریب ہی گھر تھا در سے سے آنے کے بعد امین کو بھی وہیں اپنے ساتھ لے آتا، امین ایک طرف بیٹھا پڑھتا رہتا، کام کرتا تو اور بیمار ہو جاتا۔ کام بھی نہ ہوتا ہر وقت پیٹ میں ایک طرف درد اٹھتا رہتا۔ زیادہ بیمار ہو گیا تو کام سے بھی گیا۔ بہت عرصہ اسی حالت میں رہا جلد کارنگ سیاہ بڑنے لگا تو اسے تشویش ہوئی۔ درد ناقابل برداشت ہو گیا۔ اپنی جان کی تو اسے رتی بھر بھی پروا نہیں تھی فکر اب امین کی تھی۔ وہ سات سال کا ہونے والا تھا۔ اب رشید کو فکر لگ گئی۔

رشید شہر آ گیا۔ سرکاری اسپتال سے ٹیسٹ کروائے، چاند جو دیسی شرابیں، چرس، گانجا پیتا تھا ان سب کی رپورٹس آئی تھیں۔ اس کے گردے تفریباً ناکارہ ہو چکے تھے۔ اب اسے گردے واش کروانے آنا پڑے گا۔ زندگی سکڑ سٹ کر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ نظر آنے لگا تھا ناکارہ گردوں کے ساتھ اس کے پاس منتی زندگی رہ گئی ہے۔ کسی ایک وقت کا کیا عمل کسی دوسرے وقت میں رد عمل دکھاتا ہے تو بال نوچ لینے کا جی چاہتا ہے۔ جس وقت چاند مر جانے کے لیے تیار تھا مایاں کی توبہ کے لیے اپنی شناخت کے لیے اس وقت جسم ہٹا کٹا رہا۔ اب اسے امین کے ساتھ رہنا تھا تو قبر کی مٹی یاد کرنے لگی تھی۔

اس سے ایک بڑی غلطی ہو گئی، وہ تو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ امین کو کسی وقت اس کے ماں باپ سے

ملوئے گا لیکن ان کا اتنا پتا نہیں رکھا تھا۔ جس وقت امین اس کی گود میں آیا تھا اس وقت وہ سب کچھ فراموش کیے بیٹھا تھا۔ اس نے جلد سے جلد وہ شہر چھوڑنے کی سوچی۔ جاوید اور اس کے درمیان یہی طے ہوا تھا پھر وہاں اس علاقے میں لوگ ان دونوں کو جانتے تھے۔ امین کو لے کر وہ سب کچھ بھلا دینا چاہتا تھا لیکن سب بھلا کر اس نے ٹھیک نہیں کیا، امین اسے ملا اور اب اس کے ساتھ تھا لیکن وہ خود امین کے ساتھ کب تک تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ اب وہ یہ سوچ سوچ کر دہل رہا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو امین کہاں جائے گا۔ امین کا کیا ہوگا؟ اس نے امین کو لیتے وقت اپنی موت کا نہیں سوچا تھا۔ دراصل سوچتا تو کوئی بھی نہیں، وہ بھی وہی بشر تھا موت سے بے خبر، لا پرواہ۔ وہ کیسے سوچ لیتا لیکن اب سوچ رہا تھا اسے اب موت سر پر کھڑی نظر آ رہی تھی۔ ہر چیز کا اختتام نظر آ رہا تھا۔ سب کچھ جاتا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ آتا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

امین کی پیاری صورت دیکھتا تو افسوس کرتا کیا ضرورت تھی اسے لینے کی۔ اس نے بھی اپنے باپ والی ہی حرکت کی تھی۔ ”پاکر چھوڑ دینے والی۔“ امین کی محبت میں پچھتا رہا تھا اب۔ اب کون تھا جسے امین کا خیال رکھنے کے لیے کہتا۔ چند ہفتے پہلے ہی وہ اس جگہ سے ہو کر آیا تھا جہاں سے اس نے امین کو لیا تھا۔ وہاں ان کا کوئی نشان نہیں تھا۔ جاوید اور کہاں ملتا؟ کس کے پاس جاتا کہ اس کی مدد کرے وہ ایک مسئلے میں نہیں روگ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ امین کے پیار میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس کی جان بلکان ہو رہی تھی۔ امین کا سوچ سوچ کر، کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ رشید کو اندھیرا ہی گہرا ہوتا دکھائی دینے لگا۔

اسے سرحدی گاؤں چھوڑ کر پنجاب آنا پڑا، جہاں سے وہ گیا تھا، جہاں سے وہ بھاگا تھا۔ بہت سکون میں تھا وہ گاؤں میں، اب پھر اسی گند کے قریب آ گیا تھا۔

لاہور کی ایک غریب آبادی میں اس نے کرائے کا ایک گھر لیا۔ یہاں سے وہ سرکاری اسپتال سے مفت علاج کروا سکتا تھا۔ آتا جاتا بھی آسان تھا اس کے لیے۔ اب وہ اتنا چاہتا تھا کہ کسی طرح چند سال اور زندگی میں گھسیٹ لائے تاکہ امین تھوڑا سا اور سمجھ دار ہو جائے۔

امین سرحدی گاؤں کے سادہ سے لوگوں میں رہتے بھولا بھالا سا ہی تھا۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہوٹل پر سب کا لاڈ لہا تھا۔ اجنبی لوگوں کو دیکھ کر ڈر جاتا تھا۔ رشید سے چپک جاتا تھا، رشید کے کانوں میں آ کر سرگوشیاں کرتا۔ وہ اتنا پیارا صابریچ تھا کہ چند دنوں کا ہی تھا تب بھی گلا پھاڑ کر نہیں روتا تھا۔ اس نے رشید کو اتنی آسانیاں دیں کہ رشید نے اسے آسانی سے بڑا کر لیا۔ وہ رشید کی لوری ”اللہ، اللہ“ پر آنکھیں موند لیتا اور آنکھ کھلنے پر چپ پڑا رہتا، وہ رشید کے لیے ایک تھنہ تھا جو نہ جانے اسے اپنی یا کسی کی دعا کے ثمر میں ملا تھا۔

رشید اسے خوب پیار کرتا۔ ابھی اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ اسے حالات کے بارے میں بتائے۔ وہ سن لے گا لیکن سمجھے گا نہیں۔ وہ امین کا بابا جی تھا اور بابا جی کی وہ جان تھا۔

اب اسے علاج بھی کروانا تھا، جاوید کو بھی ڈھونڈنا تھا اور امین کا خیال بھی کرتا تھا۔ اس نے امین کو ایک مدرسے نما اسکول میں داخل کروا دیا جہاں وہ شام تک رہ سکتا تھا۔ شام تک جاوید کا اتنا پتا تلاش کرتا قریب کے چھوٹے شہروں میں جاتا۔ وہ خود بھی مایوس ہی تھا لیکن کوشش کیے جا رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ منہ چھپا کر رات گئے اپنے پرانے ٹھکانے پر گیا۔ اسی بازار جہاں کی وہ دھول تھا۔ وہاں اس کا ایک دوست تھا ”جو بی“، کل پرزہ تھا ہر مسئلے میں فٹ ہو جاتا تھا۔ رشید نے اسے اپنا مسئلہ بتایا، ساری بات بتادی۔

رشید کا دل پریشان ہو رہا تھا، امین کو گھر سلا آیا تھا پر اس کا دھیان اس میں لگا تھا۔ وہ بچہ کبھی اکیلا نہیں سویا تھا۔ دن کے وقت وہ یہاں آتا نہیں چاہتا تھا۔ سولوگ پہچان لیتے۔ اب سوچ رہا تھا کہ وہ کس سودے کے لیے رات کو آیا ہے۔ راتیں گناہی دن ہی بھلے۔ جو بی اپنی ہانک رہا تھا رشید اپنی سوچ رہا تھا۔ اب وہ منحوس مارا جو بی نشے میں آتا جا رہا تھا، سر ہلارہا تھا، وعدہ نہیں کر رہا تھا کہ ”ہاں مسئلہ ای کوئی نہیں“ رشید جانتا تھا جب وہ یہ کہہ دیتا ہے تو واقعی میں مسئلہ حل ہو جاتا ہے، سر ہی ہلا دیا تھا کافی تھابتی اب کام ہو جائے گا۔ یہ جو بی کا سر ہلاتا تھا کئی عام آدمی کا نہیں۔ نام نہ جانے کیا تھا پر بازار میں جو بی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ہر بنگے میں ہوتا تھا ہر شخص کو جانتا تھا۔ ہر ایک سے دوستی تھی اور انہی سے دشمنی تھی۔ اچھا تو نہ جانے کن کن کے ساتھ تھا لیکن برا بہت سوں کے ساتھ تھا۔ ہر وقت گالیاں دیتا رہتا۔ ایک پیک جیب میں رکھتا۔ رشید سے چند سال چھوٹا تھا۔ پھینسے کی طرح پھٹا ہوا تھا۔ سر گنجا رکھتا، ہمہ وقت جلتے وقت آس پاس والوں کو دھکے دیتا، ٹھڈے مارتا آگے پیچھے ہنر مارتا رہتا۔ کوٹھے پر کوئی نوٹسکی کرتی تو گردن سے پکڑ کر چوبارے سے نیچے لٹکا دیا کرتا تھا۔ سارا بازار نوٹسکی والی کا تماشا دیکھتا رہتا اور یہ گردن چھوڑ دینے کے قریب ہو جاتا، نام ہی کافی تھا ایسوں کے لیے اس کا ”جو بی“۔

رشید مگر کبھی اس کے پاس نہ آتا پر وہ جانتا تھا کہ جو بی ہی ہے جواب یہ کام کر سکتا ہے۔ ہر جگہ اس کے رالٹے تھے، نہیں بھی تھے تو وہ بنا لیتا تھا۔ رشید ملنگ بنا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ جو بی کو بڑی طمانیت ہوئی رشید کو ایسے دیکھ کر۔ وہ اندر ہی اندر کڑک رہا تھا۔ کبھی وہ دونوں ساتھ کے تھے اب کیسے رشید مسکین بنا اس کی منت کر رہا تھا۔ جو بی کی رشید سے اچھی دوستی تھی دشمنی کہاں تھی۔ جو بی کو اس نے ایک لاکھ دینے کا کہا، جو بی کی آنکھیں کھل گئیں، کون نہیں جانتا تھا کہ رشید کتنے پیسے والا ہے۔ جو بی سر تاپا اقرار بن گیا۔ پیسے کے لیے تو وہ قبر سے مردہ نکال لائے۔

”ٹھیک ہے ہو جائے گا کام۔“ سر بھی ہلا اور زبان بھی، رشید مطمئن ہو کر گھر آ گیا۔ امین کو کہانیاں سنانے لگا، خوش تھا آج رشید بہت۔ نوالے بنایا کر اسے کھانا کھلایا اور پھر سلا دیا۔ امین کی ایک عادت تھی۔ اسے زیادہ بھوک نہیں لگتی تھی لیکن سوتے میں اسے بار بار بھوک لگتی۔ وہ چند نوالے کھاتا اور سو جاتا اور رات بھر میں ایسا کئی بار ہوتا۔ رشید بہت شوق سے بار بار اٹھ کر اس کے لیے کھانا گرم کرتا اور اسے نوالے کھلا کر سلا دیتا، بہت خوب صورت تعلق تھا دونوں کا، محبت آمیز، سکون بھرا، ایسے تعلق کے لیے انسان ترستے ہیں۔

دو بار رشید کے گردے وائش ہو چکے تھے پھر بھی اس کی تکلیف کم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بہت لاغر ہوتا جا رہا تھا، اس کی بیماری بڑھ رہی تھی، وہ بار بار جو بی کی طرف چکر لگاتا۔ جو بی بہانے بہانے اور پیسے لیتا پھر جو بی رشید کے گھر کے چکر لگانے لگا۔ اپنی عادت کا حامل امین اس کے بچنے کو دیکھ کر ڈر گیا اور رشید کے پیچھے چھپ گیا۔ اس بد معاش نے جانتے بوجھتے ہاتھ اٹھا کر امین کو آگے کیا۔ ”پتہ جی کھڑا دیکھو ذرا“ رشید ضبط کیے بیٹھا رہا۔ اب وہ جو بی کو کیسے کہتا کہ بچے کا ہاتھ چھوڑ دے، وہ ڈر رہا ہے۔ اتنی سی بات پر ہی جو بی مرنے مارنے پر تل جاتا۔ امین رونے لگا باقاعدہ ”بڑا ڈر پوک اے کا کا“۔ جو بی ہنسنے لگا۔ رشید ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ یہ وقت بھی آتا تھا جو بی جیسے لوگ امین پر تبصرہ کر رہے تھے اسے رلا رہے تھے۔ جو بی رشید کے گھر آنے جانے لگا ادھر ادھر کی سنا جاتا کہ یہاں گیا، اس سے ملا، یہ کیا، وہ کیا۔

قیامت کا وقت جارہا تھا، رشید تکلیف سے بے حال رہتا، چھ مہینے پہلے گردے واش ہوئے تھے۔ اب تین ماہ بعد ہونے تھے۔ امین کو کہاں چھوڑنا، پہلی بار دل موس کر جوبلی کے پاس ہی چھوڑ رہا تھا۔ ہسپتال میں کہاں امین کو رکھتا۔ رشید بڑا مجبور ہو گیا تھا۔ اس کی جان لگی تھی یہ سوچ کر کہ امین اس بازار کے کسی ٹھکانے میں رہے۔ اس نے ایک بار اسے سمجھا دیا کہ

”بیٹا جوبلی انکل کے ساتھ چلے جاؤ۔ میرا ہسپتال جانا ضروری ہے یہاں بہت درد ہوتا ہے۔“ سر ہلا کر امین نے آنکھیں صاف کیں اور جی کہا۔ رشید کا دل کٹ گیا۔ ہائے ہائے کرنے لگا۔۔۔ ”میرے بچے مجھے معاف کر دے۔“ رشید نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”یہ کیا کر دیا میں نے تیرے ساتھ، تجھ سے پھول کو کہاں چھپاؤں میں۔“ جوبلی کے پاس امین کچھ گھاتا پیتا ہی نہ تھا، جوبلی کا کہنا تھا کہ گم سم امین ایک طرف پڑا رہتا ہے، رشید کے بغیر وہ رہتا نہیں تھا اور جوبلی جیسے بندے کے ساتھ اسے رہنا پڑتا۔ امین کو جوبلی کے پاس چھوڑ کر ہسپتال آ گیا۔ گھنٹے بعد ہی بھاگ آیا بنا واش کروائے۔ امین کو ساتھ لیا اور گھر آ گیا، جوبلی کی منت گئی کہ جلد سے جلد اس کا کام کر دے اب جب وہ علاج نہیں کروائے گا تو مطلب جلد ہی بستر پر پڑنے والا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ رات سے دن نہ ہو اور امین کے اماں ابا مل جائیں، اس نے اخبارات میں اشتہار بھی دیے تھے لیکن نتیجہ صفری نکلا۔ وہ جاوید اور نوری کو ڈھونڈ رہا تھا وہ دنوں اپنا بچہ نہیں ڈھونڈ رہے تھے۔

رشید بدترین وقت سے گزر رہا تھا۔ اس کے گردوں میں ناقابل برداشت تکلیف ہوئی، ڈاکٹر نے اسے بتا دیا تھا کہ اگر وہ ایسے ہی دیر اور غفلت کرتا رہا تو خون کا اخراج شروع ہو جائے گا، زندگی کے گنے پنے دنوں کی گنتی اور کم ہو جائے گی۔ کیسی قسمت تھی رشید کی پہلے وہ باپ سے الگ ہوا اور اب اسے اپنے بیٹے سے الگ ہونا تھا۔ ایک کے عمل نے الگ کیا ایک کی بیماری کر رہی تھی۔ سیدھے لفظوں میں موت۔ چند مہینے گزرے۔ وہ بہا علاج کے چلتا پھرتا رہا۔ تکلیف سے ہلبلاتا۔۔۔ تڑپتا۔۔۔ گردے جھننے کے قریب ہو گئے۔ خون کا اخراج شروع ہو گیا۔ یہ ابتدائی لیکن آخری سنگین علامت تھی، اب سمجھ لینے میں دیر کیسی۔ اب وہ لیبیک کہے نہ کہے موت لیبیک کہلو کر جائے گی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر رشید امین کو چومنے لگتا۔ اس سے بار بار معافی مانگا۔

”میری خواہش تھی لے ڈوبی۔“ سینے سے لگائے رشید روتا رہتا۔ اگلے دن نئے لوگوں سے ملا، اصل جو بک جوبلی تھا جو اس کا خون چوس رہا تھا، رشید اپنے حال سے اتنا بے حال نہ ہوتا تو شاید جوبلی کو پہچان ہی جاتا۔

امین مدرسے سے آنے کے بعد تالا کھول کر اکیلا ہی گھر بیٹھا رہتا، اب حالات اتنے خراب ہو چکے تھے تو رشید نے کچھ اور ہی سوچنا شروع کر دیا تھا، جاوید تو مل کر نہیں دے رہا تھا، نہ ہی ملتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ امین کو کسی اچھے ادارے میں داخل کروا دیتا ہے۔ نو سال کا ہونے والا تھا وہ۔۔۔ چند سالوں بعد جوان ہو کر خود کو سنبھال لے گا۔ پیسے اس کے پاس تھوڑے سے بچ گئے تھے اس کا کام بن سکتا تھا۔ جیسے تیسے وہ پندرہ سال کا بھی ہو جاتا تو کافی تھا۔

رشید اب ایسے کسی ادارے کی تلاش میں جت گیا جہاں امین چند سال اچھے ماحول میں گزار سکتا۔ رشید امین کو اچھی طرح سمجھانے والا تھا کہ اسے آئندہ زندگی میں کیا کیا کرنا ہے۔ اپنے ماں باپ کو ڈھونڈے ورنہ پڑھ لکھ کر اچھی زندگی گزارے۔۔۔ زندگی بھرے موڑ پر آئی ہے تو اچھے موڑ پر بھی آئی

جائے گی۔ رشید نے اگر کچھ لگا دیا تھا تو سنور بھی سکتا تھا۔۔۔ رشید کچھ سکون محسوس کرنے لگا تھا، امین کا ذہن بنا رہا تھا، وہ بہت سے ایسے ادارے تھے جو اس کی نظر میں تھے اور جہاں وہ پرورش حاصل کر سکتا تھا، محفوظ رہ سکتا تھا۔ اچھی سوچ تھی، لیکن اس نے اس اچھی سوچ کا اظہار جوہلی کے سامنے کر دیا۔ جوہلی اس دن اس کے ساتھ ہی تھا۔ شام کو وہ گھر آیا تو امین گھر نہیں تھا، تالا کھول کر وہ اندر ہی بیٹھا رہتا تھا۔ رشید آیا تو گھر کا دروازہ کھلا تھا، وہ بھی باہر جاتا ہی نہیں تھا آج کیسے جا سکتا تھا، رشید نے اسے باہر جانے سے منع کر رکھا تھا پھر بھی رشید آس پاس اسے دیکھ آیا۔ رشید پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی جیسے کچھ بہت برا ہو گیا ہے۔ اس نے جوہلی کو فون کیا کہ وہ آکر اس کی مدد کرے۔ جوہلی کے جواب سے رشید ڈگمگا کر گر گیا اور زمین کی رفتار کے ساتھ گھومنے لگا۔

”وہ میرے پاس ہے پیسے دو اور لے جاؤ۔“

”پیسے، پیسے، پیسے۔۔۔ یہ پیسے سب برباد کر چکا ہے، برباد کو بھی اور برباد کرے گا؟ کتنا

اور۔۔۔؟“

جوہلی کو بھی پیسے چاہیے تھے۔ اتنے پیسے تو وہ دے چکا تھا۔ ایک دم رشید کو احساس ہو گیا۔ رشید کیسے بھول گیا کہ جوہلی انسانیت یا پرانا تعلق اس کے ساتھ نبھا سکتا ہے۔ اسے سب سمجھ آ گئی کہ دراصل جوہلی نے جاوید کو ڈھونڈا ہی نہیں تھا۔ اسے بس پیسے چاہیے تھے۔ رشید نے کیسے توقع کر لی کہ وہ اس کے ساتھ کوئی بھلائی کرے گا۔ وہ بازاری ہے بھاد کرے گا کہ جاؤ؟ رشید غصے سے کھولنے لگا۔ وہ اس کے اتنے پیسے کھا چکا تھا۔۔۔ اب تو وہ اسے ایک کوڑی بھی نہ دے گا جو تھوڑا بہت بچا تھا وہ تو امین کا تھا۔ اس کے بیٹے کا، اس کی تعلیم کا۔ وہ اسے استاد بنانا چاہتا تھا۔ امین کو یاد کروادیا تھا کہ اسے کیا بنانا ہے۔ اس نے اسے بہت سی باتیں یاد کروادی تھیں۔

”بڑے بابا کا کیا نام ہے؟“

”بابا رشید۔۔۔“

”سب سے بڑے بابا کا؟“

”میاں جی۔۔۔ اللہ انہیں پیار سے اپنے پاس رکھے، آمین۔“

”ابو۔۔۔ امی؟“

”پیارے ابو جاوید اور پیاری امی نور فاطمہ۔“

”اور امین کون؟“

”امین۔۔۔ بابا کا بیٹا، میاں جی کا بیٹا، پیارے امی، ابو کا پیارا۔۔۔ امین سب کا پیارا۔۔۔ سب

پیارے، امین بھی پیارا۔۔۔ آمین۔“ دونوں ہاتھ منہ پر پھیر کر رشید کی آنکھوں پر رکھ دیتا۔

”ہم سب مر جائیں گے؟“

”ہاں، سب۔“

”جو مر جائیں گے وہ کیا کریں گے؟“

”وہ اللہ کے سوالوں کے جواب دیں گے۔“

”جو زندہ رہیں گے وہ کیا کریں گے امین پیارے؟“

”وہ دعا کریں گے خدا سب کو معاف کر دے۔ آمین۔“

”تم یہ دعا کرتے رہو گے؟“ اس نے سر ہلایا۔
”ہمیشہ۔“

”ہر روز۔۔۔ سونے سے پہلے۔۔۔ اٹھنے کے بعد۔“

”ہم سب مرجائیں گے۔ میں مرجاؤں تو روؤں گے تو نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”پر میں کس کے ساتھ سوؤں گا؟“ رشید نے اسے بے تحاشا چوما۔

”بہادر بن جاؤ۔“

”میں بہادر ہوں۔“

اس نے کہہ تو دیا۔ لیکن اکیلا کوئی بھی بہادر نہیں ہوتا۔ اپنوں کے بغیر رہنا سیکھ لینا۔ یہ بہادری کوئی

بھی نہیں کرنا چاہتا۔

گھر کو تالا لگا کر رشید غصے میں جوہلی کی طرف آیا۔ اس کے اپنے اڈے سے ذرا پرے اس کا ڈیرہ تھا جہاں رات رات بھر شراب اور دوسرے نشے چلتے۔ وہیں کالج یونیورسٹی کے لڑکے نشہ کرنے آتے اور ادھر ادھر کے دوسرے غنڈے بد معاش بھی موجود ہوتے۔ رات کا وقت ہو گیا جب بے تحاشا کھانسا رشید وہاں پہنچا۔ جو پہلا منظر دیکھا، اس منظر کو دیکھنے سے پہلے کاش وہ تیز دھار چھری سے اپنا گلا کاٹ لیتا۔ ایک موٹے گجر بد معاش کی ایک ٹانگ کو امین اپنے چھوٹے چھوٹے پیارے ہاتھوں سے دبا رہا تھا۔ جوہلی ذرا فاصلے پر کرسی پر بیٹھا تھا۔ ادھر ادھر چند اور شئی لڑکے بیٹھے تھے۔ جوہلی جانتا تھا کہ رشید بس آیا کہ آیا اور جان بوجھ کر امین کو اس کام سے لگایا۔ وہ بے چارہ ڈھلتی عمر کا کھنڈر۔۔۔ ناکارہ ہوئے گردوں سے اس کی طرف لپکا۔ جوہلی نے پہلے ہی امین کا ہاتھ ایک آدی کو پکڑ لیا۔ جس وقت وہ زمین پر جھک کر امین کو اٹھانے لگا تھا، ٹھیک اسی وقت اس گجر بد معاش نے ایک زوردار لات اس کے منہ پر دھری۔ رشید درد سے بلبلاتا لیکن وہ پہلے ہی امین کے لیے بلبلا رہا تھا۔ اسی گجر نے دو، تین اور لگائے ”نظریقہ سے بات کر۔۔۔ بچے کو اتھ نہ لگا۔“ وہ بھوک رہا تھا۔ جوہلی اطمینان سے کرسی پر بیٹھا رہا شئی لڑکوں نے سر اٹھانے کی زحمت بھی نہ کی۔ امین اندر کہیں جا چکا تھا وہ بابا، بابا چلا رہا تھا۔ رشید ٹرپ کر اندر کی طرف لپکنے لگا۔ جوہلی کے دو آدمیوں نے اسے پیچھے کی طرف گھسیٹا۔ بد معاش نے اس کی گردن پر پیچھے سے ہاتھ ڈالا اور اسے زمین پر پٹخا۔۔۔ رشید زمین پر بری طرح سے گرا۔ ڈھائی تین سال سے وہ بیمار تھا، ڈیڑھ سال سے گردوں کے عارضے میں مبتلا تھا۔ وہ تو ایک بچے کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا، کہاں ایک موٹے وزنی بد معاش کا ہاتھ، وہ زمین پر پڑا رہ گیا۔ منہ اور ناک سے خون نکلنے لگا، اٹھنے کی بہت نہ رہی۔ اس موٹے نے لاتوں کی بوچھاڑ کر دی، اس کے پیٹ پر۔ رشید درد سے چلانے لگا، چلاتے ہوئے بھی وہ امین کا ہی نام لے رہا تھا۔ کوئی کہہ گیا ہے کہ جو محبت کر لیتا ہے وہ کسی اور کام کا نہیں رہتا۔ رشید اس کی زندہ تصویر بنا ہیرا منڈی سے ذرا پرے زمین پر پڑا تکلیف سے کانپ رہا تھا۔ وہ امین کے علاوہ ہر کام سے گیا۔ یہی وہ بازار تھا اور یہی وہ لوگ تھے جنہیں وہ اپنی جھٹکی کی دھول سے برباد کر سکتا تھا۔ کیا اوقات تھے جوہلی کی۔ اس کی بچائی ہوئی شراب اور سگریٹ کے ٹوٹے پیا کرتا تھا، اس کی ٹانگیں دبایا کرتا تھا۔ اسی ڈیرے پر وہ سب موج مستی کرتے، اپنی من پسند مٹھلیں لگاتے، جھومتے، جوا کھیتے۔

آج نرالا ہی کھیل چل رہا تھا۔ اسی کا امین اور اسی کے پیسے۔ رشید کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ اس کا جی چاہا ایک ایک کا خون کر دے۔ رشید اٹھا اور جوہلی پر جھپٹ پڑا۔۔۔ اس کا گلا دبوچ لیا۔ رشید تو شیر بن چکا تھا۔ جوہلی کی اتنی ہمت کہ سپارہ پڑھتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے والے ہاتھوں سے اس بد معاش کی ٹانگیں دبوائے، اس پر اپنا جوا کھیلے، اس کا سودا کرے۔ امین کا سودا، یہ کم ذات بازار والے کیا جانیں امین کیا ہے؟ وہ سب کے لیے دعا مغفرت کرنے والا، سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر چومنے والا، اس کے سینے پر سر رکھ کر درد پڑھتے پڑھتے سو جانے والا۔ امین کیا ہے؟ کوئی رشید چاند سے پوچھے۔ اپنی پیاری آواز میں اسے لوری دے کر سنانے والا۔۔۔ اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو۔۔۔ پیارے ہمارے اللہ۔۔۔ اللہ ہو، جی اللہ ہو۔۔۔ کوئی سنا سکتا ہے ایسی لوری۔

گردن رشید کے کانٹے ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ڈیرے پر موجود باقی لوگ اس پر پل پڑے۔ ایک نے پیتول نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ سب مل کر رشید چاند کو مار رہے تھے۔ گلابی مرچکی تھی، میاں جی کا خدا جانتا ہے کیا بنا۔ رشید چاند دھڑ دھڑ مار کھا رہا تھا۔ امین اندر سے بابا، بابا چلا رہا تھا۔

”کیا یہ سب قسمت کے کھیل ہیں؟“

میاں کوکس نے کہا تھا کہ ہیرا منڈی آکر گناہ کرے؟

رشید چاند بروکر نہ بننا تو کیا بننا؟ حلال کے ہوتے ہوئے بھی جاوید نے اپنے بچوں کی دکان سبائی۔ وہ اگر سودا گر نہ بننا تو امین کہاں ہوتا؟

یہ سب تو انسان کے رچائے کھیل ہیں۔ جو کھیل انسان رچاتا ہے ان کے انجام بہت بھیانک ہوتے ہیں اور پھر وہ صرف انجام نہیں کہلاتے۔ عبرت ناک مثالیں بن جاتی ہیں۔

”امین۔۔۔ امین اور بابا۔۔۔ بابا۔۔۔“ کی آوازیں گونجتی رہیں۔ ان میں سے ایک آواز بند ہو گئی۔ رشید اتنی مار کھا کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ دونوں اسے اٹھا کر ڈیرے سے ذرا دور سڑک کے کنارے پھینک گئے۔ رات گئے سڑک کے کنارے پھیلتے خون اور بے ہوش آدمی کو چند ایک لوگوں نے دیکھا تو ایک نے لاش سمجھ کر ایدھی سینئر فون کیا۔ ایبویٹس آئی۔ اس کی سانسیں تھیں ابھی۔۔۔ اسے قریبی اسپتال میں لے گئے۔

بس اس کی سانسیں ہی باقی تھیں۔ خون بہت نکل چکا تھا۔ اندر سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ تین دن وہ سرکاری اسپتال کی ایمرجنسی میں رہا۔ وہ چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ چند دنوں کا مہمان بن گیا تھا۔ اسے ایمرجنسی سے وارڈ میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ وہ مرگ نیند میں ادھر رہا تھا۔ کپکپاتی پکلیوں اور بے چین پتلیوں کے ساتھ۔۔۔ اندر کہیں بہت اندر۔۔۔ امین۔۔۔ امین کی آوازیں لیے۔

اسے وارڈ میں لے جایا جا رہا تھا کہ ایک طرف میٹھی لوری یک دم چوگی۔ پہلے اسے سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیوں چوگی۔۔۔ کیوں چوگی؟

”یہ کیا ہوا تھا رشید بھائی۔“ اس نے پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔ ”چند بد معاشوں سے بھڑ گیا تھا، آنکھ بچ گئی ورنہ آج ہوتا۔“

پیشانی سے کپٹی کی طرف آتا گہرا نشان تھا جو رشید کو تیز دھار چاقو سے لگا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی

پہلی نظر اس نشان پر ضرور پڑتی تھی اور یہی پہلی نظر اتنے سالوں بعد نوری کی بیڈ پر نیم مردہ بوڑھے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔

”رشید۔۔۔“ وہ بڑبڑائی۔۔۔ گم سم حالت میں وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

رشید نے داڑھی رکھ لی تھی۔ بیماری کی وجہ سے بہت کمزور ہو چکا تھا۔ لاغر اور بوڑھا لگنے لگا۔ شکل پہچانی نہ جاتی۔

”رشید۔۔۔“ نوری بڑبڑائی۔۔۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اس نام کا۔۔۔ وہ وہاں اپنی اماں کے ساتھ آئی تھی ان کی آنکھ میں موتیا اتر آیا تھا اور آج ان کا آپریشن تھا۔ وہ سب جاوید کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی نوری کے گھر آتے تھے۔ نوری ہی ملنے چلی جاتی تھی۔ اماں بھائی کے ساتھ آئی تھیں گاؤں سے سیدھی اسپتال، وہ بھی آگئی اپنے گھر سے۔

”رشید۔۔۔“ یہ وہ جج تھی جو اس کے اندر کے سناٹے کو چیر کر نکلی اور اس پر حقیقت کے درکھول گئی۔ کوریڈور میں موجود سب لوگ اسے دیکھنے لگے۔ ”اس کا بچہ۔۔۔ رشید۔۔۔“

نوری کا جی چا ہا دیواریں گر جائیں اور وہ رشید تک پہنچ جائے۔

”میرا بچہ کہاں ہے رشید۔۔۔؟ رشید۔۔۔ ایک بار ملو ادد۔۔۔ رشید بھائی۔۔۔“

اس کا بھائی ایک طرف کھڑا تھا۔ اماں کا آپریشن ہو رہا تھا۔ وہ اس کی طرف کو بھاگی۔ جس طرف رشید کا اسٹریچر گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگ رہی تھی۔ سر کی چادر گلے میں جھولنے لگی۔ ”رشید بھائی“ باہل بھی نوری۔۔۔ آوازیں دینے لگی۔ وارڈ اسے نظر ہی نہیں آ رہا تھا، جبکہ وہ وارڈ کے قریب سے ہی گزر کر آئی تھی۔ ”مجھے رشید بھائی کے پاس جانا ہے۔“ اس نے ایک نرس کا ہاتھ ہی پکڑ لیا۔ ”وہاں کاؤنٹر پر معلوم کر۔“ وہ کاؤنٹر کی طرف بھاگی۔ رشید انہیں کیا معلوم کون رشید۔ وہ مریض نامعلوم کے نام سے۔۔۔ مخصوص نمبر کے ساتھ۔۔۔ وہ آگے پیچھے بنے وارڈوں کی طرف لپکی، ایک ایک بیڈ کے پاس جاتی دیکھتی۔ تیسرے وارڈ کی دوسری قطار کے آخری بیڈ پر اسے رشید چاند نظر آئی گیا۔

”رشید بھائی۔۔۔!“ وہ اوپچی آواز سے چلائی۔

”انھیں۔۔۔ میں نوری۔۔۔ میرا بچہ کہاں ہے۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کو کیا ہوا۔۔۔ وہ کیسا ہے۔۔۔ کس کے پاس ہے۔۔۔ رشید بھائی!“ میرا بچہ۔۔۔ میرا بیٹا۔۔۔ اندھا بھی رشید کی حالت دیکھ کر سمجھ جائے کہ وہ اٹھ کر بیٹھنے یا بات چیت کے قابل نہیں ہے۔ وہ اس کا ہاتھ ہلانے لگی۔

”رشید بھائی۔۔۔ رشید۔۔۔!“ وہ چلا رہی تھی۔ ایک مریض کا رشتے دار نرس کو بلا لایا۔ وارڈ میں موجود سب ہی مریض اور عورتیں اسے ہی دیکھ رہے تھے، نرس آئی۔

”نظر نہیں آ رہا۔۔۔ آخری سانسیں لے رہا ہے۔ کون ہو تم اس کی؟“

”آخری سانسیں۔۔۔“ نوری نے ذرا غور سے رشید کو دیکھا۔

”یہ کیسے آخری سانسیں لے سکتا ہے۔ اس کے پاس تو میرا بیٹا ہے۔۔۔ یہ کیسے۔۔۔ اندر گھنٹیاں بجیں۔“

”میں ان کی بہن ہوں۔۔۔ یہیں رہنے دیں مجھے۔“

”طریقے سے رہو اور لوگ بھی ہیں یہاں۔“ نرس منہ بنا کر چلی گئی۔ نوری قریب کھڑی رونے

گئی۔

”کیا یہ مرد رہا ہے؟ کیوں مرد رہا ہے؟“ نوری کا وجود پور پور جھنجھٹا اٹھا۔
 وارڈ میں موجود ہر شخص اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”بھائی یہ پیہرا۔“ ساتھ کے بیڈ کے مریض کی ایک عورت ٹانگیں دباری تھی۔ نوری کی طرف
 ٹٹکی باندھے دیکھ رہی تھی تو نوری نے رندھے گلے سے اسے بلا دیا۔
 ”میرے بچے کا باپ ہے۔“ بلا دیا ہی بتایا۔ عورت کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔
 ”بھائی۔۔۔ بچے کا باپ؟“

نوری بیڈ کے قریب جھک کر رشید کے منہ کے پاس ہوئی۔
 ”رشید بھائی!“ سرگوشی کی، ایک آنکھ وارڈ کی طرف رکھی، اٹکا اٹکا بھی بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔
 جس جنونی انداز کو اپنائے وہ اندر آئی تھی وہ کافی تھا۔ اسے گھورنے کے لیے، نوری بہت دیر تک سرگوشی
 میں پکار رہی رہی۔ رشید۔۔۔ بچہ۔۔۔

نوری ساری دنیا ہار کر وہاں کھڑی تھی۔ ایک ایسی ماں جس کے بچوں نے اسے ترنوالے کھلائے
 تھے۔ اب ایسی عورت جب ماں بنے گی تو قیامت سے گزرے گی۔ وہ بچوں کو پیدا کرنے کے بعد ماں
 نہیں بنی تھی۔ وہ ان کی قسمت آنکھ کے بعد ماں بنی تھی۔ ایسی عورت پر خدا رحم کرے۔ ایسی عورت پر
 سب مل کر رحم کریں تو بھی کم ہے۔

نوری کا بھائی اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ ناکام ہو گیا تو اکیلا ہی ماں کو لے کر واپس چلا گیا۔ اس بے
 چارے نے سوچا کہ نوری اپنے کھڑی کئی ہوگی اور وہ بت بنی رشید کو تنگے جا رہی تھی۔ جیسے کسی نے اس پر
 ظلم کر دیا۔ جیسے رشید اس کا بچہ لے کر بھاگ گیا۔ اب ملا۔۔۔ نوری خاکوں خاک ہو کر اسے ڈھونڈتی
 رہی، اب ملا رشید۔

”او میری میا“ منوس ماری یہ آواز کس نہ خانے سے پھر نکل آئی۔۔۔ ہر دیوار پر اس آواز کے
 گھڑیاں لٹک گئے، فرش پر بچھ گئی۔ سر پر تن گئی۔ اب تو بخش دیتی یہ آواز نوری کو، پرگوری باز نہیں آئی، تالی
 پر تالی بجاتی رہی۔

رشید آنکھیں کھولنے، زبان کو حرکت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے وہاں نکلے شام سے رات
 ہو گئی اور پھر رات گزرنے لگی۔ وہ ویسے ہی کھڑی رہی ایک ہی انداز، ایک ہی التجا کو لیے کہ رشید اس کی
 طرف کب متوجہ ہوگا۔ رشید جس کے پاس اس کا بہت کچھ تھا۔

”اے بی بی۔۔۔ بی بی!“ وہی عورت اس کا کندھا ہلاتی رہی تھی۔ بی بی کے حواس کام ہی نہیں کر
 رہے تھے۔ وہ صرف رشید کے ہونٹوں کی جنبش پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اس کی سانسوں کی آمد و رفت کو گن رہی
 تھی۔ عورت اسے بیٹھنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ بیڈ کے پاس بیٹھ رکھا تھا۔ وہ اسے بٹھانا چاہ رہی تھی۔ نوری
 اکڑوں بیٹھ گئی۔ بت بنی نظریں رشید پر گاڑے، ایک آنکھ کہیں اور بھی لگی تھی۔ کہیں پچھلے وقت کی طرف۔
 ”بھئی بھئی مجھے منا بہت یاد آتا ہے۔“ ایک رات وہ کہنے لگی۔

”کون منا؟“ جاوید کے سینے پر اس کا سر تھا۔
 ”ہمارا مانا۔“ نوری خفا ہوئی۔ جاوید نے سانس لی، بد مزای سانس، نوری جان گئی۔

”تو نے اس بروکر کو دے دیا۔“ جاوید کا دل چاہا نوری کو زمیں پر پٹخ دے۔
 ”سو جا۔۔۔“ اس نے کہا۔

”اب تو بولنے لگا ہوگا، بھاگتا دوڑتا ہوگا۔“ نوری کو منے کی ہی یاد زیادہ ستاتی۔
 ”ہماری بلا سے وہ کچھ بھی کرے۔“ جاوید نے اس کے سر کو ایک طرف کیا۔

نانا، دادا کی نشانیاں بچ کر کھا جانے والا وہ کن کن بلاؤں کی فکر کرتا۔ جاوید نے جواب نہ دیا اور سوتا پتا۔ نوری بھی سونے لگی۔ ایسی بھول چوک سے آنے والی یادوں کو وہ بڑے طریقے سے نکال باہر کرنے لگی۔ اب سارے طریقے بھلائے جا رہے تھے۔ جیسے دنیا میں سیدھی بیہوش اتاری گئی ہو۔ عین رشید کے سر ہانے، صرف بچہ لینے۔

گھر سوتا جاوید سمجھا کہ وہ گاؤں اپنی اماں کے ساتھ چلی گئی ہوگی۔ سب غلط سمجھ رہے تھے، نوری وہاں کہیں نہیں تھی۔ نوری اپنے اصل ٹھکانے پر تھی۔

رات کے آخری پہر رشید کے ہونٹ لرزے، نرس اسے کہہ گئی تھی کہ اس میں کوئی حرکت ہو تو اسے آکر بتائے۔ ایک بار آکر وہ رشید کو کچھ گئی تھی۔ لیکن بے ایمان نوری خود تن کر بیٹھ گئی۔ نرس کے پاس نہ گئی۔ رشید کے ہونٹ پھڑپھڑا کر ادا ہوئے۔ نوری جھٹ قریب ہوئی۔ کا پتی ہوئی ہٹکائی اور حواس کم کرتی۔

”رشید بھائی۔۔۔! میرا بچہ۔۔۔ کہاں ہے۔“ اگلے پندرہ منٹ تک وہ یہی کہتی رہی۔ رشید میں کوئی اور حرکت نہ ہوئی۔ نوری نے اس کا بازو ہلانا شروع کر دیا۔

”بی بی! کیوں اودھ پی جان دے پیچھے پیئے اس۔“ عورت تریخ کر بولی۔ نوری نے سنا ہی نہیں۔ رشید جان کنی کے عذاب سے گزر رہا تھا۔ انگلی کی پور بھی اس پر بھاری تھی۔ رشید کراہنے لگا۔ اس کے اعضا سکڑنے سنسنے لگے۔ ہونٹ کھلے۔ ہونٹیں اچھلیں، پیشانی پر پل آئے، سارا جسم کراہ بن گیا۔ رشید نے کچھ کہا۔ نہ جانے کیا۔۔۔ لیکن الفاظ تڑم کر نکلے تھے۔ اس کے اتنے قریب بیٹھی نوری سن نہیں سکی تھیں۔

”بولو۔۔۔ کیا کہا۔۔۔ کچھ تو بولو۔۔۔ کیا ہوا تمہیں۔۔۔ کہاں ہے میرا بچہ۔۔۔ ٹھیک تو ہے نا وہ۔۔۔ رشید بھائی مجھ پر رحم کرو، خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ میرے حال پر رحم کرو، کس کے پاس چھوڑا ہے اسے، کہاں ہے میرا بچہ۔“

وہ اپنا منہ اس کے کان کے پاس رکھ کر کہتی ہی رہی۔

بہت دیر گزری رشید نے دونوں آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔ نوری جھٹ اس کے سامنے آئی۔ گردن گھما کر وارڈ سے باہر بے کاؤ نر کی طرف دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی نرس اس کے سر پر آجائے۔ رشید نے نوری کی طرف دیکھا، لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ جیسے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔

”میرا بچہ کہاں ہے؟“ نوری کی آواز ذرا بلند ہوئی۔ رشید نے جیسے ایک آخری بار دنیا دیکھنے کے لیے آنکھیں کھولی تھیں۔ اسے کچھ دکھائی اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ آنسو نوری کی آنکھوں سے رواں تھے۔ وہ کب سے ماتم کرنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ رشید یہاں آکر آخری سانسیں لے رہا تھا تو اس کا بچہ کہاں تھا۔

رشید گہرے گہرے انجانے سانس لے رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں ڈگمگا رہی تھیں، ہونٹ سیاہ تر ہوتے جا رہے تھے۔

نوری نے اس حالت کو دیکھا تو زور سے چلائی کہ چیخ سے وارڈ کے سب مریض ان کے ساتھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نرس لمبے وارڈ کے کنارے سے آئی نظر آئی۔

”میرا بچہ کہاں ہے۔“ وہ چلائی، ساکت ہونے کے قریب پتلیاں ذرا کی ذرا پھڑپھڑائیں۔ نرس تیز تیز چلتی آ رہی تھی۔ رشید کی نظریں نوری پر ٹکیں، اس نے اپنا ایک ہاتھ ذرا سا بلند کیا۔ سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں۔۔۔ کہاں؟ وہاں۔۔۔“ نوری ہاتھ کے اشارے پر مرتکز ہو گئی۔ الفاظ گڑبڑائے۔ رشید کچھ بول ضرور رہا تھا لیکن نرس اس کے سر پر آ چکی تھی۔

”ان کا ماسک کس نے اتارا؟“ وہ زور سے بولی۔ ”کیوں چلا رہی ہو تم؟“ اس نے آتے ہی آکسیجن ماسک کو رشید کے منہ پر رکھا جسے نوری نے ہی آنکھیں کھلنے پر اتار دیا تھا۔ نوری نے ماسک فوراً اتار دیا۔

”نکو یہاں سے۔“ نرس ترخ کر بولی اور ماسک واپس لگا یا اور نوری کو دکھا دیا۔

”میرا بچہ کہاں ہے رشید بھائی۔۔۔! جلدی بتاؤ۔“ وہ مسلسل چلا رہی تھی۔ نرس اسے کھینچنے لگی۔ باقی سب تماشا دیکھنے لگے۔ بیڈ کے قریب حلقہ بنائے لوگ برے ہو گئے۔ نرس نوری کو گھسیٹ کر باہر لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نرس کو ایک زوردار دھکا دے کر نوری رشید کی طرف لپکی۔ اس کے منہ کے پاس کان لے کر گئی۔

”جلدی بتاؤ رشید۔۔۔!“ دونوں کی سانسیں اکٹھ رہی تھیں۔ نرس باہر وارڈ بوائے اور ڈاکٹر کو لینے کے لیے بھاگی۔ نوری نامی چیز اس کے قابو سے باہر تھی۔

رشید کا ہاتھ پھر ذرا سا بلند ہوا۔ اسی دیوار کی طرف جس کے بہت پرے، بہت سی سڑکوں کے پار ہیرا منڈی تھی اور بہت سی گلیوں سے آگے جو بلی کا ڈیرہ تھا۔ الفاظ سرگوشی بن کر نکلے۔

”مم۔۔۔ مم۔۔۔ منڈی۔“

”منڈی۔۔۔“ نوری ہر حال سے بے حال ہو گئی۔

”کس منڈی۔۔۔؟ سبزی منڈی۔۔۔ کس کے پاس؟ کہاں؟“ رشید کی آنکھیں ساکت ہونے کے قریب تھیں۔

”ب۔۔۔ ب۔۔۔ بازار۔۔۔ مم۔۔۔ منڈی۔“ نرس، وارڈ بوائے، ڈاکٹر بھاگے آئے۔

”بازار۔۔۔“ نوری اس کا ہاتھ ہلا رہی تھی، اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ وارڈ بوائے نے پکڑ کر اسے باہر کی طرف ٹھیٹا۔

”کس بازار۔۔۔ کون سی منڈی؟“ اس کی ادبھی دل دہلا دینے والی آواز نے وارڈ کا سناٹا توڑ دیا تھا۔ جہاں کوئی آخری سانس لے رہا تھا۔

ڈاکٹر رشید کو دیکھنے لگا۔ ماسک پہنایا، پمپ کرنے لگا۔ نوری بازار، منڈی چلا رہی تھی۔ وارڈ بوائے کے ہاتھوں سے خود کو آزاد کروانے کی کوشش کر رہی تھی۔ گلے سے چادر اتار کر گر چکی تھی۔

دو، تین عورتیں قریب آئیں اسے قابو میں کرنے کے لیے۔ نوری خود کو چھڑواتے، ہاتھ پاؤں مارتے بے حال ہو رہی تھی۔ وہ مڑ مڑ کر صرف رشید کی طرف دیکھ رہی تھی جس کی آنکھیں اب ساکت ہو چکی تھیں۔
”میرا بچہ۔۔۔“ آخری چیخ مار کر وہ فرش پر گر گئی۔

رشید مڑ چکا تھا، ڈاکٹر اس کا ماسک اتار چکا تھا۔ نوری بے ہوش ہو گئی تھی۔ نرس نے ہی دو تین عورتوں کی مدد سے اسے ایک بیڈ پر لٹایا۔ ایک بیڈ پر نوری بے ہوش دوسرے پر رشید بے جان۔ ایک ہر فکر سے بے نیاز ہو گیا دوسرا اب گرفتار بلا ہوا۔ سفر دونوں کے شروع ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆

رشید چاند کے بارے میں جاوید سب جانتا تھا۔ ہیرا منڈی میں اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ جاوید نے جو ملی کو بھی ڈھونڈ لیا لیکن وہ امین کو نہیں ڈھونڈ سکا۔ گلد و بد معاش کے ذریعے جاوید نے جو ملی کے ڈیرے پر جا کر بات کی۔ لیکن وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جاوید نے پیسوں کا لالچ بھی دیا۔ لیکن وہ نہیں مانے۔۔۔ اندرون خانہ جو کچھ معلوم کروایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ بچہ بھوکا پیاسا رو، رو کر مر گیا۔ کچھ خبریں ایسی تھیں کہ بچہ انہوں نے بچ دیا۔ اگر بچہ دیا تھا تو ایسی جگہ بیچا تھا جہاں سے مل نہیں سکتا تھا اور اگر مر گیا تھا تو۔۔۔ اس نے نوری کو صاف بتا دیا کہ رشید کا کوئی پتا، ٹھکانہ نہ ملا۔۔۔ وہ ہر روز آ کر نوری سے یہی کہتا پر نوری کہاں مانتی۔۔۔ وہ منہ اندھیرے۔۔۔ کڑی دو پہروں میں۔۔۔ شاموں میں شاہی محلے، اندرون، بیرون بازاروں میں۔۔۔ بچہ بچہ کی رٹ لگائے ہر شخص کی طرف پکتی۔

جاوید کہتا وہ حواسوں میں نہیں رہی۔۔۔ جھوٹ بکتا تھا۔ اب ہی تو حواس آئے تھے۔ اماں اسے زبردستی اپنے ساتھ گاؤں لے گئیں۔ حاجن بی اسے سارا سارا دن اپنے ساتھ لگائے رکھتیں۔ مانو اور گڑیا کبھی کبھار اس سے آکر مل جاتیں۔۔۔ جاوید نے دوسری فیکٹری لگالی۔۔۔ مطلب دوسری شادی کر لی۔ وہ امیر سے امیر تر ہونے لگا۔

نوری پانچ وقت نماز پڑھتی۔ تلاوت کرتی اور باقی کا فارغ وقت گھر سے نکل کر اپنے بچوں کو ڈھونڈتی۔۔۔ وہ پاگل نہیں تھی، لیکن اپنے حواسوں میں بھی نہیں، وہ صرف گاؤں میں ہی رہتی ہے۔ گاؤں سے باہر نہیں نکلتی۔ نمازوں کے اوقات میں حاجن بی کے گھر آ جاتی۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ۔۔۔ نوری کے لیے بہت گھیاں۔۔۔ بڑے راستے۔۔۔

بہت ہفتے۔۔۔ مہینے۔۔۔ گزریے۔۔۔ چند سال گزرے۔۔۔ گڑیا ایک میڈم کو اپنے باپ کی کار میں بٹھا کر گاؤں لائی۔۔۔ یہ گوہر تھی، جو سارہ کو اس کے اصل ماں۔۔۔ باپ سے ملوانے لائی تھی۔ وہ کچھ چند سالوں سے جاوید کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اب ملا تو فوراً پاکستان آ گئی سارہ کو لے کر۔۔۔ سارہ۔۔۔ ایک مضبوط لڑکی کی مکمل تصویر۔۔۔ وہ اپنی ماں کے سینے سے لگی۔۔۔ اس کی آنکھوں کو چوما۔۔۔ بے نور نوری میں کچھ نور در آیا۔

یہ اس کہانی کا انجام نہیں ہے۔۔۔ اس کہانی کا کوئی انجام نہیں ہے جب نفس کی موت ہوگی۔۔۔ اعمال کا حساب ہوگا، بس اسی وقت اس کہانی کا انجام ہوگا۔

☆☆☆☆